بسم اللہ الرحمن الرحیم

معیشت کے چند اہم پہلو

اِسلامی نقطۂ نظر سے

حضرت مولانا ابو عمار
زاہد الراشدی

اسلامی نظامِ معیشت پر ایک نظر
عالمی منظر نامہ اور اسلامی نقطۂ نظر
پاکستان کے حالات و مسائل اور تقاضے
دینی خدمت گزاروں کی مشکلات و ضروریات

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

عنوان : معیشت کے چند اہم پہلو، اسلامی نقطۂ نظر سے
تالیف : مولانا ابو عمار زاہد الراشدی
مرتب : ناصر الدین خان عامر
مجموعہ : مئی ۲۰۲۴ء
ناشر :
اشاعت :

﴿فہرست عنوانات﴾

☆ پیش لفظ.....14

اسلامی نظامِ معیشت پر ایک نظر.....15

☆ خیر و برکت کے اصول.....16
- حلال و حرام کے خود ساختہ ضابطے.....16
- حلال و حرام کا اختیار خدائے واحد کا.....16
- خیر و برکت کے پانچ اصول.....18

☆ معیشت کے چند انفرادی و اجتماعی تقاضے.....18
- محنت کش اور ان کی معاشرتی حیثیت.....18
- ہمارے معاشرہ کی طبقاتی تقسیم کا پس منظر.....21
- انفرادی ملکیت اور وسائل کی اجتماعی تقسیم.....22
- اجتماعی ضرورت اور اصحابِ ثروت کا زائد مال.....23

☆ محنت کشی اور معاشی ضروریات.....25
- محنت کش کسے کہتے ہیں؟.....25
- انبیاء کرامؑ اور محنت کشی.....26
- محنت کش کے حقوق.....27

☆ تجارتی اور کاروباری معاملات.....28
- نبی اکرمؐ بطور ایک تاجر.....29
- سچے اور دیانت دار تاجر کا رتبہ.....29

- مروّجہ نظامِ تجارت اور اسلامی نظامِ تجارت میں فرق.....30
- تجارت اور کاروبار کے شرعی تقاضے.....31
  - o دھوکے سے خراب مال بیچنا.....31
  - o جھوٹی بولی دینا.....32
  - o تجارتی مال پر اجارہ داری.....32
  - o جمعہ کے اوقات میں تجارت.....33
  - o ذخیرہ اندوزی.....34
  - o سودی کاروبار.....34

☆ تجارت وصنعت اور ابلاغ وتشہیر.....36

- جائز اور ناجائز کا مغربی فلسفہ اور اسلامی تعلیمات.....36
- تجارت کا مدار سچائی اور دیانت داری پر.....37
- ابلاغ وتشہیر کے مروّجہ طریقے.....39
- مصنوعات کی فروخت کیلئے ترغیبات.....40

☆ وسائل واسباب، دولت کی گردش، معاشی انصاف.....41

- دنیوی زندگی اور وسائل واسباب.....41
- اسباب ترک کرنے سے ممانعت.....43
- گردشِ دولت، نظامِ معیشت کا بنیادی اصول.....43
- وراثت اور زکوٰۃ، دولت کی گردش کے دو بنیادی ذرائع.....44
- ریاست کی طرف سے وظائف کی تقسیم.....45
  - o حضرت ابوبکر صدیقؓ کا موقف.....45
  - o حضرت عمر فاروقؓ کا موقف.....46
  - o دولت کی تقسیم میں ریاست کا صوابدیدی اختیار.....47
- سرکاری عہدیداران کی معاشی ومعاشرتی حیثیت.....47
  - o حضرت عیاض بن غنمؓ کا واقعہ.....48

o حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا واقعہ.....48
• ہر پیدا ہونے والے بچے کے لیے وظیفہ.....49
• ذمی کے لیے وظیفہ.....49
☆ زکوٰۃ کا فلسفہ و نظام.....50
• تزکیۂ مال کا ذریعہ.....50
• زکوٰۃ کا نظام اور برطانوی ولی عہد.....51
• گردش دولت گردش خون کی مانند.....51
• نبی اکرمؐ کی پیشین گوئی.....52
☆ وراثت کا فلسفہ و نظام.....54
• نبی اکرمؐ کی ہدایات.....54
• مسئلہ وراثت کی حساسیت.....55
• وراثت کا ایک مسئلہ.....55
• وراثت کی تقسیم اجتہادی امور میں سے نہیں.....56
• کیفیت یا تعلق، وراثت کا استحقاق کس بنیاد پر؟.....56
• صاحبِ مال کا صوابدیدی اختیار.....57
• وراثت کے حوالے سے عملی تقاضے.....58
☆ اہلِ خانہ کی مالی ذمہ داری.....59
• مہر، نفقہ اور وراثت.....59
• نفقہ کا معیار، حیثیت و عُرف کے مطابق.....59
• خاوند کے ذاتی مال پر بیوی کا اختیار.....60
• وراثت کی تقسیم.....61
☆ معاشی مساوات کا تصور.....62
• خلیفۂ اولؓ کے دور میں سرکاری مال کی تقسیم.....63
• خلیفۂ دومؓ کے دور میں سرکاری مال کی تقسیم.....63

- اجتماعی مفاد کا تقاضہ..... 63

☆ سربراہِ مملکت کا معیارِ زندگی..... 64

- نبی اکرمؐ کا معیارِ زندگی..... 64
- حضرت ابوبکر صدیقؓ کا معیارِ زندگی..... 65
- حضرت عمر فاروقؓ کا معیارِ زندگی..... 67

☆ سرکاری عہدیداران کے حقوق و فرائض..... 68

- ضروریات کا خیال..... 68
- نگرانی و احتساب..... 70
- دفاع و حمایت..... 71

☆ بیت المال کا نظام..... 72

- دورِ نبویؐ میں بیت المال کا آغاز..... 72
- دورِ خلافتِ راشدہ میں بیت المال کا نظم..... 73

☆ رفاہی ریاست کا تصور اور نمونہ..... 74

- شہریوں کی ضروریات اور اسوۂ نبویؐ..... 74
  - o مقروضوں کی مدد..... 75
  - o مسافروں کی مدد..... 76
  - o رفیق کاروں کی معاونت..... 77
- "کتاب الخراج" اور "کتاب الاموال"..... 79
- حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں یمن کا سالانہ بجٹ..... 79
- حضرت عمر فاروقؓ اور بچے کا وظیفہ..... 80
- حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور میں عراق کا سالانہ بجٹ..... 82
- سرکاری خزانہ، آگ کا انگارہ..... 83

☆ معاشی خود کفالت کی اسلامی بنیادیں..... 85

- سیرتِ طیبہؐ کا سبق..... 85

- تحریکِ آزادئ برصغیر کے راہنما مہاتما گاندھی کی تلقین.....86
☆ سود کی حیثیت رسول اللہؐ کی نظر میں.....87
☆ سود کی برائی اور استحصال.....90
- دورِ جاہلیت میں سود کی حیثیت.....90
- حجۃ الوداع پر سود کی حرمت کا اعلان.....91
- عالمِ اسلام اور سودی شکنجہ.....91
☆ سود اور نفع کا تقابلی جائزہ.....93
- اللہ تعالیٰ کے ہاں مال کی گنتی اور اس کی قدر.....93
- دولت کی گردش اور امام غزالیؒ کی مثال.....94
☆ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ضابطہ.....95
- شکر گزاری اور ناشکری کا عمومی ضابطہ.....95
- خود مانگی ہوئی نعمتوں کی ناشکری کا ضابطہ.....96
- تیل کی دولت اور عربوں کی بے بصیرتی.....98
- پاکستان جیسی نعمت کی ناقدری.....99
☆ قمری سال کے حوالے سے دو اہم مسئلے.....100
☆ حضرت شاہ ولی اللہؒ کے افکار.....101
☆ علامہ ابن خلدونؒ کے افکار.....103

عالمی منظر نامہ اور اسلامی نقطۂ نظر.....107

☆ محنت کشوں کا عالمی دن اور اسلام.....108
☆ کمیونزم، نوآبادیاتی نظام، اسلامی تعلیمات.....108
- کمیونزم کا خطرہ.....109
- ہمارا نوآبادیاتی معاشی و معاشرتی ڈھانچہ.....110
- معاش و اقتصاد کا اسلامی نقطۂ نظر.....111

☆ سرمایہ داریت، کمیونزم اور اسلام.....113
☆ سرمایہ دارانہ نظام اور پاپائے روم.....114
• مشرقی یورپ کا کمیونزم.....115
• متوازن نظام قبول کرنے میں ہچکچاہٹ.....115
☆ غیر فطری نظاموں سے نجات کا راستہ.....116
☆ یومِ مئی اور محنت کشوں کی بے کسی.....117
• معاشی و اقتصادی مشکلات اور خلافتِ راشدہ.....117
• تنخواہوں کے تفاوت کا مسئلہ.....119
• محنت کش کی مجبوری اور امام ابو حنیفہؒ.....119
• سالانہ بجٹ اور خوشحالی کا راستہ.....120
☆ مزدوروں کی محنت پر امیروں کی عیاشی کا استحصالی نظام.....121
• معاشرے کا نظام محنت کش کے دم قدم سے.....121
• جناب نبی اکرمؐ کی ہدایت.....122
• معاشرتی اور معاشی امتیاز کی چند جھلکیاں.....122
• برتری کا جذبہ اور استحصال کا جنون.....123
• محنت کش کی زندگی جی کر دیکھیں.....124
☆ ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات.....124
• جمعہ کے لیے غسل کا پس منظر.....125
• صحابہ کرامؓ کی تنگدستی اور خوشحالی کے دور.....125
• محنت کشی، انبیاءؑ و اصحابؓ کا مشغلہ.....126
• اصلاحِ احوال کے لیے دو گزارشات.....126
☆ ہجرت و پناہ گزینی، کل اور آج.....127
• اقوامِ متحدہ کی رپورٹ.....127
• اسباب و محرکات، تاریخی حوالے سے.....128

- آج کے عالمی تناظر میں دو گزارشات.....130

☆ کلہ بہ زئی؟.....131

- افغان مہاجرین سے ایک سوال.....131
- ہجرت کی شرعی حیثیت.....131
- مہاجرین اور مفاد پرستوں میں فرق کرنے کی ضرورت.....132
- کلہ بہ زئی کا سوال سامراج سے.....133
- افغان مہاجرین کی وطن واپسی.....134

☆ انسانی اسمگلنگ کا معاملہ.....135

- اقوامِ متحدہ کی رپورٹ.....135
- مسئلہ غلامی، اسلامی نقطۂ نظر سے.....135
- انسانی حقوق کے معاملہ میں عقیدہ و اخلاقیات کی ضرورت.....136

☆ عالمی قرضے: ایک کے بدلے گیارہ ڈالر کی ادائیگی.....137

☆ غریب ممالک کیلئے عالمی قرضوں سے نکلنے کا راستہ.....138

☆ سعودی عرب کا خسارے کا بجٹ اور مسلم ممالک.....139

☆ مسلم ممالک کی باہمی تجارت کیلئے الگ کرنسی کا منصوبہ.....140

- سونا و چاندی بطور زرِ حقیقی اور کاغذی نوٹوں کی حیثیت.....141
- اعداد و شمار کے ہیر پھیر کا عالمی نظام.....142

☆ مغرب کو تیسرے نظام کی تلاش.....143

☆ "عالمی یومِ خوراک" کے حوالے سے چند گزارشات.....144

- خوراک اور غربت کے حوالے سے ایک رپورٹ.....144
- کیا غربت اور بھوک کا سبب بڑھتی ہوئی آبادی ہے؟.....145
- وسائل و اسباب کا حصول اور ان کی تقسیم کا مسئلہ.....147

☆ ملکی وسائل پر انحصار.....148

پاکستان کے حالات و مسائل اور تقاضے 151

☆ افکارِ مفتی محمودؒ اور عصرِ حاضر 152
☆ چائلڈ لیبر اور بنیادی انسانی حقوق 155
- خدمت گزاری اور تربیت 156
- روزگار کی مشقت 156
- بنیادی ضروریات کی کفالت کی ذمہ داری 157
- دستور ۱۹۷۳ء کے لیے مفتی محمودؒ کی تجویز 158
- مسئلہ وسائل کا نہیں، اُن کی تقسیم کا ہے 159

☆ بچوں کی لازمی تعلیم اور چائلڈ لیبر کا مسئلہ 160
- پاکستان کی شرح خواندگی 160
- بچوں کی جبری مزدوری کا معاملہ 161

☆ رفاہِ عامہ کا محاذ اور ہماری غفلت 161
☆ بھیک اور بھکاریوں کے حوالے سے چند گزارشات 163
- کاہلی اور کام چوری کی بھیک 164
- ضرورت اور مجبوری کی بھیک 164
- ہمارے معاشرے کی صورتحال 165
- حکومت کی ذمہ داری 166

☆ مہنگائی، قوتِ خرید اور طبقاتی کلچر 167
- بچپن کے نرخ 168
- ۱۹۷۰ء کی تنخواہ 169
- قوتِ خرید کو سہارا دینے کی ضرورت 170

☆ معاشی بدحالی سے نکلنے کا صحیح راستہ 171
- ناہموار معاشی نظام اور قائداعظمؒ کا فرمان 171

- کم از کم اجرت کا معیار..... 172
- معاشی نظام کی تشکیلِ نو کی ضرورت..... 172

☆ سرکاری ملازمین کی گردن اور آئی ایم ایف کی چھری..... 173

☆ ملٹی نیشنل کمپنیوں کو لیز پر اراضی دینے کا معاملہ..... 175

☆ قومی معیشت کی بحالی کے تقاضے..... 177
- ملی مجلس شرعی پاکستان کا موقف..... 177
- طالب حسین ایڈووکیٹ کا آئی ایم ایف کے نام مکتوب..... 178

☆ قومی معیشت کی تشکیلِ نو، وقت کی اہم ضرورت..... 179
- قیامِ پاکستان کا مقصد..... 180
- اشعری قبیلہ کی روایت..... 180

☆ سرمایہ دارانہ وجاگیر دارانہ نظام کا تسلسل..... 181
- بانیٔ پاکستان کی ماہرینِ معیشت کو ہدایت..... 181
- مغربی نظامِ معیشت کا تسلسل..... 181

☆ قومی معیشت کی ”اوور ہالنگ“ کی ضرورت..... 182

☆ ”توڑو یہ کشکولِ گدائی، اترو قرض کی سولی سے“..... 183

☆ خواتین کی ملازمت اور فطرت کے تقاضے..... 185

☆ پاکستان میں کرپشن کی حکمرانی..... 187

☆ کرپشن کے خلاف مہم کب مؤثر ہوگی؟..... 188

☆ کرپشن ختم کرنے کا عہد اور اس کے تقاضے..... 188

☆ صدرِ پاکستان کا ذاتی خرچ پر حج، ایک اچھی روایت..... 190

☆ معاشرتی امتیاز اور طبقاتی تقسیم..... 190
- اسلامی معاشرت کا مثالی دور..... 191
- اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارش اور تفاوت کا قومی ماحول..... 192
- جمعیت علماء اسلام کی تجویز..... 193

☆ معاشی تفاوت کی دو خبریں.....194
- قومی سوچ کی ستم ظریفی.....195
- خلافتِ راشدہ اور مہاتما گاندھی.....195
- پاکستان میں غربت کا بڑھتا ہوا تناسب.....196

☆ لوڈشیڈنگ اور سفید پوشی.....197
☆ شادی گھر کا نظم: مسجد کا ایک اور معاشرتی کردار.....199
☆ مفادات کی جنگ کیلئے اسلام کا نعرہ!.....201
☆ بیرون ملک جانے کا جنون.....201
☆ حلال کی کمائی میں برکت ہے.....202
☆ قومی مفاد کا تقاضہ کیا ہے؟.....203
☆ گریڈ سسٹم اور انتظامی ڈھانچہ.....203

دینی خدمت گزاروں کی مشکلات وضروریات.....206

☆ محراب ومنبر کے وارث محنت مزدوری کیوں نہیں کرتے؟.....207
- مغلیہ دور میں مساجد ومدارس کی سرکاری سرپرستی.....207
- چندہ کے نظام کے حوالے سے دو قسم کے معترضین.....207
- نواب ریاست حیدر آباد کی مدارس کو پیشکش.....208
- دورِ نبویؐ سے راہنمائی.....209

☆ ضروریات اور معاوضوں کا تفاوت: ایک استفسار.....210
☆ مساجد ومدارس کے ملازمین کے مسائل.....216
- تنخواہوں اور مراعات کا معاملہ.....216
- معاشرتی حیثیت کا معاملہ.....217
- اسلام کا مزاج کیا ہے؟.....218
  - o سرکاری وسائل کی تقسیم.....218

o سرکاری عہدیداران کا معیارِ زندگی اور طرزِ زندگی.....219
• بانیٔ پاکستان کے افکار.....221
• جمعیت علماء اسلام کا موقف.....222
• اربابِ اختیار کی خدمت میں دو گزارشات.....222
☆ دینی طلبہ کے روزگار کا مسئلہ اور حضرت حسین احمد مدنیؒ.....223
☆ دینی خدمات کا معاوضہ اور مولانا محمد مسلم قاسمی.....227
• بغیر معاوضہ کے دینی خدمات کا تصور.....228
• "عرف" کے دائرہ کا تعیّن.....228
• "لا رضاء مع الاضطرار".....229
• "کوئی اور کام" کرنے کا مشورہ.....230
☆ دینی مدارس میں انقلابی تبدیلیوں کیلئے سرکاری فنڈ.....231

پیش لفظ

(اشاعت اول)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

معیشت انسانی معاشرہ کا ایک اہم شعبہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں "جعل اللہ لکم قیاماً" بتایا ہے کہ اموال و دولت کو خالقِ کائنات نے انسانوں کے لیے زندگی گزارنے کا اہم ذریعہ قرار دیا ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں اور تقاضوں پر کلام پاک میں تفصیلی بات کی گئی ہے۔ جبکہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام خصوصاً نبیٔ آخر الزماں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے اصول و ضوابط اور احکام و قوانین ہر پہلو سے واضح کیے ہیں۔ اس حوالہ سے راقم الحروف نے جرائد و اخبارات میں شائع ہونے والے مضامین میں وقتاً فوقتاً معروضات پیش کی ہیں اور مجالس میں اظہار خیال کیا ہے جن کا ایک جامع انتخاب فرزند عزیز حافظ ناصر الدین خان عامر نے زیر نظر مجموعہ میں مرتب کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس محنت کو قبول فرمائیں اور ہمارے لیے ذخیرۂ آخرت بنادیں، آمین یارب العالمین۔

ابو عمار زاہد الراشدی
خطیب مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ
۱۶ اکتوبر ۲۰۲۳ء

اسلامی نظامِ معیشت پر ایک نظر

خیر و برکت کے اصول

قرآن کریم میں شرک اور جاہلانہ رسوم کی مذمت و مخالفت کے ساتھ ساتھ حلال و حرام کے ان ضابطوں کو بھی موضوعِ بحث بنایا گیا ہے جو دورِ جاہلیت میں مختلف قبائل اور علاقوں کے لوگوں نے از خود طے کر لیے تھے اور جن پر وہ صدیوں سے عمل پیرا تھے۔

حلال و حرام کے خود ساختہ ضابطے

مطلق اباحیت اور فری اکانومی کا یہ تصور قدیم سے موجود چلا آرہا ہے کہ ہم اپنے اموال میں تصرف کے حوالے سے خود مختار ہیں اور کسی کو اس میں مداخلت کا حق حاصل نہیں ہے۔

- اس فلسفہ کا اظہار حضرت شعیب علیہ السلام کے حوالے سے بھی ملتا ہے کہ جب انہوں نے قوم کو تلقین فرمائی کہ ماپ تول میں کمی نہ کرو اور مال کے معیار کو خراب نہ کرو اس لیے کہ یہ بات سوسائٹی میں فساد اور بگاڑ کا باعث بنتی ہے، اس پر قوم نے انہیں جواب میں کہا تھا کہ کیا تمہاری نمازیں اس بات کی تلقین پر تمہیں آمادہ کرتی ہیں کہ ہم اپنے آباؤ اجداد کے معبودوں کو چھوڑ دیں اور ''ان نفعل فی اموالنا ما نشآء'' (ہود ۸۷) یا اپنے مالوں میں اپنی مرضی سے تصرف نہ کر سکیں۔
- کم و بیش اسی طرح کی بات قارون نے بھی اپنی قوم سے کہی تھی جب اس سے کہا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں جو مال دیا ہے اس میں سے اللہ تعالیٰ کا حق ادا کرو۔ تو اس نے جواب میں کہا ''انما اوتیته علٰی علم عندی'' (القصص ۷۸) کہ مجھے تو یہ مال اپنے علم اور ہنر کے باعث ملا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جابجا اس جاہلانہ فلسفہ کا ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ یہ تصور اور اس کی بنیاد پر بنائے جانے والے معاشی قوانین خود ساختہ ہیں جن کا فطرت اور حکم خداوندی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

حلال و حرام کا اختیار خدائے واحد کا

قرآن کریم میں حلال و حرام کے اصول اور ضابطے طے کرنے کو خالصتًا اللہ تعالیٰ کا حق اور اختیار قرار دیا گیا ہے، اور اس سے ہٹ کر بنائے جانے والے ضابطوں کو جاہلیت سے تعبیر کیا گیا ہے بلکہ اسے شرک

کی ایک صورت بتایا گیا ہے۔

- بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضرت عدی بن حاتمؓ کو قرآن کریم کی ایک آیت سمجھنے میں الجھن پیش آئی جو انہوں نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کی۔ سورہ التوبہ آیت ۳۱ میں عیسائیوں کے بارے میں کہا گیا ہے "اتخذوا احبارھم و رھبانھم اربابا من دون اللہ" (التوبہ ۳۱) کہ انہوں نے اپنے علماء و مشائخ کو اللہ کے سوا رب بنالیا ہے۔ حضرت عدی اسلام قبول کرنے سے پہلے عیسائی تھے بلکہ عیسائی قبیلہ کے سردار تھے، انہوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہم نے تو اپنے احبار و رہبان کو "اربابا من دون اللہ" کا درجہ نہیں دیا تھا، یہ قرآن کریم نے کیا کہہ دیا ہے؟ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تمہارے ہاں علماء و مشائخ کو حلال و حرام میں ردوبدل کا اختیار تمہارے عقیدہ کے مطابق حاصل تھا؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہاں یہ تو ہمارے ہاں سمجھا جاتا تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ قرآن کریم نے اسی کو "اربابا من دون اللہ" سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے لیے حلال کو حرام یا حرام کو حلال کرنے کا اختیار ماننا بھی شرک کی ایک صورت ہے۔
- حتیٰ کہ جب آنحضرتؐ نے اپنی ذات کے لیے شہد کا استعمال ممنوع قرار دیا تو قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "لم تحرم ما احل اللہ لک" (التحریم ۱) جو چیز اللہ تعالیٰ نے حلال کی ہے اسے آپ نے اپنے لیے کیسے حرام کہہ دیا ہے؟ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے حکم پر آپؐ نے قسم توڑی، شہد استعمال کیا اور قسم کا کفارہ ادا کیا۔

گزارش کا مقصد یہ ہے کہ حلال و حرام کے اصول اور ضابطے بھی قرآن کریم نے واضح طور پر بیان فرمائے ہیں اور کہا ہے کہ کسی کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حلال یا حرام کیے جانے کے معاملہ میں دخل اندازی کا حق حاصل نہیں ہے۔ اور قرآن کو ماننے والے قیامت تک اس بات کے پابند ہیں کہ وہ حلال و حرام کے ان قوانین کی بہرحال پابندی کریں جو اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمائے ہیں اور جن کی جناب نبی اکرمؐ نے وضاحت کی ہے۔

جبکہ حرام کی جانے والی اشیا میں قرآن کریم نے سب سے زیادہ سنگینی سود کی بیان کی ہے اور اس لہجے میں بات کی ہے کہ اگر تمہارا خدا اور آخرت پر ایمان ہے تو سود کھانا ترک کر دو۔ اور یہاں تک فرمایا ہے کہ اگر تم سود کے لین دین سے باز نہیں آتے تو یہ خدا اور اس کے رسول کے خلاف اعلان جنگ کے مترادف ہے۔ میں چونکہ اس محفل میں تاجر بھائیوں سے بات کر رہا ہوں اس لیے یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ تجارت بہت اچھا پیشہ ہے اور اس کے دنیاوی اور اخروی ثمرات و برکات بے شمار ہیں، لیکن یہ تب ہوگا

جب حلال و حرام کے شرعی ضابطوں کی پابندی کی جائے گی اور اللہ تعالیٰ اور رسولِ خداؐ کی ہدایات کے مطابق کاروبار کیا جائے گا۔

خیر و برکت کے پانچ اصول

اللہ تعالیٰ نے مال و دولت کو نعمت قرار دیا ہے مگر اس کے ساتھ قرآن کریم نے اس کے لیے پانچ ضابطے بیان کیے ہیں جو قارون کے ساتھ بنی اسرائیل کے مکالمہ کی صورت میں اس طرح مذکور ہیں کہ:

1. مال و دولت کو تکبر اور برتری کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔
2. اسے آخرت کی تیاری کا ذریعہ بنایا جائے۔
3. اسے دنیا کی بہتری کے لیے بھی استعمال کیا جائے۔
4. جیسے اللہ تعالیٰ نے تم پر احسان کیا ہے تم بھی لوگوں پر احسان کرو۔
5. مال و دولت کو سوسائٹی میں فساد اور بگاڑ کا ذریعہ بنانے سے گریز کیا جائے۔

اگر ہم کاروبار اور اس کے ذریعے حاصل ہونے والے مال و دولت میں ان پانچ قرآنی اصولوں کو راہنما بنالیں تو یہ ہمارے لیے دنیا اور آخرت دونوں جگہ برکت و ثواب اور کامیابی کا ذریعہ ثابت ہوں گے۔

(جامعہ بدر العلوم، خیر پور، سندھ میں خطاب۔ مطبوعہ روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۹ مئی ۲۰۱۶ء)

معیشت کے چند انفرادی و اجتماعی تقاضے

محنت کش اور ان کی معاشرتی حیثیت

محنت انسانی عظمت کا ایک ایسا عنوان اور اجتماعیت کا ایک ایسا محور ہے جس کے گرد انسانی معاشرہ کی چکی گھومتی ہے اور جس کے بغیر نوع انسانی کی معاشرت اور اجتماعیت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ کائنات کے خالق و مالک نے انسانی معاشرہ کے لیے جو فطری نظام زندگی نازل فرمایا اس میں محنت کی عظمت کا نہ صرف اعتراف کیا گیا ہے بلکہ دینِ خداوندی کو پیش کرنے والے عظیم المرتبت انبیاء علیہم السلام کو محنت کشوں کی صف میں کھڑا کر کے خداوندِ عالم نے محنت کو پیغمبری وصف کا درجہ عطا فرمایا۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے مطابق: آدم علیہ السلام نے کاشت کاری کی، سوت کاتا۔ نوح علیہ السلام نے لکڑی کا کام کیا اور اپنی محنت سے کھاتے تھے۔ ادریس علیہ السلام درزی تھے۔ شیث علیہ السلام سوت کاتتے تھے۔ داؤد علیہ السلام بادشاہ ہونے کے باوجود لوہے کی زرہیں بناتے اور

ان کی کمائی کھاتے تھے۔

خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محنت کو اپنا شعار بنایا، بیت اللہ کی تعمیر نو، مسجد کی نبویؐ کی تعمیر، اور مدینہ منورہ کے دفاع کے لیے خندق کھودتے وقت آپؐ نے محنت کش کا جو عظیم کردار دنیا کے سامنے پیش کیا وہ محنت کشوں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ حضرت جابر بن عبد اللہؓ فرماتے ہیں کہ ہم غزوۂ احزاب کے موقع پر خندق کھود رہے تھے کہ ایک سخت چٹان آڑے آگئی، آنحضرتؐ کو صورتحال سے آگاہ کیا گیا تو آپؐ اس حالت میں کہ تین دن سے کچھ نہیں کھایا تھا اور بھوک کی شدت کے باعث پیٹ پر پتھر باندھ رکھا تھا، تشریف لائے، کدال اٹھائی اور چٹان کو ریزہ ریزہ کر دیا (بخاری ص ۸۸ ج ۲)۔ حضرت براء بن عازبؓ فرماتے ہیں کہ آنحضرتؐ خندق کی کھدائی کے موقع پر اپنے ہاتھوں سے مٹی اٹھا اٹھا کر باہر پھینکتے تھے (بخاری ص ۵۸۹ ج ۲)۔

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی اکثر محنت کش تھے۔ بخاری ص ۲۷۸ ج ۱ میں ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ اور ابوداؤد ص ۵۱ ج ۱ میں حضرت عکرمہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرامؓ "عمال انفسہم" (اپنے کام کاج خود کرنے والے) محنت کش تھے اور موٹا جھوٹا پہنتے تھے جس کی وجہ سے جمعہ کے اجتماع کے موقع پر ان کے پسینہ کی بو پھیلتی تھی۔ اسی بنا پر آنحضرتؐ نے جمعہ کے دن غسل کا حکم دیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محنت کش کی کمائی کو سب سے اچھی کمائی قرار دیا۔ بخاری ص ۲۷۸ ج ۲ میں حضرت مقدام بن معدی کربؓ سے روایت ہے کہ نبی کریمؐ نے فرمایا کہ اس سے اچھی کمائی کوئی نہیں کہ انسان اپنے ہاتھ کی محنت سے کھائے۔

اس کے ساتھ ہی جناب رسول اللہؐ نے محنت کشوں کو معاشرہ میں ان کا صحیح مقام دلانے کے لیے جو ہدایات فرمائیں اور قرآن وحدیث میں محنت کشوں کے معاشرتی مقام کا جو نقشہ کھینچا دنیا کا کوئی نظام بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔ آنحضرتؐ کی بعثت سے قبل محنت کشوں، غلاموں اور نچلے طبقے کے لوگوں کو معاشرہ میں حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، نام نہاد بڑے لوگ ان کے ساتھ بیٹھنا توہین سمجھتے تھے اور انہیں وہ حقوق حاصل نہ تھے جو انسانی معاشرہ میں حاصل ہونے چاہئیں، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محنت کشوں کو ان کے صحیح مقام و مرتبہ سے سرفراز فرمایا۔

محنت کشوں سے "وڈیروں" کی نفرت کا اندازہ اس واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ مکہ مکرمہ میں جناب نبی اکرمؐ کی مجلس میں حضرت بلالؓ، حضرت خبابؓ، حضرت عمارؓ اور حضرت زیدؓ جیسے حضرات بھی تھے۔ اتنے میں چند کافر سردار آئے کہ ہم آپ کی بات سننا چاہتے ہیں اور شاید سمجھ کر مان بھی لیں لیکن "ضعفاء"

کے ساتھ بیٹھنا ہماری توہین ہے، آپ ہمیں الگ مجلس میں اپنی بات سمجھائیں۔ سرداروں اور وڈیروں کی یہ فرمائش اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ان الفاظ کے ساتھ رد فرمائی ہے کہ:

"اے حبیبؐ! (ان کافروں وڈیروں کی وجہ سے) ان لوگوں کو دور نہ ہٹائیں جو صبح شام اپنے رب کو اس کی رضا کے لیے یاد کرتے ہیں، نہ ان کے حساب کی آپ پر ذمہ داری ہے اور نہ آپ کے حساب کی ان پر ذمہ داری ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ ان کو (اپنی مجلس سے) ہٹادیں تو آپ کا شمار ناانصافوں میں ہوجائے"۔ (سورہ الانعام)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غلاموں کے بارے میں، جو محنت کشوں کا سب سے نچلا درجہ اور کمزور طبقہ شمار ہوتا تھا، حسن سلوک کی بار بار نصیحت فرمائی، حتیٰ کہ آپ کی آخری وصیت "الصلاۃ وما ملکت ایمانکم" بھی نماز کی پابندی اور غلاموں کے ساتھ حسنِ سلوک کی دو ہدایات پر مشتمل تھی۔ آپؐ نے غلاموں کو معاشرہ میں معیار زندگی کے لحاظ سے دوسرے لوگوں کے مساوی درجہ عطا فرمایا اور واضح طور پر ہدایت فرمائی کہ:

"یہ غلام تمہارے ہی بھائی اور ساتھی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے تمہارے ماتحت کر دیا ہے۔ پس تم میں سے کسی شخص کے تحت اس کا بھائی ہو تو اسے وہی کھلائے جو خود کھاتا ہے، وہی پہنائے جو خود پہنتا ہے اور ایسا کوئی کام اس کے ذمہ نہ لگائے جو اس کے بس سے باہر ہو۔" (بخاری ص ۹ ج ۱)

جناب رسول اللہؐ کے اس واضح ارشاد سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کوئی مشکل امر نہیں ہے کہ جب مالک اور اس کے خرید کردہ غلام کے درمیان معیارِ زندگی کی برابری اسلامی نظام کا بنیادی تقاضا ہے تو آج کارخانہ دار اور مزدور کے درمیان بھی معیار زندگی کی برابری قائم کر کے ہی اسلامی نظام کو صحیح طور پر روبہ عمل میں لایا جا سکتا ہے۔ آنحضرتؐ کے اس ارشاد پر صحابہ کرامؓ نے انفرادی اور اجتماعی طور پر جس طرح عمل کیا اور خلافتِ راشدہ کی صورت میں اسلامی نظام کا جو مثالی معاشرہ دنیا کے سامنے پیش کیا، دنیا کی تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

انفرادی طور پر:

- حضرت عثمانؓ اپنے غلاموں کو خود اپنے معیار کا کھانا اور لباس مہیا فرماتے۔
- حضرت عبداللہ بن عمرؓ اپنی لڑکیوں اور لونڈیوں کو ایک جیسا زیور پہناتے۔
- حضرت ابوذر غفاریؓ اپنا اور اپنے غلام کا لباس ایک ہی کپڑے سے سلواتے۔

اور اجتماعی طور پر:

- اس معاشرہ میں جہاں بڑے اور چھوٹے طبقوں کی واضح تقسیم موجود تھی، اسلام نے خلافتِ راشدہ کی صورت میں ایسے معاشرہ کی بنیاد ڈالی جس میں بڑے چھوٹے اور متوسط طبقوں کا وجود باقی نہیں رہا تھا۔ معاشرہ میں امیر المؤمنین، صوبوں کے گورنر اور عمّال کا طبقہ بھی موجود تھا اور اس حکمران طبقہ کا معیارِ زندگی وہی تھا جو ایک عام آدمی کا تھا۔
- حضرت ابوبکرؓ کے لیے بیت المال سے وظیفہ کے تعیّن کے لیے مشورہ ہو رہا تھا تو حضرت علیؓ نے فرمایا کہ آپ کی اور آپ کے اہل و عیال کی ضروریات کو معروف طریقہ سے (عام آدمی کی طرح) پورا کرنے کے لیے جتنا وظیفہ ضروری ہو وہی آپ کا ہے۔ اصحابِ شوریٰ نے حضرت علیؓ کے قول کو پسند کیا اور اسی پر فیصلہ ہو گیا (طبری ص ۱۶۴ ج ۴)۔ جبکہ حضرت عمرؓ نے بھی اپنا اور اپنے گورنروں اور عمّال کا وظیفہ عام آدمی کے گزارے کے مطابق مقرر فرمایا۔
- معاشرہ میں حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت عثمانؓ جیسے مالدار تاجر بھی تھے مگر ان کا رہن سہن اور کھانا پینا معاشرہ کے عام آدمی کی طرح تھا۔ اور ان کی دولت ذاتی تعیش اور نمود پر صرف ہونے کی بجائے غرباء اور معاشرہ کی فلاح و بہبود میں صرف ہوتی تھی۔

ہمارے معاشرہ کی طبقاتی تقسیم کا پس منظر

الغرض آج جس طرح معاشرہ بڑے طبقے، متوسط طبقے اور چھوٹے طبقے میں تقسیم ہو چکا ہے اور اصحابِ ثروت نے دولت کے اظہار و تعیش کے لیے ہر شہر میں اپنے الگ الگ محلے بسا لیے ہیں، خلافتِ راشدہ کے دور میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بلکہ اسلام نے پہلے سے موجود طبقاتی تقسیم کو ختم کر کے خلافتِ راشدہ کی صورت میں ایک خالصتاً غیر طبقاتی معاشرہ پیش کیا۔ اور یہاں اس حقیقت کا اظہار شاید بے محل نہ ہو کہ آج کمیونزم کے جس خطرات کا اظہار کیا جا رہا ہے اس کی بنیادی وجہ معاشرہ کی طبقاتی تقسیم ہی ہے جس کے نتیجہ میں

- ایک طرف دولت سے کھیلنے والوں اور بات بات پر دولت کی نمائش کرنے والوں کا طبقہ بلند و بالا محلوں میں عیش و عشرت کی زندگی گزار رہا ہے
- اور دوسری طرف اسی معاشرہ میں آبادی کی اکثریت روز مرہ ضروریات کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔

کمیونزم ہمیشہ معاشرہ کی طبقاتی تقسیم سے جنم لیتا ہے اس لیے کمیونزم کا راستہ بھی صرف اسی صورت میں روکا جاسکتا ہے کہ معاشرہ میں معیارِ زندگی کی برابری کا اصول اپنا کر خلافتِ راشدہ کی طرز پر غیر طبقاتی معاشرہ کی تشکیل کے لیے اجتماعی اور ہمہ گیر جدوجہد کا آغاز کیا جائے۔ ورنہ کمیونزم کا راستہ صرف نعروں اور جذباتی تقریروں سے نہیں روکا جاسکے گا۔

ہمارا آج کا موجودہ اقتصادی و معاشی نظام نوآبادیاتی دور کی یادگار ہے، اسلام کا اس سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس نظام کو تبدیل کر کے محنت کشوں کو معاشرہ میں دوسرے طبقوں کے برابر معیارِ زندگی کی سہولتیں فراہم کی جائیں، اور حقِ ملکیت میں مساوات کا وہ واضح اور اٹل اصول اپنایا جائے جو اسلامی نظام کی اصل روح ہے۔ نامناسب نہ ہوگا اگر یہاں حقِ ملکیت میں مساوات کے اصول کی تھوڑی سی وضاحت کر دی جائے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ اسلام معاشرہ کے مختلف طبقات اور افراد کے درمیان مساوات کا کیا اصول قائم کرتا ہے۔

انفرادی ملکیت اور وسائل کی اجتماعی تقسیم

اسلام نے فرد کی ملکیت کے حق کو تسلیم کیا ہے اور اسے یہ بھی اجازت دی ہے کہ وہ جائز اور حلال ذرائع سے اپنی ملکیت اور دولت میں جس قدر چاہے اضافہ کر لے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسلام یہ پابندی بھی لگاتا ہے کہ:

- دولت کی اجتماعی گردش صرف سرمایہ داروں میں محدود نہ رہے بلکہ معاشرہ کے تمام طبقے اس سے فیضیاب ہوں۔ "لا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم" (سورۃ الحشر)
- دولت کی ایسی نمائش اور عیش و عشرت کے ایسے مواقع جن سے محروم طبقے مایوسی کا شکار ہوں، یا ان میں مسابقت اور معیارِ زندگی میں آگے بڑھنے کا جذبہ ناجائز ذرائع کو اختیار کرنے کی سوچ پیدا کر دے، قانوناً ممنوع قرار دیے جائیں۔
- معیارِ زندگی مثلاً خوراک، لباس اور رہائش وغیرہ معاملات میں معاشرہ کے مختلف طبقات کے درمیان یکسانیت کا اصول کارفرما رہے، اور اگر اس مقصد کے لیے کسی قانونی قدغن کی ضرورت ہو تو اس سے بھی گریز نہ کیا جائے۔ جیسا کہ حضرت عمرؓ نے بصرہ شہر کی تعمیر کے وقت پابندی لگا دی تھی کہ کوئی شخص تین کمروں سے زائد مکان نہ بنائے، اور یہ بھی ہدایت فرمادی تھی کہ مکانوں کو بلند کرنے میں ایک دوسرے سے مقابلہ نہ کرو۔" (بحوالہ اسوۂ صحابہؓ ص ۲۶۵ ج ۱)
- دولت اور اس کے جو ذرائع حکومت کی طرف سے تقسیم کیے جائیں ان میں بالکل برابری اور

مساوات کا اصول اپنایا جائے، جیسا کہ حضرت ابوبکرؓ نے بیان فرمایا۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے خلیفہ بننے کے بعد جب بحرین وغیرہ سے مال آیا تو آپؓ نے اسے مدینہ کے شہریوں میں برابر تقسیم کر دیا۔ کچھ لوگوں نے اعتراض کیا کہ حضرت لوگوں میں کچھ فضیلت اور مرتبہ والے بھی ہیں لیکن آپؓ نے سب کو برابر حصہ دیا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ جہاں تک فضیلت اور درجہ کا تعلق ہے اس کا ثواب اللہ تعالیٰ دیں گے "وھذا معاش فالاسوۃ فیہ خیر من الاثرہ" (کتاب الخراج ص ۵۰) اور یہ معیشت ہے اس میں برابری اور مساوات کا اصول ترجیح سے بہتر ہے۔

- اور جیسا کہ خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دولت کی مساوی تقسیم کو ہی اسلامی معیشت کا صحیح اصول قرار دیا ہے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ جناب نبی اکرمؐ نے امام مہدیؑ کے ظہور کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ جب امام مہدیؑ آئیں گے تو زمین ظلم و جور سے پر ہوگی اور امام مہدیؑ ظلم و جبر کا خاتمہ کر کے دنیا بھر میں عدل و انصاف کو غالب کر دیں گے۔ پھر فرمایا "ویقسم المال صحاحا قال لہ رجل ما صحاحا قال بالسویۃ بین الناس، رواہ احمد و ابو یعلی و رجالہما ثقات" (مجمع الزوائد ص ۳۱۴ ج ۷) کہ امام مہدیؑ لوگوں میں صحیح طریقہ سے تقسیم کریں گے، ایک شخص نے پوچھا کہ صحیح طریقہ کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ لوگوں میں برابری اور مساوات کی بنیاد پر۔

اجتماعی ضرورت اور اصحابِ ثروت کا زائد مال

الغرض اسلام نے جائز ذرائع سے دولت کمانے کی اجازت دینے کے ساتھ ساتھ معیارِ زندگی کی برابری اور قومی سطح پر دولت اور اس کے ذرائع کی تقسیم میں مساوات کو اصول قرار دیا ہے۔ اور مساوات کے اس اصول کو قائم کرنے کے لیے بوقتِ ضرورت اصحابِ ثروت سے ان کا زائد مال حاصل کر کے دوسرے لوگوں میں تقسیم کرنے کا تصور بھی موجود ہے، جیسا کہ:

- حضرت ابوعبیدہؓ بن الجراحؓ نے ایک سفر کے دوران جب آپؓ کے ہمراہ تین سو صحابہؓ تھے، زادِ راہ ختم ہونے پر سب لوگوں کے زادِ راہ اُن سے حاصل کر لیے اور برابری کی بنیاد پر اس میں سے ان کو خوراک دیتے رہے۔ (محلی ص ۱۵۸ ج ۶)
- اسی طرح حضرت عمرؓ نے ایک موقع پر فرمایا تھا کہ جو بات میں نے اب محسوس کی ہے اگر اسے پہلے محسوس کر لیتا تو مالداروں کے زائد اموال ان سے چھین کر مہاجر فقراء میں تقسیم کر دیتا۔

(محلی ص ۱۵۸ ج ۶)

اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اگر معاشرہ کسی وقت اس نوعیت کی صورتحال سے دوچار ہو جائے تو معیارِ زندگی میں برابری اور دولت و ذرائع دولت کی تقسیم میں مساوات کے اصول کو دائرہ عمل میں لانے کے لیے اصحابِ ثروت کے زائد اموال کو ضبط کیا جاسکتا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے محنت اور محنت کش کی عظمت کو نہ صرف تسلیم کیا بلکہ معاشرہ میں محنت کشوں کو تمام طبقوں کے برابر معیارِ زندگی کی ضمانت دی، اور دولت کے قومی ذرائع سے ہر شہری کے برابر مستفید ہونے کے حق کو اصول قرار دیا۔ یہ انسانی معاشرت کے ایسے فطری اور محکم اصول ہیں جن سے بہتر اصول اور کوئی نظام پیش نہیں کر سکتا۔

آخر میں ہم اپنی گزارشات کا اختتام امیر المومنین حضرت علیؓ کے اس ارشاد گرامی پر کرنا چاہتے ہیں کہ:

> "اللہ تعالیٰ نے اغنیاء کے مالوں میں فقراء کا اتنا حق رکھا ہے جس سے ان کی ضروریات کی کفایت ہو سکے۔ پس اگر فقراء بھوکے رہیں یا ننگے ہوں یا اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مشقت کا شکار ہوں تو یہ اغنیاء کی بے پرواہی اور ان کی طرف سے فقراء کے حقوق میں کوتاہی کے باعث ہوگا۔ اور ایسے اغنیاء اللہ تعالیٰ سے محاسبہ اور عذاب کے مستحق ہیں۔" (المحلی لابن حزم ص ۱۵۶ ج ۱)

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور - اپریل ۱۹۸۳ء)

محنت کشی اور معاشی ضروریات

محنت کش کسے کہتے ہیں؟

پہلی بات یہ کہ مزدور کسے کہتے ہیں؟ شاہ ولی اللہؒ کہتے ہیں کہ ہم آپس میں اشیا اور صلاحیتوں کا تبادلہ کرتے ہیں تو ہمارا نظام چلتا ہے۔ ہر آدمی اپنی ساری ضروریات خود پوری نہیں کر سکتا، کوئی ضرورت کوئی بندہ پوری کرتا ہے، دوسری ضرورت کوئی اور پوری کرتا ہے۔ ایک آدمی کہے کہ میں گھر بھی خود بنالوں گا، غلہ بھی خود اگالوں گا، دروازے بھی خود بنالوں گا، زمین سے پانی بھی خود نکال لوں گا، جانور بھی خود چرا لوں گا، تو یہ ممکن نہیں ہے۔ ایک آدھ کام خود کرے گا اور باقی کاموں میں دوسروں کی خدمت لے گا۔ انسان کی فطرت ہے کہ کسی کام میں، جو یہ جانتا ہے، دوسروں کا تعاون کرے گا اور دوسروں سے اپنے کاموں میں تعاون حاصل کرے گا۔ مثلاً ایک آدمی بکریاں چراتا ہے تو بکریاں چرانے کے کام میں تعاون کرے گا اور باقی کاموں میں تعاون لے گا۔ کسی سے غلہ لے گا، کسی سے کپڑے لے گا وغیرہ۔ تبادلہ اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون پر ہمارا سارا نظام چلتا ہے۔ اگر سارے لوگ اپنے گھروں میں بیٹھ جائیں کہ ہم اپنا اپنا کام کریں تو کتنے دن تک گزارا کر لیں گے؟ چوبیس گھنٹے بھی اس کے بغیر گزارا نہیں ہو سکتا کہ ہمارا سارا نظام اس پر ہے۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ تبادلے اور تعاون کی دو صورتیں ہیں:

- ایک ہے چیزوں کا تبادلہ، مثلاً دودھ دے دیا، غلہ لے لیا۔ پرانے زمانے میں دکانداری زیادہ تر گندم اور مونجی پر چلتی تھی کہ دکان پر مونجی دے آئے اور دال لے آئے، باجرہ دے آئے اور مولیاں لے آئے، گندم دے آئے اور گڑ لے آئے۔ اب بھی دور دراز دیہات میں یہ چلتا ہے۔ کوئی چیز دے کر دوسری چیز لینے کو تجارت کہتے ہیں، اسی طرح پیسے دے کر چیز لینا بھی تجارت ہے کیونکہ پیسے بھی کسی چیز کے نمائندہ ہیں۔
- دوسری صورت یہ کہ اگر مجھے کسی چیز کی ضرورت ہے اور میرے پاس اس کے عوض دینے کے لیے کوئی چیز یا پیسے نہیں ہیں تو میں کوئی خدمت و محنت کروں گا اور اس کے عوض میں وہ چیز لوں گا۔ یہ ہے مزدوری، جیسے گندم کی کٹائی کرتے ہیں اور معاوضہ میں گندم لیتے ہیں۔ اجرت پر کام کرنا مزدوری ہے اور ساری دنیا کا دارومدار اس پر ہے۔

انبیاء کرامؑ اور محنت کشی

دوسری بات یہ کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کے سارے پیغمبر اپنے اپنے دور میں مزدور رہے ہیں۔ یہ حقیر پیشہ نہیں ہے، انبیاءؑ کا پیشہ ہے۔ فرمایا، ہر نبی نے بکریاں چرائی ہیں، کوئی پیغمبر ایسا نہیں جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں۔ موسیٰ علیہ السلام نے دس سال حضرت شعیب علیہ السلام کی بکریاں چرائیں اور پھر وہاں سے رشتہ بھی مل گیا تھا۔ انہوں نے جو آٹھ یا دس سال خدمت کی اور بکریاں چرائیں، یہ مزدوری تھی۔ اس کا مطلب یہ کہ ہر پیغمبر نے مزدوری کی۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ بکریاں چرانا بہت مشکل کام ہے اور بندوں کو چلانا اس سے بھی مشکل کام ہے۔ بھیڑیں چرانا آسان ہے کہ ایک بھیڑ کو جدھر لے جائیں باقی ساری اس کے پیچھے ہی آئیں گی، جبکہ بکریاں چر رہی ہوں تو ہر بکری علیحدہ رخ پر ہوگی۔ بیس بکریاں سنبھالنا مشکل ہوتا ہے اور سو بھیڑیں سنبھالنا آسان ہے۔ اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو پہلے بکریوں کی ٹریننگ کراتے ہیں تاکہ بندوں کو صحیح سنبھال سکیں کیونکہ بندوں کے مزاج بھی مختلف ہوتے ہیں۔

جب آپؐ نے یہ فرمایا کہ ہر نبی نے بکریاں چرائی ہیں تو ایک صحابی نے عرض کیا "وانت یارسول اللہ؟" یا رسول اللہ! آپ نے بھی بکریاں چرائی ہیں؟ آپؐ نے فرمایا، ہاں میں کئی سال مکہ میں فلاں قبیلے کے بکریاں چند پیسوں کے عوض چراتا رہا ہوں۔ گویا فرمایا یہ کوئی حقارت والا کام نہیں ہے، عزت والا کام ہے۔

حضورؐ نے پیغمبروں کا سردار ہو کر مزدوری کی اور حضرت داؤد علیہ السلام بادشاہ ہو کر مزدوری کرتے رہے ہیں۔ وہ زرہیں بناتے تھے اور زرہوں کی کمائی پر گھر کا خرچہ چلتا تھا، شاہی خزانے سے لینا ان کا حق تھا لیکن وہ اس سے نہیں لیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے بطور خاص ان کو ایک ہنر سکھایا تھا "علمنٰہ صنعة لبوس لکم لتحصنکم من باسکم" (الانبیاء ۸۰) ہم نے داؤدؑ کو زرہیں بنانا سکھایا تھا۔ زرہیں بنا کر بیچتے تھے اور گھر کا خرچہ چلاتے تھے۔ یعنی بنی اسرائیل کے بڑے خلیفہ حضرت داؤدؑ مزدوری کرتے رہے۔

جبکہ مسلمانوں کے بڑے خلیفہ حضرت ابوبکرؓ جب خلیفہ بنے تو دوسرے دن کپڑوں کی گٹھری سر پر اٹھائی اور بیچنے بازار چل دیے۔ آپؓ پھیری لگایا کرتے تھے، کپڑا بُنتے بھی تھے اور بیچتے بھی تھے۔ راستے میں حضرت عمرؓ ملے۔ پوچھا، حضرت! کدھر جا رہے ہیں؟ فرمایا کام پر جا رہا ہوں۔ انہوں نے کہا، آپ کام پر جائیں گے تو پیچھے مقدمے کون سنے گا؟ کسی ملک کا سفیر آجائے تو وہ کس سے ملے گا؟ حضرت ابوبکرؓ نے کہا، اگر میں کام نہ کروں گا تو شام کو بچوں کو کیا کھلاؤں گا؟ حضرت عمرؓ نے کہا، میں اس کا حل نکالتا ہوں۔

چنانچہ حضرت عمرؓ نے بڑے بڑے صحابہؓ کو اکٹھا کیا اور ان سے مشورہ کیا کہ اگر خلیفۃ المسلمین محنت و مزدوری کا کام کریں گے تو حکومت کے کام کون کرے گا اور اگر آپؓ حکومتی کاموں کے لیے یہاں بیٹھ جاتے ہیں تو وہ شام کو کھانا کہاں سے کھائیں گے؟ اس کا کوئی بندوبست ہونا چاہیے۔ صحابہ کرام میں سے حضرت علیؓ نے مشورہ دیا کہ یہ جب ہمارا کام کریں گے، امت کا کام کریں گے، تو ہم امت کے خزانے بیت المال میں سے انہیں تنخواہ دے دیا کریں گے۔ اس کو ملازمت کہتے ہیں، اس سے حکمران کی تنخواہ طے ہو گئی۔

انبیاءؑ بھی مزدوری کرتے رہے ہیں، خلفاء بھی مزدوری کرتے رہے ہیں۔ اور ہندوستان کے مغل بادشاہوں میں بڑے بادشاہ اورنگزیب گزرے ہیں، پچاس سال انہوں نے حکومت کی ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، برما، افغانستان، اور چین کا مغربی حصہ ان کے زیر نگیں تھا۔ اور موبائل فون کے بغیر اس سارے علاقے پر اورنگزیب نے حکومت کی ہے کہ جہاں اطلاع ملے وہاں خود جانا پڑتا تھا۔ اگرچہ شاہی خزانہ تھا، مغلوں کے پاس بہت بڑی دولت تھی، لیکن اورنگزیب خود دو کام کرتے تھے:

1. ایک قرآن پاک لکھتے تھے اور اس کا معاوضہ لیتے تھے۔ میں نے اورنگزیب عالمگیر کے ہاتھ کا لکھا ہوا قرآن کریم کا نسخہ لندن کے میوزیم میں دیکھا ہے، بڑا خوبصورت لکھتے تھے۔
2. اور دوسرا کام یہ کرتے کہ ٹوپیاں بناتے تھے اور بیچتے تھے۔

میں نے یہ بتایا کہ مزدوری کوئی حقارت کا کام نہیں ہے، یہ نبیوں، بادشاہوں اور خلفاء کا کام ہے۔

محنت کش کے حقوق

تیسری بات یہ کہ مزدور کا حق کیا ہے؟ مزدور کا پہلا حق یہ ہے کہ اس کے ساتھ جو کچھ طے کیا ہے اس کو بروقت دیا جائے، بلاوجہ ٹال مٹول کرنا اس پر ظلم ہے۔ جبکہ پیسے لے کر کام پورا نہ کرنا یہ اس کی طرف سے ظلم ہے۔ حضورؐ کا ارشاد ہے "اعطوا الاجیر اجرہ قبل ان یجف عرقہ" مزدور کو اس کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے دو، اس کو پھیرے نہ لگواؤ۔

آپؐ نے ہدایت دی کہ مزدور سے کام لو لیکن اس پر سختی، ظلم اور زیادتی نہ کرو۔ اس زمانے میں مزدور زیادہ تر غلام ہوتے تھے۔ جبکہ مزدور بھی ماتحت سمجھے جاتے ہیں "تحت ایدیکم"۔ حضرت ابو مسعود انصاریؓ کہتے ہیں، ایک دفعہ میری ایک لونڈی بکریاں چرا رہی تھی کہ کچھ دیر وہ بے پرواہ ہو گئی، اس کی بے پرواہی سے بھیڑیا آیا اور ایک بکری لے گیا۔ میں دیکھ رہا تھا، میں لونڈی کے پاس گیا اور غصے میں اسے زور سے تھپڑ مارا اور کہا بے پرواہ بیٹھی ہوئی ہو، بھیڑیا بکری لے گیا ہے۔ جب زور سے تھپڑ مارا تو پیچھے سے آواز

آئی، ابو مسعود! اس کو تھپڑ مارنے سے پہلے یہ سوچ لو کہ تم سے طاقتور بھی کوئی ہے جو تمہیں دیکھ رہا ہے۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو یہ کہنے والے رسول اللہؐ تھے۔ نیچے والے پر ظلم کرتے ہوئے یہ بھی سوچنا چاہیے کہ میرے اوپر بھی کوئی ہے۔ ذرا غور کریں کہ انہوں نے تھپڑ کس کو مارا تھا؟ نوکرانی کو۔ اور بے قصور بھی نہیں مارا بلکہ غلطی کرنے پر مارا تھا، پھر بھی حضورؐ ناراض ہوئے کہ کیوں مارا ہے۔ حضورؐ نے جب ڈانٹا تو ابو مسعودؓ نے عرض کیا، یارسول اللہ! میں آپ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے اپنی اس غلطی کے کفارے میں اس لونڈی کو آزاد کیا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا، اگر تم اس کو آزاد نہ کرتے تو "للفحتک النار" آگ تمہیں اپنی لپیٹ میں لے لیتی۔ اس تھپڑ کا صلہ یہی تھا کہ تم اسے آزاد کر دو۔ ایک تھپڑ جو کہ جرم کرنے پر مارا، اس پر یہ وعید فرمائی، ہمارے ہاں ماتحتوں کے ساتھ نہ معلوم کیا کیا ہوتا ہے۔

حضرت ابوذر غفاریؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا معمول یہ تھا کہ جیسے کپڑے خود پہنتے تھے ویسے ہی نوکروں کو پہناتے تھے۔ ایک دن ایک آدمی نے حضرت ابوذر غفاریؓ سے کہا آپ نے جو اتنا قیمتی لباس پہنا ہوا ہے ویسا ہی اپنے غلام اور نوکر کو پہنا رکھا ہے، اس کو کوئی ہلکی پھلکی چادر کافی تھی۔ فرمایا، نہیں بھئی! میں نے رسول اللہؐ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ یہ تمہارے ماتحت ہیں "اطعموھم مما تطعمون والبسوھم مما تلبسون" جو خود کھاتے ہو ان کو بھی وہی کھلاؤ، جو خود پہنتے ہو ان کو بھی وہی پہناؤ اور ان کی طاقت سے زیادہ ان پر کام نہ ڈالو، جتنا کر سکتے ہیں ان سے اتنا کام لو، اور اگر زیادہ کام اس کے ذمہ لگا دیا ہے اور تمہیں اندازہ ہے کہ یہ اکیلے نہیں کر سکے گا تو "اعینوھم" اس کے ساتھ مل کر کام کرو۔

یہ میں نے چند اصول بتائے ہیں جن کا خلاصہ یہ کہ مزدوری انبیاءؑ کا کام ہے، کوئی حقیر پیشہ نہیں ہے، عزت والا پیشہ ہے۔ مزدور کے ساتھ جو کچھ طے ہو اس کو ٹال مٹول کیے بغیر دیا جائے، ان پر ظلم نہ کیا جائے، ان کو کھانے، پینے، پہننے میں شریک کیا جائے، اور اگر کام ان کی صلاحیت سے زیادہ ہو تو ان کے ساتھ مل کر کام کیا جائے، کام میں ان کی معاونت کی جائے۔

(فروری ۲۰۱۸ء کے دوران الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، گوجرانوالہ میں گفتگو)

تجارتی اور کاروباری معاملات

تجارت وہ ناگزیر ضرورت ہے جس کے بغیر انسانی معاشرے کا نظام نہیں چل سکتا، اللہ تعالیٰ نے تجارت کو انسانوں کی معاشی ضروریات پوری کرنے کا ایک ذریعہ بنایا ہے۔ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کے فرمان کے مطابق زراعت، تجارت، ملازمت، اور مالِ غنیمت کمائی کے وہ حلال اور جائز طریقے ہیں جن کے ذریعے انسان اپنی ضروریات زندگی مہیا کر سکتا ہے۔ جناب رسول اللہؐ نے تجارت کو کمائی کے بہترین ذرائع میں ارشاد فرمایا ہے، بہت سی روایات ہیں جن میں نبی کریمؐ نے تجارت کی فضیلت و اہمیت ذکر فرمائی ہے، درجات بیان فرمائے ہیں اور تجارت کے متعلق احکامات ارشاد فرمائے ہیں۔ احادیث میں کتاب البیوع کے عنوان سے مستقل کتابیں ہیں اور تجارت و کاروبار کے حوالے سے جناب رسول اللہؐ کی تعلیمات واضح ہیں۔

نبی اکرمؐ بطور ایک تاجر

جناب نبی کریمؐ نے خود بھی نبوت سے پہلے تجارت کو بطور پیشہ اختیار کیا اور اس پر بہت سی روایات ہیں کہ آپؐ لین دین کیسے کرتے تھے اور کاروباری معاملات کیسے طے فرماتے تھے۔ جناب رسول اللہؐ کی بعثت سے پہلے ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ حضورؐ کی شادی کا سبب بھی تجارت ہی تھا۔ حضرت خدیجہؓ قریش کی ایک باعزت تاجر خاتون تھیں اور ان کا تجارتی قافلہ شام کے علاقے میں جایا کرتا تھا۔ وہ خود تو تجارت کے لیے نہیں جاتی تھیں لیکن ان کے نمائندے اور کارندے جاتے تھے۔ تجارت کے سارے عمل کا انحصار صرف نمائندوں پر ہو تو معاملہ اتنا قابلِ بھروسہ نہیں رہتا اس لیے حضرت خدیجہؓ کو تلاش ہوتی تھی کہ کوئی دیانتدار اور قابلِ اعتماد آدمی ان کی تجارت کو سنبھالے۔ جناب نبی کریمؐ کے بارے میں مکہ مکرمہ میں یہ مشہور تھا کہ آپ امین ہیں، صادق ہیں، سچے ہیں، دیانت دار ہیں، بااخلاق اور قابلِ اعتماد ہیں۔ چنانچہ حضرت خدیجہؓ نے یہ دیکھنے کے لیے کہ جو کچھ انہوں نے حضورؐ کے متعلق سن رکھا ہے یہ کہاں تک ٹھیک ہے۔ انہوں نے رسول اللہؐ کو پیغام بھیجا اور پیشکش کی کہ آپ ایک سال میرے تجارتی قافلے کی سربراہی کریں۔ اس پر حضورؐ حضرت خدیجہؓ کا تجارتی قافلہ لے کر شام گئے اور پھر واپس آئے، یہ تجارتی سفر حضرت خدیجہؓ کے حضورؐ پر اعتماد کا باعث بنا اور پھر حضورؐ کے ساتھ حضرت خدیجہؓ کے رشتے کا سبب بھی بنا، یوں آنحضرتؐ کی حضرت خدیجہؓ کے ساتھ نکاح ہو گیا۔ یہ شادی اتنی بابرکت ثابت ہوئی کہ حضورؐ کی بعثت اور نبوت کے اعلان کے بعد حضرت خدیجہؓ کا سارا مال حضورؐ پر ہی خرچ ہوا۔

سچے اور دیانت دار تاجر کا رتبہ

جناب رسول اللہؐ نے تجارت کے حوالے سے مختلف مسائل بیان فرمائے اور آداب بھی۔ اس بارے میں آپؐ کی ایک جامع حدیث روایت ہوئی ہے "التجار الصدوق الامین مع النبیین والصدیقین

والشھداء والصالحین "کہ سچا اور دیانت دار تاجر (جنت میں) نبیوں، صدیقین، شہداء اور صالح لوگوں کے ساتھ ہوگا۔

محدثین فرماتے ہیں کہ اس ارشاد میں حضورؐ نے دونوں باتوں کا احاطہ کیا ہے۔ پہلی یہ کہ گفتگو میں سچا ہو، دوسرا یہ کہ مال کے معاملے میں دیانتدار ہو۔ یعنی بات طے کرتے وقت جھوٹ نہ بولتا ہو اور فروخت کے وقت مال میں گڑبڑ نہ کرتا ہو۔ یہی دو باتیں تجارت کی بنیاد ہیں کہ بات سچی ہونی چاہیے اور مال خالص ہونا چاہیے، لیکن بطور تاجر ان دونوں باتوں پر عمل آسان کام نہیں ہے۔ ایک تاجر کے لیے اس رتبے کا حصول ناممکن تو نہیں ہے لیکن مشکل ضرور ہے۔

گفتگو میں سچائی کے متعلق جناب نبی کریمؐ نے فرمایا کہ وہ آدمی جو قسم اٹھا کر مال بیچتا ہے اس کا مال تو بک جاتا ہے لیکن اس میں برکت نہیں رہتی، یعنی ایسا آدمی جو قسمیں اٹھا کر اپنے مال کے متعلق لوگوں کو یقین دلاتا ہے۔

اسی طرح نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا کہ تین آدمی ہیں جن پر جنت کی خوشبو حرام ہے۔ ایک "المنان" وہ آدمی جو کسی کے ساتھ احسان کر کے جتلائے یعنی کسی کی مشکل میں کام آیا اور اس کے ساتھ نیکی کی لیکن بعد میں کسی موقع پر جتلا بھی دیا کہ میں نے فلاں وقت تمہارے ساتھ یہ نیکی کی تھی۔ قرآن کریم میں ہے کہ جتلانے کے ساتھ نیکی برباد ہو جاتی ہے۔ فرمایا ایسا شخص جنت کی خوشبو نہیں سونگھے گا۔ دوسرے آدمی کے متعلق فرمایا "مد من الخمر شراب" پر دوام کرنے والا، یعنی شراب کا عادی شخص جنت کی خوشبو نہیں سونگھے گا۔ تیسرے آدمی کے متعلق فرمایا "المنفق سلعته بالحلف الکاذب" جھوٹی قسم اٹھا کر سودا بیچنے والا۔ یعنی ایسا شخص بھی جنگ کی خوشبو نہیں سونگھ پائے گا جو جھوٹی قسم کے ذریعے اپنے گاہکوں کو اعتماد دلا کر خراب مال بیچتا ہو۔

مروّجہ نظامِ تجارت اور اسلامی نظامِ تجارت میں فرق

جناب نبی کریمؐ نے تجارت میں حصہ لیا ہے، تجارت کی تلقین کی ہے، تجارت کے مسائل و احکام بیان کیے ہیں اور تجارت کے متعلق ایک مستقل نظام دیا ہے جس پر اسلام میں تجارت کی بنیاد ہے۔ اسلام کے نظامِ تجارت میں اور آج کے مروجہ نظامِ تجارت میں ایک بنیادی فرق ہے جو ہمیں ذہن میں رکھنا چاہیے:

- دنیا کا جو مروجہ سسٹم ہے اس میں جائز اور ناجائز کی بنیاد مارکیٹ کی طلب پر ہے کہ جو چیز مارکیٹ کی ضرورت بن جائے وہ جائز ہو جاتی ہے، اور جو چیز مارکیٹ کے لیے فضول ہو جائے وہ ناجائز ہو جاتی ہے۔ یعنی جائز اور ناجائز کا مدار مارکیٹ کی ڈیمانڈ پر ہے۔ سوسائٹی شراب مانگتی ہے تو شراب

دے دو، سوسائٹی زنا کے کاروبار کا تقاضا کرتی ہے تو اس کی اجازت دے دو، سوسائٹی جوے کے اڈے مانگتی ہے تو اس کی یہ ڈیمانڈ پوری کر دو، سوسائٹی نشہ آور ادویات مانگتی ہے تو وہ دے دو۔ جیسا کہ آج کل کچھ مغربی ممالک میں یہ صورتحال عام ہے جس کے نتیجے میں ادویات کی شکل میں نشہ آور اشیاء کو لوگوں کے لیے جائز قرار دیا جا رہا ہے۔ یعنی بنیادی اصول یہ ہے کہ مارکیٹ میں جس چیز کی کھپت ہے اس کی سہولیت مہیا کر دو۔

- لیکن اسلام میں جائز و ناجائز اور حرام و حلال کا فیصلہ آسمانی تعلیمات کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اسلام تجارت کے انہی اصولوں کو جائز قرار دیتا ہے جو انسانی اخلاقیات، انسان کی حقیقی ضروریات اور انسانی معاشرے کے دنیوی اور اخروی نفع کے لیے بہتر ہیں۔ جناب نبی کریمؐ نے فرمایا کہ ایک آدمی سے قیامت کے دن مال کے حوالے سے دو چیزوں کے متعلق سوال ہوگا "من این اکتسب وفیما أنفق" مال کمایا کہاں سے تھا اور خرچ کہاں پر کیا؟ کمائی کے ذرائع جائز تھے یا ناجائز؟ اور جن چیزوں پر خرچ کیا وہ جائز تھیں یا ناجائز؟ اِن دو باتوں میں سارا معاملہ آجاتا ہے۔ کمائی کے ذرائع اور مصرف کے مقامات دونوں جائز ہوں گے تب بات بنے گی ورنہ آدمی گناہ گار ٹھہرے گا۔ اسلام نے کمائی کے ذرائع بھی محدود کیے ہیں کہ فلاں ذریعۂ آمدن جائز ہے اور فلاں ناجائز ہے۔ اور خرچ کرنے کے معاملے میں بھی انسان کو کھلی چھٹی نہیں دی گئی کہ جہاں چاہو خرچ کر لو بلکہ مصرف کے مقامات کے متعلق بھی واضح کیا گیا ہے کہ فلاں جگہ خرچ کرنے کے لیے جائز ہے اور فلاں ناجائز۔ اور یہی اسلامی معیشت و تجارت کا بنیادی دائرہ ہے۔

تجارت اور کاروبار کے شرعی تقاضے

جناب رسول اللہؐ نے تجارت کی ہر ایسی قسم کی مذمت فرمائی ہے جس میں دھوکہ اور فریب ہو، جس میں جھوٹ اور بد دیانتی ہو، یا جس میں عام لوگوں کو پریشانی اور نقصان ہو۔ حضورؐ نے ایسی صورتوں کو "غش" یعنی دھوکے سے تعبیر کیا اور انہیں ممنوع قرار دیا۔

دھوکے سے خراب مال بیچنا

ایک روایت میں آتا ہے کہ جناب نبی کریمؐ ایک مرتبہ بازار میں تشریف لے جا رہے تھے دیکھا کہ ایک صاحب غلہ بیچ رہے تھے، گندم یا جَو کا ڈھیر تھا۔ حضورؐ گزرتے ہوئے اس کے پاس رکے اور معائنہ کی غرض سے غلے کے ڈھیر کے اندر ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ وہ غلہ اوپر سے خشک تھا لیکن اندر سے گیلا تھا۔ آپؐ نے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ بیچنے والے نے کہا یا رسول اللہ بارش ہوگئی تھی۔ آپؐ نے فرمایا کیا بارش غلے

کے اندر ہوگئی تھی؟ اس موقع پر آپؐ نے فرمایا "من غشنا فلیس منا" جس نے ہمیں تجارت میں دھوکہ دیا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ خراب مال چھپا کر صحیح مال کے ساتھ بیچنا بھی دھوکے کی ایک قسم ہے۔ تو جناب نبی کریمؐ نے فرمایا کہ تاجر جنت میں نبیوں کا ساتھی ہوگا لیکن اس کی شرط یہ ہے کہ وہ گفتگو میں سچا ہو اور مال میں دیانتدار ہو۔

جھوٹی بولی دینا

ایک روایت میں نبی کریمؐ نے فرمایا "لا تناجشوا" کہ نجش مت کرو۔ نجش یہ ہے کہ خریدنے کے ارادے کے بغیر صرف مال کی قیمت بڑھانے کے لیے بولی دینا۔ مثلاً کسی چیز کی نیلامی ہو رہی ہے جس کے لیے لوگ اپنی اپنی بولی دے رہے ہیں، ان میں سے ایک آدمی خریدنا تو نہیں چاہتا لیکن صرف بھاؤ میں گڑبڑ کرنے کے لیے بولی دے رہا ہے۔ آپؐ نے اسے حرام اور جھوٹ قرار دیا۔

تجارتی مال پر اجارہ داری

جناب رسول اللہؐ نے "تلقی" سے منع فرمایا۔ اس زمانے کے عرف میں جو تجارت کے اندر خرابی کی باتیں ہوتی تھیں حضورؐ نے ان کی نشاندہی کی۔ تلقی کیا ہے؟ اس دور میں بھی تجارت کی منڈیاں لگتی تھیں جس میں باہر سے قافلے آتے تھے اور سامان کی خرید و فروخت کرتے تھے۔ آج کا زمانہ تو ترقی یافتہ ہے، سڑکیں ہیں، ریل گاڑیاں اور جہاز ہیں جن کی وجہ سے سامان کی آمد و رفت اور خرید و فروخت بہت جلد ہو جاتی ہے۔ اس زمانے میں منڈیاں تو ایسے ہی لگتی تھیں لیکن آمد و رفت کا سلسلہ بہت سست رفتار ہوتا تھا، مہینوں بعد دور دراز سے قافلے آتے تھے جن سے مقامی خریدار سامان خرید لیتے تھے، اس کے بعد پھر اگلے قافلے کا انتظار ہوتا تھا۔ اسی طرح مقامی لوگ بھی تجارتی قافلے لے کر دوسرے علاقوں میں جایا کرتے تھے۔ سال میں چند قافلے آتے تھے جن پر سارے سال کے گزر اوقات کا دارومدار ہوتا تھا۔

ہوتا یوں تھا کہ جب بیرونی قافلے آتے تو مقامی علاقے کے بڑے تاجر قافلے کے پہنچنے سے پہلے ہی راستے میں جا کر انہیں روک لیتے تھے اور ان سے سارا سامان خرید کر انہیں رخصت کر دیتے تھے۔ یعنی انہیں شہر میں داخل ہونے ہی نہیں دیتے تھے اور چند میل کے فاصلے پر جا کر قافلے والوں سے سارا سامان خرید لیتے تھے اور انہیں واپس بھیج دیتے تھے۔ اب یہ سارا سامان چند بڑے تاجروں کے پاس ہوتا تھا جسے وہ اپنی مرضی کے وقت پر اور اپنی مرضی کی قیمت پر بیچتے تھے۔ اس زمانے میں یہ صورت مقامی لوگوں کے لیے سخت نقصان دہ ہوتی تھی۔ "نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم ان تلقى الركبان" جناب رسول اللہؐ نے تاجروں کو اس طرح منڈی میں پہنچنے سے پہلے قافلوں سے سامان خریدنے سے منع

فرما دیا۔ یعنی آپؐ نے فرمایا کہ مال کو منڈی میں آنے دو، منڈی میں مقابلے پر جو ریٹ لگے گا اس کے مطابق لوگ اسے خریدیں گے۔ ایک آدمی یا چند آدمیوں کا سارے سامان پر اجارہ داری بنا لینا اور پھر اسے اپنی مرضی کے بھاؤ پر بیچنا عام خریداروں کے لیے نقصان دہ ہے۔ اس لیے کہ جب منڈی میں مال آتا ہے تو زیادہ خریدار ہوتے ہیں اور مال کا بھاؤ کھلے ماحول میں طے ہوتا ہے۔

جمعہ کے اوقات میں تجارت

جناب رسول اکرمؐ ایک دفعہ جمعہ کا خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ اچانک کسی نے باہر سے آکر آواز لگائی کہ تجارت کا قافلہ آگیا ہے۔ اب ہر ایک کو فکر لاحق ہوئی کہ اگر دیر ہوگئی تو قافلے کا سارا سامان شام تک بک جائے گا اور میرے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا، پھر اگلے قافلے کا انتظار کرنا پڑے گا جو کہ ایک صبر آزما کام ہوگا۔ لوگوں کو یہ خدشہ تھا کہ یہ قافلہ اگر نکل گیا تو اگلا قافلہ دو چار مہینے کے بعد آئے گا اور یوں انہیں مقامی لوگوں سے مال خریدنا پڑے گا جو مہنگا دیں گے، یا معلوم نہیں مال کی مطلوبہ مقدار بھی ان سے ملتی ہے یا نہیں۔ انسانی فطرت ہے کہ انسان اپنا مفاد دیکھتا ہے۔ چنانچہ ایک ایک کر کے لوگ اٹھنا شروع ہوگئے، روایت میں آتا ہے کہ مجمع میں گیارہ آدمی رہ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس کے بارے میں تنبیہ فرمائی "واذا راَو تجارتًا او لھون انفضوا الیھا وترکوک قائما قل ما عند اللہ خیر من اللھو ومن التجارۃ واللہ خیر الرازقین" (الجمعہ ۱۱) اور جب لوگ تجارت یا تماشہ دیکھتے ہیں تو اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں اور آپ کو کھڑا ہوا چھوڑ جاتے ہیں، کہہ دو جو اللہ کے پاس ہے وہ تماشے اور تجارت سے کہیں بہتر ہے اور اللہ بہتر روزی دینے والا ہے۔ فرمایا، پہلے اطمینان سے نماز پڑھو اور پھر نماز کے بعد تجارت کرو۔ ویسے بھی جمعے کی اذان سے لے کر نماز کے اختتام تک تجارت کے لیے ممنوع وقت ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا "یا ایھا الذین اٰمنوا اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعۃ فاسعوا الیٰ ذکر اللہ وذروا البیع ذٰلکم خیر لکم ان کنتم تعلمون" (الجمعہ ۹) اے ایمان والو جب جمعہ کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے تو ذکرِ الٰہی (خطبہ و نماز) کی طرف لپکو اور خرید و فروخت چھوڑ دو، تمہارے لیے یہی بات بہتر ہے اگر تم سمجھو۔

اسی سے ملتا جلتا ایک اور واقعہ ذہن میں آگیا کہ حضرت امام مالکؒ کے ایک شاگرد تھے امام یحییٰ بن یحییٰ اندلسیؒ جن کی روایت سے موطا امام مالک ہمارے ہاں پڑھائی جاتی ہے۔ ایک دفعہ حضرت امام مالکؒ پڑھا رہے تھے اور سینکڑوں شاگرد سامنے بیٹھے ہوئے تھے، ان میں یحییٰ بن یحییٰ بھی تھے جو اندلس سے پڑھنے کے لیے آئے ہوئے تھے۔ کسی نے آواز لگا دی کہ مدینہ میں ہاتھی آگیا ہے۔ ہاتھی عرب کا جانور نہیں ہے اور انجانی چیز دیکھنے کا ہر آدمی کو شوق ہوتا ہے۔ ان لوگوں نے کبھی ہاتھی نہیں دیکھا تھا، شاگرد وہاں سے کھسکنا شروع ہوگئے کہ جا کر دیکھتے ہیں کہ ہاتھی کیسا ہوتا ہے، امام صاحبؒ تو یہیں ہوتے ہیں پھر پڑھ لیں

گے لیکن ہاتھی پتہ نہیں شام تک رہتا ہے یا نہیں۔ تھوڑی دیر میں سارا مجمع غائب تھا اور صرف یحییٰ بن یحییٰ بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت امام مالکؒ نے پوچھا کہ یہ کیا ہوا؟ انہیں بتایا گیا کہ سب لوگ ہاتھی دیکھنے چلے گئے ہیں۔ یحییٰ سے پوچھا کہ بھئی تم کیوں نہیں گئے؟ انہوں نے کہا استاد محترم! میں اندلس سے ہاتھی دیکھنے نہیں آیا آپ سے حدیث پڑھنے کے لیے آیا ہوں۔ میں اتنی دور سے سفر کر کے آپ سے علم حاصل کرنے آیا ہوں جنہیں ہاتھی دیکھنا ہے جا کر دیکھیں۔ امام مالکؒ کے شاگردوں کی تعداد ہزاروں ہوگی لیکن اللہ تعالیٰ نے یحییٰ بن یحییٰ کو یہ اعزاز بخشا کہ آج ہمارے ہاں جو موطا امام مالک پڑھی جاتی ہے وہ اسی شاگرد کی روایت کی ہوئی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے لیے صلہ تھا۔

ذخیرہ اندوزی

اسی طرح ذخیرہ اندوزی سے جناب نبی کریمؐ نے منع فرمایا۔ اس زمانے میں بھی یہ ہوتا تھا اور آج بھی ہوتا ہے کہ بڑے تاجر بہت زیادہ مال خرید کر ذخیرہ کر لیتے ہیں جس کی وجہ سے منڈی میں مال کی کمی واقع ہوتی ہے اور اس کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔ پھر حسبِ موقع یہ تاجر اس ذخیرہ کیے ہوئے مال کو مہنگے داموں بیچتے ہیں۔ فقہاء نے اس کی درجہ بندی کی ہے کہ اگر کسی چیز کے ذخیرہ کرنے سے مارکیٹ میں عام لوگوں کو نقصان ہوتا ہو کہ لوگوں کو مال ہی میسر نہیں آتا یا عام بھاؤ سے زیادہ قیمت میں خریدنا پڑتا ہے تو ایسا ذخیرہ کرنا حرام ہے۔ مثلاً کسی تاجر نے ضرورت کی کوئی چیز خرید کر ذخیرہ کر لی جس کی وجہ سے منڈی سے وہ چیز عدم دستیاب ہوگئی تو ایسا کرنا تاجر کے لیے حرام ہے۔ لیکن اگر تاجر کے بہت زیادہ مال خرید کر ذخیرہ کرنے سے منڈی میں مال کی سپلائی میں فرق نہیں پڑا اور لوگوں کو دوسرے ذرائع سے وہ چیز میسر ہے، لیکن تاجر کی نیت یہ ہے کہ جب مال کی قیمت بڑھے گی تو میں اپنا مال منڈی میں لاؤں گا تو ایسا کرنا کراہت کے درجے میں ہوگا۔ اگر تاجر کی ذخیرہ اندوزی کی وجہ سے منڈی میں مال کی سپلائی بند ہو جاتی ہے یا مال مہنگا ہو جاتا ہے تو پھر یہ حرام اور کبیرہ گناہ کا مرتکب ہے۔

سودی کاروبار

تجارت کے حوالے سے ایک بہت اہم مسئلہ سود کا ہے جس کے بارے میں قرآن کریم میں ذکر ہے۔ تجارت کہتے ہیں ایک جنس سے دوسری جنس کے تبادلے کو۔ یعنی ایک چیز میرے پاس ہے اور دوسری چیز آپ کے پاس ہے، ہم اپنی اپنی ضرورت کے مطابق جب ان چیزوں کا آپس میں تبادلہ کریں گے تو اس میں مجھے بھی نفع ہو سکتا ہے اور آپ کو بھی۔ ایک جنس کا دوسری جنس سے تبادلہ تجارت کہلاتا ہے، لیکن ایک جنس کا اسی جنس سے تبادلہ کمی بیشی کی صورت میں سود کہلاتا ہے۔ جاہلیت کے دور میں دونوں باتیں

چلتی تھیں۔ تجارت بھی ہوتی تھی کہ گندم کا کھجوروں سے تبادلہ، سونے کا چاندی سے تبادلہ، غلے کا کپڑے سے تبادلہ وغیرہ۔ اس طرح سود بھی چلتا تھا کہ روپے کا روپے سے تبادلہ اور اس میں کمی بیشی وغیرہ۔ اسلام نے سود کو حرام قرار دیا اور سختی کے ساتھ اس سے منع فرمادیا۔ قرآن کریم نے جب سود کو حرام قرار دیا تو مشرکین نے اس پر اعتراض کیا "قالوا انما البیع مثل الربٰوا" (البقرہ ۲۷۵) انہوں نے کہا تھا کہ تجارت بھی تو سود کے جیسی ہی ہے۔ مشرکینِ مکہ کا کہنا تھا کہ اِس میں اور اُس میں کیا فرق ہے، یہ بھی تجارت ہے اور وہ بھی تجارت ہے۔ آج بھی یہ بات کہی جاتی ہے کہ سود بھی تجارت ہی ہے۔ اس دور میں بھی یہی بات کہی گئی کہ ایک جنس کے ساتھ دوسری جنس کے تبادلے میں بھی نفع ہے، اور ایک جنس کے ساتھ اسی جنس کے تبادلے میں بھی نفع ہے۔ لیکن قرآن کریم نے صاف بتایا کہ تجارت اور سود متضاد چیزیں ہیں۔ "احل اللہ البیع و حرم الربٰوا" (البقرہ ۲۷۵) اللہ نے تجارت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام۔

یعنی قرآن کریم نے اس اعتراض کا ذکر کیا اور پھر وہی بات کہی کہ اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال قرار دیا ہے جبکہ سود کو حرام قرار دیا ہے۔ آج ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ کسی مجبور کو پیسے دینا اور اس سے اصل رقم سے زائد وصول کرنا قرض کی ایک صورت ہے جس کا تجارت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے جبکہ قرآن کریم نے سود کو تجارت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اس بارے میں جناب نبی کریمؐ کے ساتھ پیش آنے والے دو واقعات کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ مسلم شریف میں بھی اس کا ذکر ہے اور ابوداؤد میں بھی۔

جناب رسول اللہؐ کے گھر کے لین دین کے معاملات کے ذمہ دار حضرت بلالؓ تھے یعنی گھر کے لیے سودا سلف لینا، کھجوریں، آٹا، اور دیگر گھریلو ضروریات کی خرید و فروخت وغیرہ۔ حضرت بلالؓ نے ایک دفعہ کھجوریں خریدیں اور حضورؐ کی خدمت میں لاکر پیش کیں کہ یارسول اللہؐ میں آپ کے لیے یہ کھجوریں خرید کر لایا ہوں۔ آپؐ نے پوچھا، یہ اتنی اچھی کھجوریں کہاں سے لے آئے ہو؟ حضرت بلالؓ نے بتایا کہ یارسول اللہ! وہ آپ کے حصے میں جو خمس کی عام قسم کی کھجوریں آئی تھیں میں نے وہ زیادہ کھجوریں بازار میں دے کر ان کے بدلے میں اچھی قسم کی تھوڑی کھجوریں لے لیں۔ رسول اللہؐ نے فرمایا "عین الربوا" یہ تو بالکل سود ہے، انہیں واپس کرکے آؤ۔ حضرت بلالؓ نے کہا کہ یارسول اللہ! پھر اچھی کھجوریں لانے کے لیے کیا طریقہ اختیار کروں؟ آپؐ نے فرمایا کہ رقم کے عوض عام قسم کی کھجوریں بیچو اور پھر اس رقم کے عوض اچھی قسم کی کھجوریں خریدو، یعنی درمیان میں تیسری جنس لے آؤ۔

اسی طرح مسلم شریف کی روایت کے مطابق ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ جناب نبی کریمؐ نے خیبر کے علاقہ میں وہاں کی پیداوار سے بیت المال کا حصہ وصول کرنے کے لیے ایک عامل بھیجا جب وہ واپس آیا تو اس کے

پاس ساری کھجوریں اچھی قسم کی تھیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ تو بہت اچھی کھجوریں ہیں۔ پھر پوچھا کیا خیبر میں ساری کھجوریں اسی طرح کی ہوتی ہیں؟ عامل نے بتایا کہ یارسول اللہ نہیں ہر قسم کی کھجوریں ہوتی ہیں۔ حضورؐ نے پوچھا پھر تمہارے پاس یہ سب کھجوریں اچھی قسم کی کیسے آگئیں؟ عامل نے بتایا کہ یارسول اللہ مجھے موصول تو ہر قسم کی کھجوریں ہوئی تھیں لیکن میں نے وہ سب کھجوریں دے کر ان کے عوض اچھی قسم کی کھجوریں لے لیں۔ آپؐ نے فرمایا یہ تو تم نے سود کا کاروبار کیا ہے۔ عامل نے پوچھا یارسول اللہ پھر میں کیا کرتا؟ آپؐ نے فرمایا کہ پیسوں کے عوض وہ کھجوریں بیچتے اور پھر ان پیسوں کے عوض یہ اچھی کھجوریں خریدتے۔

آنحضرتؐ نے جاہلیت کے زمانے میں رائج سود کو، جو کہ بیع کا ایک طریقہ سمجھا جاتا تھا، اسے حرام قرار دے دیا۔ آپؐ نے جوا بھی حرام قرار دیا، لاٹری بھی حرام قرار دی اور سٹہ بھی حرام قرار دے دیا۔ یہ ساری صورتیں وہ ہیں جن میں غیر متوقع اور غیر فطری منافع ملتا ہے، یہ وہ چیزیں ہیں جو انسانی نفسیات کی تخریب کا باعث بنتی ہیں۔

(ستمبر ۲۰۰۷ء کے دوران دارالہدیٰ، سپرنگ فیلڈ، ورجینیا، امریکہ میں خطاب)

تجارت وصنعت اور ابلاغ وتشہیر

جائز اور ناجائز کا مغربی فلسفہ اور اسلامی تعلیمات

تجارت انسانی سوسائٹی کی ایک اہم ضرورت ہے اور اس پر فرد، خاندان اور سوسائٹی کی بہت سی ضرورتوں کا مدار ہے۔ لیکن آج اس حوالے سے ایک بڑا مسئلہ یہ زیر بحث ہے کہ تجارت کی اخلاقیات اور تجارت میں جائز و ناجائز کی حدود مارکیٹ نے از خود طے کرنی ہیں یا اس مسئلہ میں کسی اور کی رہنمائی بھی درکار ہے۔

آج کا عالمی فلسفہ کہتا ہے کہ انسانی سوسائٹی کو باہر سے کسی رہنمائی کی سرے سے کوئی ضرورت نہیں ہے اور وہ اپنی اخلاقیات اور جائز و ناجائز کی حدود طے کرنے میں خود ہی اتھارٹی ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ اس فلسفہ کی رو سے تجارت اور مارکیٹنگ کو بھی یہ حیثیت حاصل ہے کہ وہ اپنی اخلاقیات خود طے کرے اور جائز و ناجائز کی حدود خود متعیّن کرے۔ لیکن اسلام اس فلسفہ کو قبول نہیں کرتا اور آسمانی تعلیمات نے زندگی کے دیگر شعبوں کے ساتھ ساتھ تجارت و معیشت کے شعبے کو بھی وحیٔ الٰہی کا پابند بنانے کی بات کی ہے۔

سابقہ آسمانی مذاہب کے حوالے سے بھی انسانی سوسائٹی میں اس کشمکش کا پتہ چلتا ہے۔ جیسا کہ حضرت

شعیب علیہ السلام کا تذکرہ قرآنِ کریم میں اس طور پر کیا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کو توحید کے ساتھ ساتھ تجارت میں دیانت و امانت اختیار کرنے کی دعوت دی اور کہا کہ ماپ تول میں کمی نہ کرو اور خرید و فروخت کی جانے والی اشیا کا معیار مت خراب کرو، یعنی صحیح چیزیں بیچو اور صحیح وزن کے ساتھ بیچو۔ اس پر ان کی قوم نے کہا:

"اے شعیب! کیا تمہاری نماز تمہیں اس بات کی دعوت پر مجبور کرتی ہے کہ ہم اپنے آباؤ اجداد کے معبودوں کو چھوڑ دیں اور اپنے اموال میں اپنی مرضی کے ساتھ تصرف نہ کر سکیں۔" (ہود ۸۷)

گویا ان کی قوم نے اپنے مالوں میں اپنی مرضی کے ساتھ آزادانہ تصرف کو اپنا حق قرار دیا اور حضرت شعیب علیہ السلام کی طرف سے لگائی جانے والی قدغنوں کو ان کی نماز کے حوالے سے طعن و اعتراض کا نشانہ بنایا۔ میرا خیال ہے کہ ہم بھی آج کم و بیش اسی نوعیت کی صورتحال سے دوچار ہیں۔ جبکہ اسلام نے مال اور اس کے لین دین کو اس قدر آزاد نہیں چھوڑا، اور اموال و اشیا کی تجارت پر مختلف قسم کی قدغنیں عائد کی ہیں، بلکہ سرے سے مال کو انسان کی مطلقاً ملکیت کی حیثیت نہیں دی اور اسے اللہ تعالیٰ کی امانت قرار دے کر دنیا اور آخرت دونوں جگہ اس کی مسئولیت کی بات کی ہے۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ قیامت کے دن کوئی شخص اپنی جگہ سے ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکے گا جب تک کہ وہ چند سوالوں کا جواب نہیں دے چکے گا۔ ان میں سے ایک سوال مال و دولت کے بارے میں ہوگا کہ مال کہاں سے کمایا اور کہاں پر خرچ کیا؟ آمدنی کا ذریعہ اور خرچ کا مصرف دونوں اسے بتانا پڑیں گے۔ اس لیے شریعتِ اسلامیہ کی رو سے انسانی سوسائٹی یا مارکیٹ اپنی حدود، قواعد و ضوابط اور اخلاقیات طے کرنے میں خود ہی واحد اتھارٹی نہیں ہے بلکہ وہ آسمانی تعلیمات کی پابند ہے اور اسے وحیٔ الٰہی یعنی قرآن و سنت کی تعلیمات کے دائرے میں اپنے معاملات سرانجام دینے ہیں۔

تجارت کا مدار سچائی اور دیانت داری پر

جناب رسول اکرمؐ نے تجارت کی بڑی فضیلت بیان کی ہے، خود تجارت کی ہے اور تجارت کے احکام و قوانین کی تفصیل کے ساتھ وضاحت فرمائی ہے۔ ان ساری باتوں کو آنحضرتؐ کے ایک جامع ارشاد میں مختصراً سمو دیا گیا ہے کہ

"سچا اور ایماندار تاجر جنت میں انبیائے کرام، شہداء اور صالحین کا ساتھی ہوگا"۔

تاجر کو جنت میں انبیائے کرامؑ کی رفاقت نصیب ہوگی لیکن اس کے لیے دو شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ

گفتگو میں سچا ہو اور دوسری یہ کہ وہ سودے میں کھرا ہو۔ یہ دو شرطیں بظاہر بڑی سادہ سی ہیں لیکن عملاً سب کچھ ہیں۔ اور اگر ان پر عمل ہو جائے کہ سوداکاری میں جھوٹ کا عنصر شامل نہ ہو اور سودے میں ملاوٹ اور کھوٹ نہ ہو تو سارا نظامِ تجارت ہی سیدھا ہو جاتا ہے۔

تجارت میں دیانت بہت عظمت اور عزیمت کی بات ہے اور مسلمانوں میں تو دیانتدارانہ تجارت اسلام کی دعوت و تبلیغ کا مستقل ذریعہ رہی ہے، لیکن خیانت کی شکایات بھی کسی نہ کسی درجہ میں ہر دور میں رہی ہیں۔ صحابیٔ رسول حضرت حذیفہ بن الیمانؓ کی وفات ۳۵ھ میں ہوئی۔ گویا انہوں نے حضورؐ کے وصال کے بعد ربع صدی کا زمانہ پایا ہے اور وہ اپنے آخری دور میں شکایت کر رہے ہیں کہ تجارت میں امانت و دیانت کا معیار بدل گیا ہے۔ بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق وہ فرماتے ہیں کہ

> ”ہمارے پہلے دور میں تجارت کے عمومی ماحول پر اعتماد ہوتا تھا اور ہم جس سے چاہتے تھے خرید و فروخت کر لیتے تھے، لیکن اب آخری دور میں یہ اعتماد قائم نہیں رہا اور خال خال تاجروں کے بارے میں شہرت ہوتی ہے کہ وہ ایمانداری اور دیانتداری کے ساتھ تجارت کرتے ہیں۔“

بخاری شریف کی اس روایت میں حضرت حذیفہؓ نے ایک دلچسپ بات یہ بھی فرمائی ہے کہ

> ”ہم پہلے دور میں بڑے اعتماد کے ساتھ ہر شخص سے سودے کی خرید و فروخت کر لیتے تھے، اگر وہ مسلمان ہوتا تھا تو اس کا مسلمان ہونا ہی ہمارے اعتماد کے لیے کافی ہوتا تھا، اور اگر غیر مسلم ہوتا تو ہمیں تسلی ہوتی تھی کہ وقت کا حاکم اور نظام اسے بددیانتی سے روک لے گا۔“

دوسرے لفظوں میں مسلمان اور امانت و دیانت لازم و ملزوم سمجھے جاتے تھے اور غیر مسلم ہونے کی صورت میں ہمیں سسٹم اور نظام پر اعتماد ہوتا تھا کہ یہ نظام اور سسٹم کسی غیر مسلم کو بھی بددیانتی کی گنجائش فراہم نہیں کرے گا۔

حضرت حذیفہ بن الیمانؓ کا یہ ارشاد گرامی آج ہمارے لیے لمحۂ فکریہ بلکہ تازیانۂ عبرت ہے، اس لیے کہ آج صورتحال بالکل برعکس ہو گئی ہے۔ آج تجارت میں دیانت و امانت کا اعتماد دوسری قوموں میں منتقل ہو گیا ہے اور بددیانتی اور بے ایمانی مسلمان قوموں کا تعارف بن گئی ہے، جبکہ سسٹم کا اعتماد بھی کرپشن کی دلدل میں گم ہو کر رہ گیا ہے۔ عالمی مارکیٹ اور بین الاقوامی تجارت کو دیکھ لیں کہ ہم مسلمانوں کی ساکھ کیا ہے؟ اور بحیثیت پاکستانی ہماری تجارتی ساکھ دنیا کی منڈیوں میں کیا ہے؟ اس لیے تجارت و مارکیٹ کے

حوالے سے ہمارا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ ہم اپنا وہ اعتماد بحال کریں جو حضرت حذیفہؓ کے ارشاد گرامی میں مذکور ہے اور جو کسی دور میں ہم مسلمانوں کا امتیازی نشان اور اسلام کی دعوت و تبلیغ کا عنوان ہوتا تھا۔

ابلاغ و تشہیر کے مروّجہ طریقے

اب میں مسئلہ کے دوسرے رخ کی طرف آتا ہوں کہ ذرائع ابلاغ اور تشہیر کے حوالے سے ہماری صورتحال کیا ہے اور ہم نے تجارت کے باب میں تشہیر کے لیے کیا کیا حربے اختیار کر رکھے ہیں؟ جہاں تک ابلاغ کی بات ہے، یہ سوسائٹی کی اجتماعی ضرورت ہے لیکن اس کی بھی کچھ حدود و قیود ہیں۔ مثلاً قرآن کریم میں دو پابندیوں کا بطور خاص تذکرہ ہے:

1. ایک یہ کہ کوئی خبر آئے تو اس کی تحقیق کے بعد اسے نشر کرو اور بلا تحقیق کسی خبر کو عام نہ کرو (الحجرات ۶)۔ مگر ہمارے ہاں کیا ہو رہا ہے؟ سنی سنائی باتوں کو ایسے سنسنی خیز انداز میں بلا تحقیق نشر کر دیا جاتا ہے کہ بہت سے مسائل بلاوجہ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ بخاری شریف کی روایت کے مطابق جناب نبی اکرمؐ نے اپنے سفرِ معراج کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے کچھ لوگوں کو دی جانے والی سزاؤں کے مناظر کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے ایک منظر آپؐ نے یوں بیان فرمایا ہے کہ ایک شخص کے منہ میں درانتی ڈال کر اس کی باچھیں گردن تک بار بار چیری جا رہی ہیں، چیرنے والا ایک بار یہ عمل مکمل کرتا ہے تو وہ باچھیں درست ہو جاتی ہیں، پھر وہ انہیں دوبارہ چیر دیتا ہے، پھر وہ صحیح ہوتی ہیں تو دوبارہ انہیں چیر دیا جاتا ہے۔ یہ عمل اس کے ساتھ مسلسل جاری ہے۔ جناب رسول اللہؐ نے فرشتوں سے دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ وہ شخص ہے جو جھوٹ گھڑتا ہے اور اسے دنیا کے کناروں تک پھیلا دیتا ہے۔ خبر گھڑ کر اسے دنیا کے کناروں تک پہنچا دینے کی بات اب سے پون صدی قبل شاید عملاً سمجھ میں نہ آتی ہو مگر آج اسے سمجھنا مشکل نہیں ہے۔ اور میں حدیث کے طلبہ کے سامنے اس کی تشریح یوں کیا کرتا ہوں کہ یہ وہ نیوز ایڈیٹر ہے جو ٹیبل نیوز بناتا ہے اور چینل پر اس کی پٹی چلا دیتا ہے۔ جھوٹی خبر ٹیبل پر بنائی جائے یا محض سنی سنائی بات کو بلا تحقیق نشر کر دیا جائے، ایک ہی بات ہے اور دونوں کے نتائج ایک جیسے ہی نکلتے ہیں۔
2. قرآن کریم نے ابلاغ کے سلسلہ میں دوسری پابندی یہ لگائی ہے کہ جو لوگ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں فاحشہ کی اشاعت کی جائے، ان کے لیے دنیا و آخرت میں دردناک عذاب ہے (النور ۱۹)۔ مسلمان سوسائٹی میں ''فاحشہ'' کے فروغ اور اشاعت کی قرآن کریم نے مذمت کی ہے اور ایسا کرنے والوں کے لیے دردناک عذاب کی خبر دی ہے۔ یہ فاحشہ کیا ہے؟

اس کا آسان سا مفہوم یہ ہے کہ بدکاری اور اس کا ذریعہ بننے والے اسباب و اعمال کی تشہیر جرم قرار دی گئی ہے۔ بدکاری اور زنا کے بارے میں قرآن کریم اور جناب رسول اکرمؐ نے بہت سخت لہجہ اختیار کیا ہے اور صرف بدکاری کو جرم قرار نہیں دیا بلکہ اس کا ذریعہ بننے والے تمام اعمال و حرکات کو بھی، جنہیں شریعت کی اصطلاح میں "دواعی" کہا جاتا ہے، جرم قرار دیا ہے اور اس پر سزا مقرر کی ہے۔ اس لیے ہر وہ تشہیر جو انسان کے اندر سفلی جذبات کو ابھارتی ہے اور انسانی ذہن کو بدکاری کی طرف متوجہ کرتی ہے، فاحشہ شمار ہوتی ہے اور قرآن کریم نے اس کی مذمت فرمائی ہے۔

لیکن ہمارے ہاں تو عورت اور اس کی کم لباسی تشہیر کے فن کا نقطۂ کمال تصور ہوتی ہے۔ ہم ماچس کی ڈبیا فروخت کرنے کے لیے بھی عورت کی تصویر اور اس کی زیب و زینت کو ذریعہ بناتے ہیں۔ عورت کی تصویر اور اس کی زیب و زینت کو اپنے سامان کی فروخت کے لیے بے تحاشا استعمال کر کے ہم یہ تصور دے رہے ہیں کہ عورت کی عزت میں اضافہ ہو رہا ہے اور ہم عورت کو معاشرے میں عزت کا مقام دے رہے ہیں۔ کسی کو اس میں عورت کی عزت دکھائی دیتی ہو تو میں اسے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن میرے خیال میں تو یہ عورت کی تحقیر ہے، اس کی توہین ہے اور اس کی تذلیل ہے اور آج کے دور میں عورت پر روا رکھے جانے والے مظالم میں سے ایک بڑا ظلم ہے۔

مصنوعات کی فروخت کیلئے ترغیبات

اس کے ساتھ ساتھ تجارتی تشہیر کے حوالے سے ایک اور بڑے مسئلہ کی طرف بھی توجہ دلانا چاہوں گا کہ مارکیٹنگ کے لیے غیر ضروری ترغیبات کے ذریعے عام آدمی کے معاشی بوجھ میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے فرمایا ہے کہ انسانی زندگی کے معاشی اعتبار سے تین درجے ہیں:

1. ایک درجہ ضروریات کا ہے،
2. دوسرا سہولیات کا ہے،
3. اور تیسرا درجہ تعیشات کا ہے۔

ضروریات کا دائرہ تو ناگزیر ہے، سہولیات کا بھی جواز ہے، مگر تعیشات کا درجہ مسلم سوسائٹی میں جواز کا درجہ نہیں رکھتا۔ وجہ یہ ہے کہ اس سے سوسائٹی میں معیشت کا توازن بگڑتا ہے اور دیگر بہت سی معاشرتی خرابیاں جنم لیتی ہیں۔ مگر ہمارے ہاں تجارتی تشہیر کا زیادہ حصہ تعیشات کے فروغ اور اس کی طرف

ترغیب دلانے کے لیے مخصوص ہے۔ مقصد صرف اپنی مصنوعات کی فروخت ہے، مگر اس سے عام آدمی کی ضروریات کا مصنوعی دائرہ پھیل رہا ہے، غریب اور متوسط گھرانے کا بجٹ تباہی کا شکار ہو رہا ہے اور ناجائز کمائی کے ذرائع بڑھتے جا رہے ہیں۔ یہ بھی تجارتی تشہیر کے حوالے سے ایک بڑا مسئلہ ہے جسے سنجیدگی کے ساتھ کنٹرول کرنے کی ضرورت ہے۔ اسلام معیارِ زندگی میں اس طرز کی ''ریس'' کی اجازت نہیں دیتا جو تعیشات کا ماحول پیدا کر کے سوسائٹی کو معاشی عدمِ توازن اور معاشرتی عدمِ استحکام کا شکار کر دے۔

(۱۰ جنوری ۲۰۱۲ء کو رفاہ انٹرنیشنل اسلامی یونیورسٹی، راولپنڈی میں خطاب)

وسائل و اسباب، دولت کی گردش، معاشی انصاف

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہا السلام سے انسانی نسل کی تخلیق کی اور نسلِ انسانی کے بتدریج ارتقاء کے ساتھ انسانی معاشرہ قائم ہوا۔ کھانا پینا، چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، میل ملاقات، بیماری وصحت، حقوق و معاملات وغیرہ، انسانی معاشرے کے یہ عوامل شروع ہی سے انسان کے ساتھ چلے آرہے ہیں، اور انسانی زندگی کی ضروریات انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی شروع ہو جاتی ہیں۔ بنیادی ضروریات تو تمام انسانوں کی ایک جیسی ہوتی ہیں تاہم انفرادی ضروریات انسان کے ذوق، قابلیت اور ترجیحات کے لحاظ سے مختلف ہو سکتی ہیں۔

دنیوی زندگی اور وسائل و اسباب

انسان کی ضروریات کیسی بھی ہوں وسائل کے ذریعے سے پوری ہوتی ہیں کیونکہ یہ دنیا وسائل اور اسباب کی دنیا ہے، اسباب اور وسائل کے بغیر اس دنیا میں زندگی بسر کرنا ممکن نہیں ہے اور اللہ تعالیٰ کے ضابطے کے خلاف ہے۔ ایک وقت آئے گا جب انسانی زندگی جنت میں وسائل و اسباب کی محتاج نہیں ہوگی اور وہاں انسان کو اپنی خواہشات وضروریات کو پورا کرنے کے لیے محنت و مشقت کا راستہ اختیار نہیں کرنا پڑے گا۔ لیکن اس دنیا میں بہرحال اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسانی زندگی کو محنت و مشقت اور وسائل و اسباب کے ساتھ وابستہ کیا ہے، یوں نسلِ انسانی کے تمام لوگ کسی نہ کسی درجے میں اسباب اختیار کر کے ہی دنیا میں زندگی بسر کرتے ہیں۔

نسلِ انسانی میں انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات سے زیادہ متوکّل اور ان سے زیادہ دنیا سے بے رغبتی رکھنے والا کوئی دوسرا طبقہ نہیں ہے لیکن حضرات انبیاء کرامؑ نے بھی زندگی کے وسائل و اسباب اختیار

کیے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی کے مختلف مراحل میں حسبِ ضرورت محنت مزدوری بھی کی، بکریاں بھی چرائیں اور تجارت بھی کی۔ آپؐ نے ایک مرتبہ خود فرمایا کہ میں نے فلاں قبیلے کی بکریاں اتنی اجرت پر چرائی تھیں، فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے عام طور پر انبیاء کرام سے بکریاں چرانے کا کام لیا ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم الصلواۃ والتسلیمات سے بکریاں چرانے کا کام اس لیے لیا کہ بکریوں کو سنبھالنا مشکل ہوتا ہے، بھیڑوں کو قابو کرنا آسان ہوتا ہے کہ ایک بھیڑ دوسری بھیڑ کے پیچھے چلتی ہے لیکن ایک بکری دوسری بکری کے پیچھے نہیں چلتی۔ حضرت موسیٰؑ کے بکریاں چرانے کا قرآن کریم میں ذکر ہے کہ ان کا باقاعدہ آٹھ یا دس سال کا معاہدہ تھا جس کے تحت انہوں نے حضرت شعیبؑ کی بکریاں چرائیں۔ چنانچہ اسباب و وسائل کا اختیار کرنا اس دنیا میں لازمی ہے۔

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اسباب اختیار کیے اور دوسروں کو بھی اس کی تعلیم دی لیکن آپؐ نے اس سلسلے میں ایک توازن قائم کیا، آپؐ نے اسباب کو ترک کرنے سے بھی منع فرمایا ہے اور اسباب پر مکمل بھروسہ کرنے سے بھی منع فرمایا ہے۔ رسول اللہؐ کے پاس کوئی شخص سوال لے کر آتا تھا تو حضورؐ اس کی حالت کو پرکھتے تھے اگر وہ معذور یا مستحق ہوتا تو آپؐ اس کی مدد فرماتے تھے لیکن اگر صحت مند اور کمانے کے قابل ہوتا تو اس کی رہنمائی فرماتے تھے، آپؐ اسے محنت و مزدوری کی تلقین کرتے اور کمانے کی ترغیب دیتے تھے۔

روایات میں آتا ہے کہ ایک شخص نبی کریمؐ کے پاس آیا اور آپؐ سے عرض کی کہ یا رسول اللہ! محتاج ہوں میری مدد فرمائیے۔ آپؐ نے فرمایا اے اللہ کے بندے! تم تندرست اور صحت مند آدمی ہو، محنت مزدوری کر کے کما سکتے ہو اس لیے جاؤ اور اپنے لیے کماؤ۔ اس نے کہا کہ یا رسول اللہ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ آپؐ نے پوچھا کیا تمہارے پاس گھر میں کچھ بھی نہیں ہے؟ اس نے کہا کہ گھر میں صرف لکڑی کا ایک پیالہ ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ جاؤ اور گھر سے وہ پیالہ لے آؤ، وہ شخص گیا اور جا کر پیالہ لے آیا۔ آپؐ نے پیالہ لے کر مجلس میں اس کی بولی دی اور پوچھا کہ کوئی اس پیالے کی کتنی قیمت دے گا؟ ایک شخص نے کہا کہ میں ایک درہم دیتا ہوں۔ آپؐ نے پوچھا کیا کوئی اس سے زیادہ دیتا ہے؟ ایک شخص نے کہا کہ ڈیڑھ درہم دیتا ہوں۔ آپؐ نے پھر پوچھا کیا کوئی اس سے زیادہ دیتا ہے؟ ایک نے کہا کہ دو درہم دیتا ہوں۔ فرمایا لاؤ، اس طرح آپؐ نے وہ پیالہ نیلام کر کے بیچ دیا۔ اس رقم سے نبی کریمؐ نے کلہاڑی کا پھل خریدا اور اپنے ہاتھ سے لکڑی کا دستہ اس میں ڈالا۔ پھر اس سوال کرنے والے شخص سے فرمایا کہ یہ کلہاڑی لے کر جنگل میں جاؤ، لکڑیاں کاٹو اور لا کر بازار میں بیچو، چند دن بعد آ کر مجھے بتانا کہ کیا صورتحال ہے۔ وہ شخص کلہاڑی لے گیا، چند دن گزرے تو وہ شخص دوبارہ آیا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں حسبِ حکم حاضر ہوں۔ آپؐ نے پوچھا کیا

صورتحال ہے؟ اس نے بتایا کہ یارسول اللہ گھر میں آٹا بھی ہے، کھجوریں بھی ہیں اور کھانے پینے کے برتن بھی ہیں۔ فرمایا یہ حالت بہتر ہے یا پہلے والی حالت بہتر تھی؟

اسباب ترک کرنے سے ممانعت

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسباب ترک کرنے سے منع فرمایا ہے، فرمایا کہ توکّل اسباب ترک کردینے کا نام نہیں ہے کہ انسان اسباب کو بالکل چھوڑ دے۔ ایک دفعہ جناب نبی کریمؐ کی خدمت میں کہیں سے ایک مہمان آیا۔ آپؐ کی عادتِ مبارکہ یہ تھی کہ کوئی باہر سے مہمان آتا تو آپؐ پہلے اس سے کھانے پینے کے متعلق پوچھتے، سواری کے جانور کے متعلق پوچھتے کہ اسے کہاں باندھا ہے اس کی خوراک وغیرہ کا انتظام کیا ہے اور رہنے کا بندوبست کہاں ہے؟ کوئی دور سے آدمی آتا تو آپؐ اس سے ان ضروریات کے متعلق دریافت فرماتے۔ آپؐ نے اس شخص سے پوچھا کیسے آئے ہو؟ اس نے بتایا کہ اونٹ پر آیا ہوں۔ آپؐ نے پوچھا کہ اونٹ کہاں ہے؟ کہنے لگا کہ باہر چھوڑ دیا ہے۔ آپ نے پوچھا باہر کہاں چھوڑ دیا ہے؟ اس نے کہا کہ بس اللہ کے توکّل پر باہر چھوڑ آیا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا، بندۂ خدا! توکّل اس کا نام نہیں ہے، پہلے جاکر اس کی رسی کسی جگہ پر باندھو اور پھر اللہ پر توکّل کرو۔ یعنی اس کی حفاظت کا جتنا بندوبست تمہارے ذمے ہے وہ تم کرو اور اس کے بعد اسے اللہ کے بھروسے پر چھوڑو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تعلیم یہ دی کہ جو تمہارے بس میں ہیں وہ اسباب اختیار کرو اور پھر نتیجہ خدا پر چھوڑ دو۔ اس لیے کہ اسباب کا اختیار کرنا انسان کے بس میں ہے لیکن نتیجہ انسان کے بس میں نہیں ہے، اسباب پر بھروسہ نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسباب کے پیدا کرنے والے پر بھروسہ ہونا چاہیے کہ اے اللہ! جو میرے بس میں تھا میں نے کر دیا ہے اب تو مہربانی فرما۔

گردشِ دولت، نظامِ معیشت کا بنیادی اصول

آج کی دنیا کے مروّجہ معاشی علوم نے فلسفے اور سائنس کے طور پر گزشتہ چند صدیوں میں منظم شکل اختیار کی ہے، لیکن حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپؐ کی تعلیمات کی روشنی میں خلفائے راشدینؓ نے آج سے کم و بیش ڈیڑھ ہزار سال قبل اسلامی نظام حکومت کے تحت معاشی حقوق اور معاشی عدل کا ایک عظیم الشان تصور قائم کر دیا تھا اور پھر اپنی زندگیوں میں اس تصور کے عملی نمونے بھی پیش کر دیے تھے۔ قرآن کریم میں اللہ رب العزت نے تو ایک ہی جملے میں اسلام کے نظام معیشت کا خلاصہ بیان فرما دیا "کی لا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم" (الحشر ۷) تاکہ دولت تمہارے دولتمندوں میں ہی نہ گھومتی رہے۔

اس آیت میں پہلے اللہ تعالیٰ نے ضرورتمندوں کے حقوق بیان کیے، پھر یہ جملہ فرمایا کہ یہ دولت تقسیم کرنے کا نظام ہم نے اس لیے دیا ہے تاکہ دولت صرف دولتمندوں میں ہی نہ گھومتی رہے بلکہ سارے معاشرے میں گردش کرے۔ اسلام کے معاشی نظام کا مقصد ہی یہ ہے کہ دولت معاشرے میں صرف مالداروں کے پاس ہی نہ رکی رہے بلکہ ایک خودکار طریقے پر معاشرے کے تمام طبقات میں تقسیم ہوتی رہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ معاشرے میں دولت کی مثال ایسے ہے جیسے انسانی جسم میں خون، کیونکہ جسم کے ہر حصے کو اپنی ضرورت کے مطابق خون ملتا رہے تو جسم کا نظام ٹھیک چلتا رہتا ہے۔ انگلی کی ضرورت الگ ہے، کان کی ضرورت الگ ہے اور بالوں کی ضرورت الگ ہے، یوں کسی عضو کو کم ضرورت ہے اور کسی کو زیادہ۔ اگر جسم کے کسی حصے میں خون ضرورت سے زیادہ ہو جائے تو وہاں پھوڑے پھنسیاں بن جاتے ہیں، جلد خراب ہو جاتی ہے اور پیپ پیدا ہو جاتی ہے، ضرورت سے زیادہ خون جلد کو فاسد کر دیتا ہے۔ جبکہ ضرورت سے کم خون فالج کا سبب بن جاتا ہے۔ اس لیے خون کا پورے جسم میں ایک تناسب اور توازن کے ساتھ گردش کرنا اچھی صحت کے لیے ضروری ہے۔ یہی اصول قرآن کریم نے بیان فرمایا ہے کہ دولت کا معاشرے میں ایک تناسب کے ساتھ گردش کرنا لازمی ہے، ہر ایک کو اس کا حصہ ملنا ضروری ہے اور دولت کا کسی ایک جگہ بلا ضرورت جمع ہو جانا نظامِ معیشت کی خرابی کا باعث ہے۔

وراثت اور زکوٰۃ، دولت کی گردش کے دو بنیادی ذرائع

چنانچہ دو چیزیں اسلامی نظام میں ایسی ہیں جو دولت کی تقسیم اور گردش کا ذریعہ ہیں:

1. وراثت
2. زکوٰۃ

ایک آدمی ساری زندگی محنت کر کے جو جائیداد بناتا ہے، وہ اس کے فوت ہونے کے بعد اس کی اولاد میں تقسیم کر دی جاتی ہے، اگر اس کی اپنی اولاد نہ ہو تو پھر یہ جائیداد رشتہ داروں میں درجہ بدرجہ تقسیم ہوتی ہے۔ اسی طرح جب اس آدمی کی اولاد کی وفات کا وقت آتا ہے تو ان کی جائیداد آگے ان کی اولاد میں تقسیم ہو جاتی ہے، یوں تقسیم در تقسیم کا یہ سلسلہ معاشرے میں دولت کی گردش کو جاری رکھتا ہے، اور یہی وراثت کا اصل مقصد ہے کہ وراثت کی تقسیم دولت کو ایک جگہ پر منجمد نہیں رہنے دیتی۔

زکوٰۃ بھی دولت کو تقسیم کرتی ہے کہ دولتمند لوگ اپنی دولت کا چالیسواں حصہ ہر سال فقراء، غرباء و مساکین کو دیتے ہیں۔ زکوٰۃ کے ذریعے مجموعی طور پر ایک خطیر رقم معاشرے کے نادار لوگوں تک ہر سال

پہنچتی رہتی ہے۔ زکوٰۃ کے احکام دولت کی جنس کے اعتبار سے مختلف ہیں۔

اسلام نے دولت کی تقسیم ایسے نظم کے تحت کی ہے جس کی بنیاد عدل و انصاف پر ہے، اور جس میں حقوق کا تعیّن مساوات کی بنیاد پر ہے۔

ریاست کی طرف سے وظائف کی تقسیم

تاریخ میں حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت فاروق اعظمؓ کے درمیان ایک دلچسپ اختلاف مذکور ہے، خلافتِ راشدہ کے قیام کے بعد جو پہلا باضابطہ اختلاف ہوا جس میں حضرت ابوبکرؓ اپنے موقف پر قائم رہے اور حضرت عمرؓ اپنے موقف پر قائم رہے۔ حضرت صدیق اکبرؓ جب خلیفہ بنے تو سب سے پہلا مال بحرین سے آیا، حضرت بلالؓ جو مہم پر تھے اور رسول اللہؐ کی وفات سے چند روز بعد واپس آئے، بحرین سے جتنا مال آیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اتنا مال کہیں سے نہیں آیا تھا۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے شوریٰ والوں کو بلایا کہ بھئی مال آیا ہے اور تقسیم کرنا ہے لیکن پہلے ہمیں تقسیم کے اصول طے کرنے ہوں گے کہ کس کو کتنا حصہ ملے، اس پر شوریٰ کے اراکین میں بحث ہوئی۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا موقف

حضرت عمرؓ کی رائے یہ تھی کہ وظائف کی تقسیم میں فضیلت کے درجات کا لحاظ رکھنا چاہیے۔ مثلاً ازواجِ مطہرات کو سب سے زیادہ دیا جائے، پھر مہاجرین کو، پھر انصار کو اور اس کے بعد دوسرے مسلمانوں کو اور اس کے لیے باقاعدہ درجہ بندی کی جائے۔ مگر حضرت صدیق اکبرؓ کی رائے یہ تھی کہ فضیلت کا تعلق آخرت سے ہے، اس کا لحاظ بروز قیامت ہوگا کہ جو زیادہ فضیلت والا ہے وہ جنت میں زیادہ اونچے درجات پر پہنچے گا، جنت کے درجات ثواب کے حساب سے ہوں گے، یعنی فضیلت کا تعلق آخرت میں ثواب اور اجر سے ہے۔ جبکہ یہ دنیا اسباب اور حقوق کی دنیا ہے، اس دنیا کے معاملات حقوق پر ہیں اور حقوق میں سب برابر ہیں، رعیت میں سب یکساں حقوق کے حصے دار ہیں، اس لیے جتنا حصہ مہاجر کو ملنا چاہیے اتنا ہی انصاری کو ملنا چاہیے، وظیفہ سب کے لیے برابر ہونا چاہیے۔ چنانچہ حضرت صدیق اکبرؓ کے اڑھائی سے تین سالہ دورِ خلافت میں یکساں حصے تقسیم کیے گئے، جو حصہ حضرت عائشہؓ کو ملا وہی حضرت بلالؓ کو ملا، جو بدری کو ملا وہی اُحد والے کو ملا۔

یہاں ایک فرق ملحوظ خاطر رکھنا ضروری ہے۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے موقف کا مطلب یہ نہیں تھا کہ جس کے پاس زیادہ ہے اس سے چھین کر سب کو برابر دیا جائے بلکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ جو حقوق ریاست دیتی ہے ان حقوق میں برابری ہو، جو وظیفے بیت المال دیتا ہے اس میں سب کے ساتھ برابری کا معاملہ

ہو، اب جس کو پیسے ملے ہیں اس کی صلاحیت پر منحصر ہے کہ وہ اس رقم کو کیسے استعمال کرتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک باپ نے اپنے دو بیٹوں کو اپنی کمائی میں سے دس دس ہزار روپے دیے، اس نے اولاد کے ساتھ برابری کا حق ادا کر دیا۔ اب یہ عین ممکن ہے کہ اولاد میں سے ہر ایک کی صلاحیتیں اور ذوق دوسرے سے مختلف ہوں، ایک نے رقم جمع کر کے کوئی کاروبار کیا اور اگلے سال تک زیادہ پیسے بنا لیے۔ دوسرے نے اپنی روز مرہ ضروریات اتنی بڑھالیں کہ اسی پر سب پیسے خرچ ہو گئے اور سال کے آخر میں اس کے پاس کچھ بھی نہ بچا۔ حضرت صدیق اکبرؓ کی رائے یہ تھی کہ ریاست سب کے ساتھ برابری کرے، اس میں ترجیحات نہ ہوں۔

حضرت عمر فاروقؓ کا موقف

حضرت عمر فاروقؓ خود مجتہد اور صاحبِ علم آدمی تھے، حضرت عمرؓ کی رائے یہ تھی کہ صحابہ کرامؓ میں جو فضیلت کے درجات ہیں، اس کے حساب سے تقسیم کے حصے طے ہونے چاہئیں۔ اس لحاظ سے سب سے زیادہ حصہ ازواجِ مطہرات کو ملنا چاہیے، اس سے کم حضورؐ کے باقی خاندان کو یعنی بیٹیاں وغیرہ، پھر مہاجرین و انصار کو۔ اسی طرح مختلف غزوات میں شریک ہونے والوں میں بھی ترجیح ہونی چاہیے کہ بدر والوں کو زیادہ ملے اور باقی غزوات والوں کو درجہ بدرجہ ان سے کم ملنا چاہیے، یعنی مال کی تقسیم فضیلت کے اعتبار سے ترجیحات کی بنیاد پر ہونی چاہیے۔ حضرت عمرؓ کی رائے کے مطابق مسلمانوں کے دلوں میں جو عقیدت کی ترجیحات ہیں اور جو فضیلت کے درجات ہیں ان کے مطابق دولت تقسیم ہو۔ مثلاً جیسے اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ترتیب بیان فرمائی ہے "والسابقون الاولون من المهاجرين والانصار والذين اتبعوهم باحسان رضى الله عنهم ورضوا عنه" (التوبہ ۱۰۰) اور سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں مہاجرین اور انصار اور جو نیکی میں ان کے پیروی کرنے والے ہیں، اللہ ان سب سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔

چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ جب خلیفہ بنے تو انہوں نے اپنی دیانت دارانہ رائے کے مطابق فہرستیں مرتب کرائیں اور فضیلت کے اعتبار سے تقسیم کا نظام قائم کیا۔ حضرت عمرؓ کی خلافت کے دس سال یہی طریقہ کار چلتا رہا۔ "کتاب الخراج" میں امام ابو یوسفؒ روایت نقل کرتے ہیں کہ آخری سال ایک مجلس میں حضرت عمرؓ نے یہ بات کہی کہ بھئی بات سنو، میں نے شیخ (حضرت ابوبکرؓ) کی رائے سے اختلاف کیا تھا، اب مجھے اندازہ ہوا ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ کی بات ٹھیک تھی۔ اس لیے کہ ترجیحات میں جب تفاوت ہوا تو معاشرے میں مختلف طبقات بن گئے، اور یہ فطری بات ہے کہ جب لوگوں کے ساتھ لین دین مختلف ہو گا تو اس سے مختلف طبقات بھی بنیں گے۔

جیسے مثال کے طور پر عرض کیا کرتا ہوں کہ ہمارے ہاں سرکاری ملازمین میں جو گریڈ سسٹم ہے، وہ ہمارے ہاں تعارف کی بنیاد ہی بن گیا ہے، کسی سرکاری ملازم کا ذکر ہوتا ہے تو ساتھ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ وہ فلاں گریڈ کا ٹیچر ہے یا فلاں گریڈ کا افسر ہے۔ بلکہ یہ گریڈ سسٹم معاشرے میں تفاوت کا سبب بھی بن گیا ہے کہ اونچے گریڈ والے کو نچلے گریڈ والے سے کوئی کام پڑ جائے تو وہ اس سے درخواست کرنے میں ہچکچاتا ہے۔ چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ نے تفاوت کے اصول پر وظائف تقسیم کیے کہ اللہ تعالیٰ کو ایسے ہی منظور تھا۔ لیکن آخری سال یہ اعتراف فرمایا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی رائے میری رائے کے مقابلے میں زیادہ ٹھیک تھی، آئندہ سال اگر مجھے موقع ملا تو میں خلیفہ اول کا سسٹم بحال کر دوں گا، لیکن حضرت عمرؓ کو آئندہ سال موقع نہ ملا کہ انہیں شہید کر دیا گیا۔ جبکہ حضرت عثمانؓ حضرت عمرؓ کے پہلے موقف کے حامی تھے، چنانچہ وہی نظم چلتا رہا۔

دولت کی تقسیم میں ریاست کا صوابدیدی اختیار

یہاں علماء نے بڑی دلچسپ بحث کی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی آرا ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھیں، دونوں نے بحیثیت امیر المؤمنین اپنی اپنی رائے پر عمل کیا، جبکہ صحابہؓ نے دونوں کا ساتھ دیا۔ علماء فرماتے ہیں کہ یہ ایک اجتہادی مسئلہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے دونوں باتوں کی گنجائش رکھی ہے۔ یہ حالات پر منحصر ہے کہ اگر حالات کا تقاضا برابری کا ہو تو اس کے لیے خلیفۂ اول کی مثال سامنے ہے، اور اگر حالات کا تقاضا ترجیحات کا ہو تو اس کی گنجائش بھی ہے کہ خلیفۂ دوم نے اسی پر عمل کیا ہے۔ اگر اسلامی حکومت اپنے ملک میں حالات محسوس کرے کہ برابری کی ضرورت ہے تو اس کی گنجائش بھی موجود ہے، لیکن اگر ترجیحات کی ضرورت ہو تو اس کی مثال بھی موجود ہے۔

سرکاری عہدیداران کی معاشی و معاشرتی حیثیت

خلافتِ راشدہ میں دفتری نظام، فہرستیں، اعداد و شمار، مردم شماری، یہ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں شروع ہوئی، پھر حضرت عمر فاروقؓ نے اس نظام کے تحت وظائف کی تقسیم کا اہتمام کیا۔ حضرت عمرؓ اپنے عمّال یعنی گورنروں کو جو ہدایات فرمایا کرتے تھے ان میں دو تین باتیں بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ اس زمانے میں تین قسم کے عامل ہوتے تھے: ایک عامل ہوتا تھا منتظم، اور ایک ہوتا تھا قاضی، اس کے علاوہ ایک اور ذمہ داری لوگوں سے زکوٰۃ و عشر اور بیت المال کے واجبات وصول کرنے کی ہوتی تھی۔ حسبِ ضرورت ایک آدمی کو بھی مختلف ذمہ داریاں دے دی جاتی تھیں اور کبھی ایک ڈیوٹی پر ایک سے زیادہ آدمی متعیّن کر دیے جاتے تھے۔ خلافتِ راشدہ کا اصول یہ تھا کہ حکمرانوں اور رعیت کے درمیان معیارِ زندگی

میں زیادہ فرق نہ ہو۔ حضرت عمرؓ کی ہدایات تھیں کہ کوئی گورنر

- اپنے دروازے پر ڈیوڑھی نہیں بنا سکتا۔
- ترکی گھوڑے پر سوار نہیں ہو سکتا۔
- باریک لباس نہیں پہن سکتا۔
- چھنے ہوئے آٹے کی روٹی نہیں کھا سکتا۔

ترکی گھوڑے پر سفر کرنا، گھر کے آگے ڈیوڑھی بنوانا، باریک لباس پہننا اور چھنے ہوئے آٹے کی روٹی کھانا اس زمانے میں عیش و عشرت کی علامات تھیں۔

حضرت عیاض بن غنمؓ کا واقعہ

ایک دفعہ حضرت عمرؓ کو خبر ملی کہ ان کے ایک گورنر عیاض بن غنمؓ نے باریک لباس پہننا شروع کر دیا ہے، حضرت عمرؓ نے اپنے نمائندے حضرت محمد بن مسلمہؓ کو بھیجا کہ جا کر اس معاملہ کی تحقیق کرو۔ اگر یہ خبر درست ہے تو گورنر صاحب جس حالت میں ہوں اسی حالت میں انہیں اپنے ساتھ لے کر آؤ۔ محمد بن مسلمہؓ گئے اور جا کر عیاض بن غنمؓ سے کہا کہ گورنر محترم! امیر المؤمنین کا حکم یہ ہے کہ اگر میں آپ کو باریک لباس پہنے دیکھوں تو آپ کو اسی حالت میں پکڑ کر امیر المؤمنین کے پاس لے جاؤں، اس لیے آپ کسی کو اپنا قائم مقام مقرر کریں اور میرے ساتھ چلیں، چنانچہ وہ گورنر صاحب کو لے کر مدینہ منورہ پہنچے۔ حضرت عمرؓ نے عیاض بن غنمؓ سے فرمایا کہ اچھا! اب تجھے لوگوں پر حکمرانی کا شوق آگیا ہے، تم نے حکمرانی کو لذت کا ذریعہ بنا لیا ہے۔ فرمایا کہ جناب گورنر! یہ کرتا اتاریں اور بکری کے بالوں کا بنا ہوا جبہ پہنیں، آپ کے ذمے ایک نئی ڈیوٹی لگائی جاتی ہے کہ آج کے بعد آپ بیت المال کی بکریاں چرایا کریں گے۔ چنانچہ چھ مہینے تک عیاض بن غنمؓ نے ننگے بدن پر بکری کے بالوں کا جبہ پہن کر بیت المال کی بکریاں چرائیں۔ چھ مہینے گزرنے کے بعد حضرت عمرؓ نے بلا کر پوچھا کہ جناب کچھ مزاج ٹھکانے آئے ہیں؟ عیاض بن غنمؓ نے کہا کہ جی امیر المؤمنین آگئے ہیں، چنانچہ حضرت عمرؓ نے انہیں ایک بار پھر گورنر مقرر کر دیا۔ یہ حضرت عمرؓ کا اپنے عمّال کے ساتھ معاملہ تھا، یعنی یہ بتایا کہ جو عام لوگوں کا حق ہے وہی تمہارا حق بھی ہے اور یہ کہ حکمرانی نے تمہارے ساتھ سرخاب کے پر نہیں لگا دیے۔

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کا واقعہ

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ جو کہ عشرہ مبشرہ میں سے تھے اور صحابہؓ میں بہت بڑی شخصیت تھے، آپؓ السابقون الاولون میں سے تھے اور ایران کے فاتح تھے۔ حضرت عمرؓ نے انہیں کوفہ کا گورنر مقرر کیا ہوا

تھا، حضرت عمرؓ کو یہ شکایت ملی کہ حضرت سعدؓ نے اپنے گھر کے دروازے کے آگے ایک ڈیوڑھی بنوا رکھی ہے۔ حضرت عمرؓ نے محمد بن مسلمہؓ کو بھیجا اور فرمایا کہ اگر ڈیوڑھی دیکھو تو ڈیوڑھی گرا کر پھر انہیں بتانا کہ میں نے ایسا کرنے کے لیے کہا ہے۔ حضرت سعدؓ اپنے گھر بیٹھے تھے کہ باہر شور مچ گیا کہ امیر کوفہ کی ڈیوڑھی گر گئی ہے۔ باہر نکل کر دیکھا تو محمد بن مسلمہؓ تھے سب کو پتہ چل گیا کہ کون آیا ہے اور ڈیوڑھی کس وجہ سے گری ہے، محمد بن مسلمہؓ نے بتایا کہ امیر المؤمنین کا حکم تھا کہ ڈیوڑھی گرا کر پھر آپ کو بتایا جائے۔

حضرت عمر فاروقؓ اس بات کا اہتمام فرماتے تھے کہ لوگوں اور حکمرانوں کے درمیان کوئی خلیج حائل نہ ہو اور ان کے حقوق و معاملات اور معاشرت میں فرق نہ آنے پائے۔ اگرچہ وظائف کی تقسیم میں ترجیحات کا طریقہ کار تھا لیکن عمومی پالیسی یہ تھی کہ ہر آدمی کو عمّال تک، سرکاری حکام تک رسائی حاصل ہونی چاہیے اور انہیں ان کا حق بلا تاخیر ملنا چاہیے۔

ہر پیدا ہونے والے بچے کے لیے وظیفہ

ہر وہ بچہ جو دودھ پینے کی عمر سے گزر جائے، حضرت عمر فاروقؓ نے اس کے لیے وظیفہ مقرر کیا ہوا تھا۔ ایک دن رات کو گشت کر رہے تھے کہ ایک گھر سے ایک بچے کے مسلسل رونے کی آواز آ رہی تھی، پتہ کرنے پر معلوم ہوا کہ ایک بچہ ماں کی گود میں مسلسل روئے جا رہا تھا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ بچہ ماں کی گود میں زیادہ دیر نہیں رو نہیں سکتا، ضرور کوئی غیر معمولی بات ہے، تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ ماں بچے سے دودھ چھڑانا چاہتی ہے تاکہ بچے کا وظیفہ مقرر ہو جائے لیکن بچہ ابھی ایک سال کا ہے اور دودھ چھوڑنا نہیں چاہتا۔ آپؓ نے اپنے ساتھی سے کہا کہ عمر کی مملکت میں اتنا ظلم ہو رہا ہے، حضرت عمرؓ نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ مائیں اس پالیسی کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے وظیفہ حاصل کرنے کی لالچ میں اپنے بچوں سے دودھ چھڑوا رہی ہیں۔ آپؓ نے حکم دیا کہ آج کے بعد بچے کے پیدا ہوتے ہی اس کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا جائے۔

ذمی کے لیے وظیفہ

ذمیوں یعنی اسلامی ریاست میں بسنے والے غیر مسلموں کے لیے بھی وظیفے مقرر تھے، ایک دن حضرت عمرؓ بازار میں جا رہے تھے دیکھا کہ ایک بوڑھا یہودی بازار میں مانگ رہا تھا۔ پوچھا کہ یہ کون ہے؟ بتایا گیا کہ ایک یہودی ہے۔ پوچھا مانگ کیوں رہا ہے کیا اسے وظیفہ نہیں ملتا؟ بوڑھے کو نہیں پتہ تھا کہ یہ حضرت عمرؓ ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ عمر کو جزیہ دینا ہوتا ہے اب میرے پاس اتنے پیسے نہیں بچتے کہ جزیہ دے سکوں۔ حضرت عمرؓ پریشان ہو گئے اور واپس آ کر اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا کہ ذمی لوگ جوانی میں تو محنت مزدوری کر کے ہمیں جزیہ دے سکتے ہیں، بڑھاپے میں کیا کریں۔ پھر یہ حکم جاری کیا کہ تحقیق کرو کہ

جو غیر مسلم کمانے کے قابل نہیں رہا اس سے جزیہ نہیں لیا جائے گا، اور جو اپنے اخراجات پورے نہیں کر سکتا اسے بیت المال سے وظیفہ دیا جائے گا۔ فرمایا ایسے اور لوگوں کو تلاش کرو جو جزیہ ادا کرنے کے لیے اس طرح پریشان ہو رہے ہوں گے، یعنی ریاست کے ذمے ہر شہری کے حقوق ہیں۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ لباس، کھانا پینا اور شادی بھی ریاست کے ذمے ہے، اگر کوئی آدمی اپنی شادی کا خرچہ برداشت نہیں کر سکتا تو ریاست اس کی شادی کا خرچ اٹھانے کی ذمہ دار ہے، کوئی آدمی اپنا مہر ادا نہیں کر سکتا تو ریاست اس کا مہر ادا کرنے کی بھی ذمہ دار ہے۔ جناب نبی کریمؐ نے اسلامی فلاحی ریاست کا جو تصور دیا وہ یہی ہے کہ مملکت کے شہری سکون سے رہیں اور ہر فرد کو اس کا صحیح حق ملے۔ یہی جناب نبی کریمؐ کی سیرتِ طیبہ کی روشنی میں معاشی انصاف کا دائرہ ہے۔

(ستمبر ۱۹۹۵ء کے دوران جامعہ الہدیٰ، ٹونگھم، برطانیہ میں خطاب)

زکوٰۃ کا فلسفہ و نظام

تزکیۂ مال کا ذریعہ

صاحبِ مال کے مال پر اجتماعیت اور معاشرہ کے مسلّمہ حقوق ہیں، ان حقوق کو اسلام تسلیم کرتا ہے اور ان کا تعیّن بھی کرتا ہے، جبکہ حقوق وصول کرنے والوں کی عزتِ نفس کی پاسداری کے لیے اسلام اسے خدا کا حق قرار دیتا ہے۔ اب ایک شخص اگر اپنے مال میں سے خدا تعالیٰ اور معاشرہ کا حق ادا نہیں کرتا تو اس کا مال اس کے اپنے حق اور دوسروں کے حقوق کے ساتھ مخلوط ہے، اور جب وہ تمام حقوق ادا کر دے گا تو اس کا مال اس کا اپنا ہو گا اور دوسروں کے حقوق سے پاک ہو جائے گا۔ مال کے تزکیہ کا یہی معنیٰ ہے کہ اس کا مال اللہ تعالیٰ اور بندوں کے حق سے پاک ہو گیا ہے۔

صاحبِ مال کے ذہن میں یہ تصور ہر وقت اجاگر رہے گا کہ یہ مال اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے اور اس میں سے اللہ رب العزت کے حقوق کے حوالے سے معاشرہ کے حقوق اس کے ذمہ ہیں۔ اور یہ احساس اس میں خدا ترسی، جواب دہی اور حق کی ادائیگی کے اوصاف پیدا کر دے گا۔ قرآن کریم میں اللہ رب العزت ارشاد فرماتے ہیں:

> ”آپ ان کے مال سے صدقہ وصول کریں تاکہ آپ ان کو پاک کریں اور ان کا تزکیہ کریں۔“ (التوبہ)

دوسرے مقام پر متقی کی تعریف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"وہ اپنے مال کو خرچ کر کے پاکیزگی حاصل کرتا ہے۔"

ام المؤمنین سلمہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ جس "کنز" کی قرآن کریم میں مذمت کی گئی ہے وہ کونسا ہے؟ تو جناب نبی اکرمؐ نے ارشاد فرمایا:

"جب تم اپنے مال کی زکوٰۃ ادا کر دو تو وہ کنز نہیں رہتا۔" (ابوداؤد)

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمرؓ ارشاد فرماتے ہیں:

"زکوٰۃ لوگوں کے مال کو پاک کرنے کے لیے فرض کی گئی ہے۔" (بخاری)

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور – ۱۸ نومبر ۱۹۸۳ء)

زکوٰۃ کا نظام اور برطانوی ولی عہد

لاہور سے شائع ہونے والے ایک قومی روزنامے کی رپورٹ کے مطابق برطانیہ کے ولی عہد شہزادہ چارلس نے گزشتہ دنوں دورہ عمان کے دوران ایک خصوصی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ زکوٰۃ کا نظام نہ صرف مسلمانوں کی بلکہ ساری دنیا کی تقدیر بدل سکتا ہے۔ رپورٹ کے مطابق تقریب سے خطاب کے دوران شہزادہ چارلس نے سامعین کو اس وقت چونکا دیا جب انہوں نے اسلام کے اہم رکن زکوٰۃ کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ یہ انسانی مساوات کی ایک شاندار مثال ہے جس کی پیروی ہر انسان کو کرنی چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ زکوٰۃ کے نظام کی پیروی کر کے دولت اور طاقت میں توازن برقرار رکھا جا سکتا ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ شہزادہ چارلس ان دنوں اسلام کا انتہائی دلچسپی سے مطالعہ کر رہے ہیں اور وہ اسلام کے پانچ ارکان میں سے زکوٰۃ سے بے حد متاثر ہیں۔

اسلام نے زکوٰۃ، صدقات، وراثت اور دیگر ذرائع سے دولت کی تقسیم در تقسیم کا جو ہمہ گیر نظام دیا ہے اس کا فلسفہ خود قرآن کریم نے سورۃ الحشر آیت ۷ میں یہ بیان فرمایا ہے کہ

"تاکہ دولت تم میں سے مالداروں کے درمیان ہی گردش نہ کرتی رہے"۔

گردشِ دولت گردشِ خون کی مانند

معاشرہ میں دولت کی تقسیم کا توازن قائم کرنا امن و انصاف اور خوشحالی کے لیے ناگزیر ہے کیونکہ دولت کی حیثیت سوسائٹی میں وہی ہے جو انسانی جسم میں خون کی ہے۔ خون اگر گردش کرتا رہے گا تو جسمانی صحت قائم رہے گی۔ کسی جگہ خون ضرورت سے زیادہ جمع ہو جائے گا تو خرابی پیدا ہو گی، پھوڑے پھنسیاں اور اس قسم کی بیماریاں جنم لیں گی۔ اور اگر کسی عضو میں خون اس کی ضرورت سے کم فراہم ہو گا تو وہ

عضو مفلوج ہو جائے گا۔ پھر تمام اعضا کی ضروریات یکساں نہیں ہیں، ہر ایک کی ضرورت کی مقدار الگ ہے۔ اور مساوات کا معنیٰ یہ نہیں ہے کہ تمام اعضا کو خون کی برابر برابر مقدار ملے، بلکہ مساوات اس کا نام ہے کہ ہر عضو کو اس کی ضرورت کے مطابق خون ملتا رہے۔ اسی کا نام توازن ہے اور جب بھی یہ توازن بگڑے گا انسانی جسم بیماریوں کی آماجگاہ بن جائے گا۔

اسلام نے سوسائٹی میں دولت کی گردش کو اسی لیے ضروری قرار دیا ہے اور دولت کی تقسیم کا ایک فطری نظام دیا ہے کہ اس پر عمل کرنے سے انسانی معاشرہ خود بخود امن اور خوشحالی کی منزل سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ بلکہ قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ آسمانی تعلیمات پر عمل کی ان برکات سے ہر دور میں انسانی معاشرہ مستفید ہو سکتا ہے۔ چنانچہ سورۃ المائدہ آیت ۶۶ میں بنی اسرائیل کے حوالہ سے یہ ارشاد ربانی ہے کہ اگر وہ تورات، انجیل اور انبیاء کرامؑ کی دیگر تعلیمات کو اپنے معاشرہ میں بطور سسٹم نافذ و قائم کرتے تو آسمان بھی ان کے لیے رزق برساتا اور زمین بھی ان کے لیے رزق اگلتی۔ یہ وعدہ صرف بنی اسرائیل کے ساتھ نہیں تھا بلکہ ہمارے ساتھ بھی ہے کہ قرآن کریم کو بطور نظام اپنا لیں تو آسمان اور زمین دونوں طرف سے رزق اور برکتوں کے دروازے کھل جائیں گے۔

نبی اکرمؐ کی پیشین گوئی

اس سلسلہ میں بخاری شریف کی ایک روایت کا حوالہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جسے روایت کرنے والے صحابی حاتم طائی کے بیٹے حضرت عدی بن حاتمؓ ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبویؐ میں صحابہ کرام کے ہمراہ تشریف فرما تھے کہ ایک صاحب نے اپنے علاقہ کے حالات بیان کرتے ہوئے کہا کہ یا رسول اللہ! ہمارے علاقہ میں قتل و غارت، ڈکیتی اور بدامنی بہت زیادہ ہے، جان و مال اور آبرو محفوظ نہیں ہے۔ ان کی بات ابھی مکمل ہوئی تھی کہ ایک اور صاحب بولے یا رسول اللہ! ہمارے علاقہ میں غربت اور بھوک و افلاس بہت ہے، لوگ بہت تنگ ہیں، کھانے کو نہیں ملتا۔

عدیؓ کہتے ہیں کہ نبی اکرمؐ نے ان دونوں کو کوئی جواب نہیں دیا اور مجھے مخاطب ہو کر فرمایا کہ

1. عدی! تم نے حیرہ دیکھا ہے؟ حیرہ ایک شہر کا نام ہے جو بنو غسان کی سلطنت کا پایہ تخت تھا اور اب غالباً کوفہ کا حصہ ہے۔ حضرت عدیؓ نے جواب دیا کہ دیکھا تو نہیں البتہ سن رکھا ہے۔ اس پر جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ عدیؓ! اگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں کچھ لمبی عمر عطا کی تو دیکھو گے کہ حیرہ سے ایک عورت سونے چاندی کے زیورات سے لدی ہوئی اونٹ کے کجاوے میں بیٹھ کر مکہ مکرمہ تک تنہا سفر کرے گی اور پورے راستے میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کا ڈر اس کے دل میں نہیں ہوگا۔

عدیؓ کہتے ہیں کہ میں تعجب اور حیرت سے سوچنے لگا کہ حیرہ سے مکہ مکرمہ آتے ہوئے تو راستہ میں ہمارا قبیلہ بھی آباد ہے اور اپنے قبیلہ کے نوجوانوں کو میں جانتا ہوں کہ ان سے کون سی چیز بچتی ہے، اس لیے سوچ میں پڑ گیا کہ جب وہ عورت سفر کر رہی ہوگی تو میری قوم کے غنڈے اس وقت کہاں ہوں گے؟

2. لیکن میں ابھی اسی حیرت اور تعجب میں تھا کہ جناب نبی اکرمؐ نے دوسری بات فرمادی کہ عدیؓ! اگر تم مزید کچھ عرصہ زندہ رہے تو دیکھو گے کہ کسریٰ کے خزانے فتح ہوں گے اور مدینہ میں لاکر تقسیم کیے جائیں گے۔ عدیؓ کہتے ہیں میں نے تعجب سے پوچھا یا رسول اللہ! کون کسریٰ؟ وہی جو فارس کا بادشاہ ہے؟ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ ہاں وہی۔

3. عدیؓ کہتے ہیں کہ میں تعجب اور حیرت کے ساتھ اس ارشاد پر غور کر رہا تھا کہ نبی اکرمؐ نے تیسری بات فرمادی کہ عدیؓ! اگر تمہیں کچھ لمبی عمر نصیب ہوئی تو دیکھو گے کہ تم لوگ اپنی زکوٰۃ کا سونا اور چاندی ہتھیلی پر رکھ کر بازاروں میں آوازیں دو گے کہ کوئی زکوٰۃ کا مستحق ہو تو آکر وصول کر لے مگر تمہیں اس سوسائٹی میں کوئی زکوٰۃ کا مستحق نہیں ملے گا۔

محدثینؒ کہتے ہیں کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے عدی بن حاتمؓ کو خطاب کر کے ان دو آدمیوں کے سوال کا جواب دیا تھا جنہوں نے اپنے علاقوں کے حالات بیان کرتے ہوئے بدامنی، قتل و غارت، غنڈہ گردی، بھوک، افلاس، فاقہ کشی اور غربت کی شکایت کی تھی۔ ان کے جواب میں جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ جو تعلیمات میں پیش کر رہا ہوں ان پر حوصلہ اور اعتماد کے ساتھ عمل کر کے دیکھو، اس درجہ کا امن نصیب ہوگا کہ حیرہ (کوفہ) سے مکہ مکرمہ آتے ہوئے راستہ میں جان، مال اور آبرو کا کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوگا، اور اس درجہ کی خوشحالی ہوگی کہ لوگ زکوٰۃ کی رقم ہاتھوں میں اٹھائے بازاروں میں آوازیں دے کر زکوٰۃ کا مستحق تلاش کریں گے مگر سوسائٹی میں انہیں کوئی زکوٰۃ کا مستحق نہیں ملے گا۔

اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشگوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی اور اسلامی نظام کی برکت سے دنیا نے امن و خوشحالی کے اس دور کا نظارہ کیا کہ آج پوری نسل انسانی دوبارہ اس کے لیے ترس رہی ہے۔ اس لیے اگر شہزادہ چارلس کو زکوٰۃ کے نظام سے دنیا کی تقدیر بدلتی دکھائی دیتی ہے تو یہ کوئی نئی بات نہیں، دنیا اس سے پہلے اس بابرکت نظام کی بدولت نسلِ انسانی کی تقدیر بدلنے کا منظر دیکھ چکی ہے اور آئندہ بھی انسانی معاشرہ کی تقدیر جب کبھی بدلی اسی نظام کے ذریعے بدلے گی۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد)

وراثت کا فلسفہ و نظام

ایک دفعہ والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدرؒ کے پاس ایک زمیندار صاحب بیٹھے تھے، والد محترمؒ نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ نے اپنے والد کی وفات کے بعد بہنوں کو زمینوں میں حصہ دے دیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ وہ دستبردار ہوگئی ہیں۔ والد صاحبؒ نے پوچھا کہ کیا وہ زمین ان کے قبضے میں تھی جس سے وہ دستبردار ہوئی ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ نہیں ان کے قبضہ میں تو نہیں تھی۔ والد صاحبؒ نے فرمایا کہ وہ پھر دستبردار کس چیز سے ہوئی ہیں؟ پھر فرمایا کہ بھائی دستبرداری اسے نہیں کہتے، ان کے حصہ کی زمین ان کے نام کرا کے کاغذات ان کی تحویل میں دے دو، پھر ان سے کہو کہ وہ اپنے حصہ کی زمین تمہیں ہبہ کر کے واپس کر دیں۔ حضرت والد محترمؒ کے اس ارشاد پر میں کافی دنوں تک سوچتا رہا کہ فقہی طور پر شاید بعض مفتیان کرام اتنی سختی کی حمایت نہ کریں، لیکن معاشرتی صورتحال اور وراثت سے دستبرداری کے لیے عورتوں پر ڈالا جانے والا دباؤ جس طرح متنوع شکلوں میں موجود ہے اس کے پیشِ نظر یہی جواب زیادہ صحیح بنتا ہے۔

نبی اکرمؐ کی ہدایات

جبکہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سلسلہ میں اس قدر واضح ہدایات دی ہیں کہ ان سے آگاہی رکھنے والا کوئی مسلمان اس قسم کی حرکت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں صدقہ خیرات اور خیر کے کاموں کے لیے اپنی جائیداد وقف کر دینے کے حوالہ سے بھی پابندی لگائی ہے کہ کوئی شخص اپنی جائیداد کے تیسرے حصے سے زیادہ وقف کی وصیت نہیں کر سکتا۔ اور اس موقع پر فرمایا کہ یہ بات درست نہیں ہے کہ تم اپنی جائیداد صدقہ اور وقف کر جاؤ اور تمہارے ورثاء لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے رہیں۔ گویا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے وراثت کو ورثاء کا حق قرار دے کر اصل مالک کو بھی ان کے حصے میں مداخلت سے روک دیا ہے۔ یہ روایت امام بخاریؒ نے حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت کی ہے۔

وراثت کی تقسیم اور وصیت ناموں میں عام طور پر جو زیادتیاں اور ناانصافیاں روا رکھی جاتی ہیں جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا اندازہ تھا، اس لیے انہوں نے اس کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ مسند احمدؒ میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک جوڑا یعنی میاں بیوی ساٹھ سال تک مسلسل اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف رہتے ہیں، لیکن آخری وقت میں وراثت کی تقسیم

میں ناانصافی کر کے جہنم کے مستحق بن جاتے ہیں۔ وراثت میں ناانصافی یہ ہے کہ ورثاء کے جو حصے قرآن کریم میں مقرر کیے گئے ہیں انہیں نظر انداز کر کے اپنی طرف سے حصے مقرر کیے جائیں۔

مسئلہ وراثت کی حساسیت

وراثت شریعت کا واحد مسئلہ ہے جس کا قرآن کریم نے نہ صرف حکم دیا ہے بلکہ اس کی تمام ضروری تفصیلات خود بیان کر دی ہیں۔ جبکہ باقی شرعی احکام حتیٰ کہ نماز جیسے اہم ترین فریضہ کی ساری تفصیلات قرآن کریم نے بیان نہیں کیں۔ اس سے وراثت کی اہمیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح سنن ابن ماجہؒ میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص نے اپنے کسی وارث کو وراثت میں اس کے حصے سے محروم کر دیا، اللہ تعالیٰ اس کے جنت کے حصے سے کٹوتی کر کے وارث کو اس کا حق دلوائیں گے۔ میں اسے یوں تعبیر کیا کرتا ہوں کہ اللہ رب العزت فرما رہے ہیں کہ جو حصے میں نے مقرر کیے ہیں ان سے کوئی شخص حقدار کو محروم نہیں کر سکتا۔ اور اگر کوئی شخص دنیا میں وارث کو محروم کرے گا تو میں اسے محروم نہیں رہنے دوں گا اور آخرت میں اس کے حصے سے کاٹ کر محروم کو دے دوں گا۔

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۲۷ فروری ۲۰۱۵ء)

وراثت کا ایک مسئلہ

۶ جنوری ۲۰۰۰ء کے اخبارات میں وفاقی شرعی عدالت کے چیف جسٹس میاں محبوب احمد، جسٹس اعجاز یوسف اور جسٹس فدا محمد پر مشتمل فل بینچ کے جس فیصلے کی خبر شائع ہوئی ہے اس میں یتیم پوتے کو دادا کی وراثت میں شریک کرنے کا حکم بھی شامل ہے۔ خبر کے مطابق فیصلے میں کہا گیا ہے کہ ”یتیم پوتے کو جائیداد میں حصہ دیا جائے چاہے دادا نے وصیت کی ہو یا نہ کی ہو۔“

اس سے قبل یہ مسئلہ صدر محمد ایوب خان مرحوم کے دور میں نافذ کیے جانے والے عائلی قوانین کے حوالہ سے علمی و دینی حلقوں میں زیر بحث آچکا ہے جب عائلی قوانین میں یتیم پوتے کو دادا کی وراثت میں حصہ دار قرار دیا گیا تھا جس کی ملک بھر کے علمائے کرام نے مخالفت کی تھی اور کہا تھا کہ یہ ضابطہ شرعی اصولوں کے منافی ہے۔ علمائے کرام کا موقف یہ تھا کہ ایک شخص کی وفات کے وقت اگر اس کی حقیقی اولاد یعنی بیٹے اور بیٹیاں موجود ہیں تو اس کی زندگی میں فوت ہو جانے والے اس کے کسی بیٹے یا بیٹی کی اولاد اس کی وراثت میں شرعاً حصہ دار نہیں ہوگی۔ ہاں اگر مرنے والے کے اپنے بیٹے یا بیٹیاں موجود نہیں ہیں تو ان

کی غیر موجودگی میں اس کی وراثت اس کے پوتوں کو منتقل ہو جائے گی۔ علمائے کرام کے اس موقف کی بنیاد بخاری شریف کے ایک باب پر ہے جس میں امام بخاریؒ نے اسی عنوان کے تحت حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا فتویٰ نقل کیا ہے کہ مرنے والے کی اپنی اولاد اگر زندہ ہے تو اس کی زندگی میں مرنے والے کے بیٹے یا بیٹی کی اولاد کو اس کی وراثت میں سے حصہ نہیں ملے گا۔

حضرت زید بن ثابتؓ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے "چیف سیکرٹری" تھے اور ان کے بارے میں خود آنحضرتؐ کا ارشاد گرامی ہے کہ میرے صحابہؓ میں وراثت کے مسائل و احکام کا سب سے بڑا عالم زید بن ثابتؓ ہے۔ پھر حضرت زید بن ثابتؓ کے اس قول پر صحابہ کرامؓ کا اجماع بھی ہے جو بجائے خود شریعت کے بنیادی دلائل میں سے ایک اہم دلیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے جمہور علماء کرام نے عائلی قوانین میں شامل کی جانے والی اس شق کی مخالفت کی تھی اور اسی بنیاد پر وفاقی شرعی عدالت کا مذکورہ فیصلہ بھی ملک کے جمہور علماء کرام کے لیے قابل قبول نہیں ہوگا۔

وراثت کی تقسیم اجتہادی امور میں سے نہیں

اس بارے میں ایک بات بڑے جذباتی انداز میں کہی جاتی ہے کہ جب بیٹوں کو وراثت میں حصہ مل رہا ہے تو یتیم پوتے زیادہ مستحق ہیں اس لیے انہیں بھی وراثت میں شریک کیا جائے ورنہ ناانصافی ہوگی۔ مگر یہ بات محض جذباتی سی ہے اس لیے کہ وراثت کی تقسیم کا تعلق اجتہادی امور میں سے نہیں ہے بلکہ قرآن و سنت میں واضح حصے متعیّن کر دیے گئے ہیں اور خلفائے راشدینؓ صحابہ کرام کے اجماعی فیصلوں کی صورت میں ان کی وضاحت و صراحت ہو چکی ہے۔ اس لیے ہم شرعی اصولوں کے مطابق ان میں کسی ردوبدل کے مجاز نہیں ہیں اور نہ ہی وارثوں کی فہرست میں کسی کمی بیشی کا ہمیں اختیار حاصل ہے۔

کیفیت یا تعلق، وراثت کا استحقاق کس بنیاد پر؟

پھر وراثت کے استحقاق کا تعلق ورثاء کی حالت اور ان کے قابل رحم ہونے یا نہ ہونے سے نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد مرنے والے کے ساتھ ان کے تعلق کی نوعیت پر ہے۔ کیونکہ شرعی اصول ہے کہ قریبی رشتہ دار وارث قرار پاتا ہے اور قریبی رشتہ دار کی موجودگی میں بالواسطہ رشتہ دار وراثت کا مستحق نہیں سمجھا جاتا۔ یہ ایک طے شدہ اصول ہے جس سے انحراف کی صورت میں پورا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ مثلاً پوتوں اور نواسوں کو ایک طرف رہنے دیجئے، خود براہ راست اولاد میں ایک بیٹا فرمانبردار و خدمت گزار ہے اور اس نے باپ کی خدمت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، جبکہ دوسرا بیٹا نافرمان ہے اور اس نے زندگی بھر باپ کو تنگ اور ذلیل کرنے کے سوا کچھ نہیں کیا۔ اگر ہم معروضی حالات کو بنیاد بنا کر انصاف

کرنے لگ جائیں تو ہمارا فیصلہ بظاہر یہ ہوگا کہ فرمانبردار بیٹے کو ساری جائیداد دے دی جائے اور نافرمان بیٹے کو وراثت کے قریب بھی نہ آنے دیا جائے۔ مگر شریعت اس بات کو تسلیم نہیں کرتی کیونکہ اس کے فیصلے معروضی حالات کے تابع نہیں ہوتے بلکہ دائمی اور فطری اصولوں کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ اس لیے شریعت کی نظر میں مرنے والے باپ کا فرمانبردار بیٹا اور نافرمان بیٹا دونوں وراثت میں یکساں حصہ دار ہیں۔ حتیٰ کہ کوئی باپ اگر اپنے کسی بیٹے کو زندگی میں عاق کرکے اپنی وراثت سے لاتعلق کرنے کا اعلان کر گیا ہے تب بھی شرعاً وہ بیٹا وراثت سے محروم نہیں ہوگا بلکہ دوسرے فرمانبردار بیٹے کے برابر حصہ کا حقدار ہوگا۔

صاحبِ مال کا صوابدیدی اختیار

شریعت نے باپ کے ہاتھ پاؤں بالکل نہیں باندھے بلکہ اسے حق دیا ہے کہ وہ اپنے کسی ایسے عزیز کے لیے جو شرعاً اس کی وراثت کا حصہ دار نہیں بنتا اگر اپنی جائیداد میں سے کچھ حصہ دینا چاہتا ہے تو وہ بطور وصیت اس کے لیے حصہ مقرر کر سکتا ہے، بشرطیکہ یہ وصیت اس کی کل جائیداد کے تیسرے حصے سے زیادہ نہ ہو۔ کیونکہ اگر تیسرے حصے سے زیادہ کسی کے لیے وصیت کرے گا تو یہ وارثوں کی حق تلفی اور ان کے ساتھ ناانصافی شمار ہوگی۔ اس سلسلہ میں جناب نبی کریمؐ کا واضح ارشاد موجود ہے کہ ایک صحابیؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! میں اپنی جائیداد اللہ تعالیٰ کے نام وقف کرنا چاہتا ہوں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ نہیں، اس میں تیرے وارثوں کا حق ہے۔ صحابیؓ نے کہا کہ نصف جائیداد وقف کر دیتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا کہ نصف بھی زیادہ ہے۔ صحابیؓ نے عرض کیا کہ کیا تیسرا حصہ وقف کر دوں؟ تو اس پر آپؐ نے فرمایا کہ ہاں تیسرا حصہ ٹھیک ہے اور یہ بھی بہت ہے۔ اور ایک روایت کے مطابق آنحضرتؐ نے ان صحابیؓ سے کہا کہ کیا تو اس بات کو پسند کرتا ہے کہ تو اپنی ساری جائیداد اللہ تعالیٰ کی راہ میں دے دے اور تیری اولاد لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتی پھرے؟

اس حوالہ سے ہماری گزارش یہ ہے کہ شریعت نے وراثت کے حصے اور ورثاء کی فہرست تو درجہ بدرجہ طے کر دی ہے جس میں کسی سطح پر بھی ہم ردوبدل کے مجاز نہیں ہیں، البتہ معروضی حالات میں کمی بیشی کو وصیت کے ذریعے پورا کرنے کے حق کی گنجائش بھی رکھ دی گئی ہے تاکہ اگر کسی جگہ ضرورت محسوس ہو تو اس سے استفادہ کیا جا سکے۔ اس لیے اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ اس کی زندگی میں فوت ہو جانے والے اس کے کسی بیٹے یا بیٹی کی اولاد بھی ضرورتمند ہے اور اسے اس کی جائیداد میں حصہ ملنا چاہیے تو وہ تیسرے حصے کے اندر اندر ان کے لیے بھی وصیت کر سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ خود وصیت کی ضرورت محسوس نہیں

کرتا تو ہمیں کوئی حق حاصل نہیں ہے کہ ورثاء کی فہرست میں اپنی طرف سے ردوبدل کریں۔

وراثت کے حوالے سے عملی تقاضے

البتہ اس حوالہ سے ہم ایک اور ضروری بات عرض کرنا چاہتے ہیں کہ معروضی حالات کے عنوان سے مفروضے قائم کر کے انصاف فراہم کرنے کے لیے تو ہم شرعی احکام وضوابط میں ردوبدل سے بھی گریز نہیں کر رہے مگر وراثت کے باب میں جو ناانصافیاں عملاً ہو رہی ہیں ان کے ازالہ کی طرف ہماری کوئی توجہ نہیں ہے۔ مثلاً ہمارے معاشرے میں عورت کو وراثت میں حصہ دار نہیں سمجھا جاتا جو ہندووانہ تہذیب کا اثر ہے کہ بہت کم گھرانے ایسے ہیں جہاں باپ کے مرنے کے بعد اس کی اولاد میں سے بیٹیوں کو بھی وراثت میں عملاً حصہ ملتا ہے۔ ورنہ عام طور پر جہیز کو وراثت کے حصے کا قائم مقام قرار دے کر وراثت کے اصل حصے سے اس کی چھٹی کرا دی جاتی ہے، یا اس سے زیادہ بات ہو تو ان سے معاف کرانے کا ڈھونگ رچایا جاتا ہے۔ اور جس انداز سے ہمارے ہاں غریب عورت سے مہر کی رقم اور وراثت کا حصہ معاف کرایا جاتا ہے اس کی کوئی اخلاقی یا شرعی صورت سرے سے نہیں بنتی۔ مگر ہم معاشرتی اور خاندانی دباؤ کے تحت اس کے منہ سے معافی کا ایک لفظ کہلوا کر بری الذمہ ہو جاتے ہیں، یہ سراسر ناانصافی اور زیادتی ہے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ ناانصافی اور ظلم ہمارے ہاں ملک کے بعض حصوں میں یہ بتایا جاتا ہے کہ صرف جائیداد کے تحفظ اور اسے تقسیم ہونے سے بچانے کے لیے جوان لڑکی کو شادی کے فطری اور شرعی حق سے محروم کر دیا جاتا ہے اور اس کی گود میں قرآن کریم رکھ کر کہہ دیا جاتا ہے کہ تیری شادی (نعوذ باللہ) قرآن کریم کے ساتھ کر دی گئی ہے۔ اس لیے علماء کرام نے یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ اگر کسی شخص کو یہ خدشہ ہو کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے بیٹے اپنی بہنوں کو وراثت میں ان کا حق نہیں دیں گے تو اسے زندگی میں بیٹیوں کو ان کا حصہ دے دینا چاہیے اور بہت سے محتاط دیندار لوگ ایسا کرتے بھی ہیں۔

اس لیے ہم وفاقی شرعی عدالت کے معزز جج صاحبان سے یہ گزارش کریں گے کہ معروضی حالات میں انصاف کے لیے مفروضوں کو بنیاد بنانے کی بجائے معاشرہ میں ہونے والی عملی ناانصافیوں کا جائزہ لیں اور غریب لوگوں بالخصوص خواتین کو وراثت اور دیگر معاملات میں انصاف فراہم کرنے کی راہ ہموار کریں۔ اس کے ساتھ ہی اگر فاضل جج صاحبان اسے گستاخی پر محمول نہ کریں تو ان سے یہ عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ دستورِ پاکستان کے تحت انہیں جو ذمہ داری سونپی گئی ہے وہ قرآن وسنت کے مسلّمہ احکام وضوابط کے دائرہ میں ہے، اس لیے ان کا کام یہ ہے کہ اگر کسی تجویز یا رواج کو قرآن وسنت کے منافی پائیں تو اسے شریعت کے مطابق ڈھالنے کے لیے پیشرفت کریں، نہ یہ کہ شرعی قوانین میں سے کسی کو مروّجہ قوانین کے

خلاف پاکر اس میں ردوبدل شروع کردیں۔ ہمارا خیال ہے کہ وفاقی شرعی عدالت کے فاضل جج صاحبان اس بارے میں اپنی دستوری ذمہ داریوں کا ایک بار پھر جائزہ لے لیں تو یہ زیادہ مناسب بات ہوگی۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد-۲۹ جنوری ۲۰۰۰ء)

اہلِ خانہ کی مالی ذمہ داری

قرآن کریم نے نکاح کے مقاصد یہ بیان کیے ہیں:

"ان تبتغوا باموالکم محصنین غیر مسافحین" (النساء ۲۴)۔

مہر، نفقہ اور وراثت

پہلی شرط یہ کہ "ان تبتغوا باموالکم" خاوند بیوی کی تمام مالی ذمہ داریاں قبول کرے گا تو نکاح ہوگا۔ نکاح کے ساتھ خاوند کو بیوی اور ہونے والی اولاد سب کے خرچے کی ذمہ داری لینا ہوگی۔ اس میں مہر، نفقہ اور وراثت سب شامل ہیں۔ نکاح کے مقاصد میں دوسری شرط یہ ذکر فرمائی "محصنین غیر مسافحین" کہ باقاعدہ گھر بساؤ گے، صرف شہوت اور خواہش پوری کرنا مقصد نہیں ہوگا۔ ایک اور آیت میں تیسری شرط یہ لگائی "ولا متخذی اخدان" (المائدہ ۵) کہ جو کچھ ہوگا آن ریکارڈ ہوگا، خفیہ طور پر دوستیاں نہیں ہوں گی۔ ایک عورت کسی کے نکاح میں آئی ہے تو اس کے سب اخراجات خاوند کے ذمہ ہیں۔ یہ ذمہ داری قبول کیے بغیر اگر نکاح کر لیا جائے تو بھی خاوند کے ذمے معروف اخراجات واجب ہیں۔

نفقہ کا معیار، حیثیت و عُرف کے مطابق

ایک آیت کریمہ میں یہ بھی بتایا ہے کہ نفقہ کا معیار کیا ہوگا۔ خاوند اپنی مالی حیثیت کے مطابق بیوی اور اولاد پر خرچ کرنے کا پابند ہے۔ اگر مالدار ہے تو اس حیثیت سے اور تنگ دست ہے تو اس حیثیت سے۔ اور حدیث میں بھی ہے کہ اگر خاوند اپنی حیثیت کے مطابق گھر والوں پر خرچ نہیں کرتا تو وہ حق تلفی کر رہا ہے۔ اور اگر بیوی اور اولاد اس کی حیثیت سے زیادہ مانگتے ہیں تو وہ زیادتی کر رہے ہیں۔ "لینفق ذو سعة من سعته ومن قدر علیه رزقه فلینفق مما اٰتاه الله" (الطلاق ۷) کہ وسعت والا خاوند اپنی وسعت کے مطابق خرچہ کرے، اور جس کا رزق تنگ ہے تو جو اللہ نے اس کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرے۔

اس کے بعد فرمایا "لا یکلف اللہ نفساً الا ما اٰتٰھا" (البقرہ ۲۸۶) کہ اللہ تعالیٰ کسی معاملے میں کسی آدمی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے۔ ہر معاملے میں یہی اصول ہے کہ کسی کی حیثیت سے بڑھ کر اس پر ذمہ داری نہیں ڈالی جاتی۔ اگر کسی آدمی کے پاس پیسے نہیں ہیں تو اس پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے۔ اگر کوئی کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھ سکتا تو اس پر قیام فرض نہیں ہے، بیٹھ کر پڑھ لے۔ اگر کوئی روزہ نہیں رکھ سکتا تو قضا کر لے۔ خرچے کے معاملے میں بھی اللہ تعالیٰ نے یہی اصول بیان فرمایا ہے کہ اگر مالی وسعت ہے تو اس کے مطابق خرچ کرو، اور اگر تنگدستی ہے تو اس کے مطابق خرچ کرو۔ اللہ تعالیٰ آدمی کی وسعت کے مطابق پابندیاں لگاتے ہیں۔ اس کے بعد فرمایا "سیجعل اللہ بعد عسر یسرًا" (الطلاق ۷) حالات ایک جیسے نہیں رہتے، کچھ عرصہ تنگی کا گزرے تو اس کے بعد آسانیاں بھی آتی ہیں۔

یہ حیثیت کیا ہے اور اس کا تعین کون کرے گا؟ اس حوالے سے قرآن مجید نے یہ ذکر کیا ہے "متاعاً بالمعروف" کہ اس علاقے اور ماحول میں جو خرچہ معروف ہے وہ دینا ہوگا۔ گاؤں میں گاؤں کی حیثیت سے، شہر میں شہر کی حیثیت سے، امریکہ میں امریکہ اور برطانیہ میں برطانیہ کی حیثیت سے۔ پھر فرمایا "حقاً علی المحسنین" (البقرہ ۲۳۶) یہ خرچہ دینا اختیاری نہیں ہے، یا خاوند کا احسان نہیں ہے بلکہ اس پر واجب ہے۔

علاقے کے عرف کے مطابق خاوند کے ذمے خرچہ دینا واجب ہوتا ہے۔ جیسا کہ نکاح ہو جائے اور ایجاب قبول ہو جائے لیکن مہر مقرر نہ ہو تب بھی مہرِ مثل واجب ہوتا ہے۔ یعنی اگر مہر مقرر کیا ہو تو وہ دینا واجب ہے، اور اگر مقرر نہ کیا ہو تو وہ مہر دینا واجب ہوگا جو اس عورت کے خاندان کی عورتوں کا عام طور پر مہر ہوتا ہے۔ اسے "مہرِ مثل" کہتے ہیں۔ نفقہ میں بھی جس ماحول میں رہتے ہیں اس کے عرف کا اعتبار ہو گا۔ اگر خاوند بیوی اور اولاد کو خرچہ نہیں دے گا تو اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گنجائش دی ہے کہ بلا اجازت اس کے مال میں سے خرچہ وصول کیا جائے۔

خاوند کے ذاتی مال پر بیوی کا اختیار

حضرت ابو سفیانؓ اور ان کی اہلیہ حضرت ہندہؓ فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے تھے۔ حضرت ابو سفیانؓ سردار اور چودھری تھے لیکن مزاج کے لحاظ سے اتنے سخی نہیں تھے۔ اس بات کا تعلق مزاج سے ہوتا ہے، بعض لوگوں کے پاس مال ہوتا ہے لیکن خرچ کرنے کو جی نہیں چاہتا، اور بعض لوگوں کے پاس نہیں ہوتا تب بھی خرچ کرنے کو جی چاہتا ہے کہ اگر ہو تو خرچ کروں..... حضرت ابو سفیانؓ کی اہلیہ محترم حضرت ہندہؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئیں اور عرض کیا یا رسول اللہ! ابو سفیان گھر کا خرچہ

پورا نہیں دیتے، میرا اور بچوں کا جو خرچہ دیتے ہیں وہ کافی نہیں ہوتا، تو کیا میں ان کے مال میں سے اپنے طور پر کچھ نکال سکتی ہوں؟ آپؐ نے فرمایا کہ ہاں نکال سکتی ہو، لیکن شرط لگادی "بالمعروف" کہ عُرف کے مطابق جتنا خرچہ بنتا ہے وہ تم نکال سکتی ہو زیادہ نہیں۔ یعنی بتائے بغیر خاوند کی جیب ٹٹول سکتی ہو۔

یہ واقعہ امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے تو اس پر باب کیا قائم کیا ہے؟ امام بخاریؒ نے یہ نہیں کہا کہ اگر خاوند خرچہ نہیں دیتا تو بیوی اس کے مال میں سے لے سکتی ہے، بلکہ یہ عنوان قائم کیا کہ مظلوم کو حق حاصل ہے کہ وہ ظالم سے اپنا حق چپکے سے وصول کرلے۔ اگر کوئی ظالم حق نہیں دے رہا تو مظلوم اس کے مال میں سے اپنا حق وصول کرسکتا ہے۔ اس عنوان کے تحت یہ واقعہ ذکر کیا ہے۔ جس کا مطلب یہ بنتا ہے کہ اپنی حیثیت کے مطابق گھر میں پورا خرچہ نہ دینے والے کو امام بخاریؒ ظالم کہہ رہے ہیں اور جس گھر میں بیوی بچوں کو پورا خرچہ نہیں ملتا وہ مظلوم ہیں۔

گھر کا خرچہ دینا خاوند کے ذمے ہیں اور گھر کے کام کاج بیوی کے ذمہ ہیں، یہ تقسیمِ کار ہے۔ بیوی اگر کاموں میں کوتاہی کرے گی تو حق تلفی ہے، خاوند خرچے میں کوتاہی کرے گا تو حق تلفی ہے۔

وراثت کی تقسیم

مالی ذمہ داریوں میں مہر اور نفقہ کے بعد تیسرا دائرہ وراثت کا ہے کہ عورت کو خاوند کے فوت ہونے کی صورت میں وراثت ملے گی۔ باپ فوت ہو تب بھی اور بعض صورتوں میں بیٹا یا بھائی فوت ہو تب بھی عورت کو وراثت ملے گی۔ وراثت کے مسائل میں یہ بات عرض کرتا ہوں کہ وراثت کے مسائل بدلتے رہتے ہیں، شرعاً نہیں بلکہ صورتاً۔ رشتہ داروں کی فہرست کے مطابق حصے طے ہوتے ہیں، اس فہرست کے بدلنے سے حصے بدلتے رہتے ہیں۔ مثلاً اگر اولاد نہیں ہے تو خاوند کی جائیداد میں بیوی کا چوتھا حصہ ہے، اور اگر اولاد ہے تو آٹھواں حصہ ملے گا۔ بیوی فوت ہو جائے اور اولاد نہ ہو تو خاوند کو اس کی آدھی جائیداد ملے گی، اولاد ہونے کی صورت میں خاوند کو چوتھا حصہ ملے گا۔ اس لیے وراثت اپنے طور پر تقسیم نہیں کرنی چاہیے بلکہ ورثاء کی فہرست بنا کر کسی ذمہ دار مفتی صاحب سے پوچھیں کہ اس صورت میں شریعت کیا کہتی ہے اور کس کا کتنا حصہ بنتا ہے؟ میں خود وراثت کے مسئلے کو ہاتھ نہیں لگایا کرتا بلکہ کہتا ہوں کہ کسی تجربہ کار اور ماہر مفتی صاحب کے پاس جاکر انہیں رشتہ داروں کی ساری فہرست دے کر پوچھا جائے تو وہ شریعت کے مطابق طے کریں گے کہ کس کا کتنا حصہ بنتا ہے۔

ہمارے ہاں وراثت کے مسئلے میں بہت کوتاہی ہوتی ہے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے دور میں یہاں عورت کو وراثت ملتی ہی نہیں تھی، انہوں نے اس پر بہت لکھا ہے۔ حضرت

تھانویؒ نے پشاور سے کلکتہ تک باقاعدہ مہم چلائی اور علماء کی ڈیوٹی لگائی کہ عورتوں کو وراثت میں حصہ دلاؤ۔ علماء لوگوں کے پاس جاتے تھے، جیسے تبلیغی جماعت والے جاتے ہیں۔ اس مسئلے کا زیادہ ہدف پنجاب ہے، ہمارے ہاں اب بھی بہن کو حصہ نہیں ملتا اور بیٹی کو وراثت نہیں ملتی۔ ہم نے وراثت نہ دینے کے کئی بہانے بنا رکھے ہیں کہ اسے جہیز دے دیا تھا اب اور کیا مانگتی ہے؟ یا اس نے تو معاف کر دیا ہے۔ یہ دو تو ہمارے پکے بہانے ہیں اور دونوں شرعاً غلط ہیں۔ عورت کا جو حصہ بنتا ہے وہ اس کا حق ہے۔ اگر عورت کو وراثت میں حصہ نہیں دیا جائے گا تو ترمذی شریف کی روایت کے مطابق حدیثِ قدسی ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ فرماتے ہیں جس نے وارثوں میں سے کسی کو دنیا میں حصہ نہیں دیا تو قیامت کے دن پہلے کٹوتی کر کے اس کو حصہ دلواؤں گا باقی حساب بعد میں کروں گا۔ میں اسے یوں بیان کیا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وراثت کا حصہ میں نے مقرر کیا ہے، تم کون ہوتے ہو نہ دینے والے، خود دے دو ورنہ میں دلوا دوں گا۔

بہرحال اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اگر نکاح کرنا ہے تو پہلے مالی ذمہ داریاں قبول کرو۔ مہر دینا پڑے گا، نفقہ کی ذمہ داری لینا پڑے گی، اور وفات کی صورت میں تیسرا دائرہ وراثت کا ہے وہ بھی عورت کو ملے گی۔ میں نے خاندانی نظام کے حوالے سے اصولی بات یہ ذکر کی ہے کہ گھر کے معاملات انتظام اور دیکھ بھال عورت کی ذمہ داری ہے جبکہ بیوی بچوں کے اخراجات خاوند کے ذمہ ہیں۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ—مارچ ۲۰۲۳ء)

معاشی مساوات کا تصور

معاشی مساوات کا معنیٰ اگر تو یہ ہے کہ ایک معاشرہ کے تمام افراد ایک ہی جیسی زندگی گزاریں اور خوراک، لباس، رہائش، ملکیت، کاروبار اور دیگر معاملات میں ان میں کسی قسم کا کوئی تفاوت اور ترجیحات نہ ہوں تو یہ قطعی طور پر ایک غیر فطری تصور ہے جو نہ صرف یہ کہ اسلام کے بنیادی اصولوں سے متصادم ہے بلکہ عملاً بھی ناممکن ہے۔ ہر انسان ذہنی صلاحیت، قوتِ کار اور وسائل سے استفادہ کی استعداد کے لحاظ سے دوسرے سے مختلف ہے۔ اور یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ اپنے چار یا پانچ لڑکوں کو ایک ایک ہزار روپے کی رقم دیں اور یہ توقع رکھیں کہ سب کے سب اس رقم کو ایک ہی مدت میں خرچ کریں گے، ایک ہی مصرف میں صرف کریں گے اور ایک ہی جیسے نتائج اور منافع حاصل کریں گے۔ یہ قطعی غیر فطری بات ہے اور اسلام میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔

البتہ اسلام پیداوار کے قومی ذرائع سے استفادہ کا ہر شہری کو یکساں حق دیتا ہے اور قومی ذرائع سے استفادہ کے باب میں ترجیحات کا قائل نہیں ہے۔ ہاں اگر کوئی شہری اس حق کو استعمال کرنے میں اپنی ذہنی صلاحیت اور قوت کار کے لحاظ سے دوسروں سے بڑھ جائے تو یہ اس کی اپنی محنت اور صلاحیت کا ثمر ہے۔

خلیفۂ اولؓ کے دور میں سرکاری مال کی تقسیم

جناب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد حضرت صدیق اکبرؓ کے دورِ خلافت میں بحرین سے بیت المال میں خاصا سامان اور دولت آئی، اس موقع پر حضرت عمرؓ نے یہ تجویز پیش کی کہ بیت المال سے وظائف اور اموال کی تقسیم میں ترجیحات قائم کی جائیں اور حضرات صحابہؓ کرام میں فضیلت کے جو درجات ہیں اس لحاظ سے تقسیم کے درجات قائم کیے جائیں۔ مثلاً بدری صحابہؓ کو سب سے زیادہ دیا جائے، پھر مہاجرینؓ کو، پھر تیسرے نمبر پر انصارؓ کو اور پھر بعد میں مسلمان ہونے والے حضراتؓ کا درجہ رکھا جائے۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ نے یہ کہہ کر اس تجویز کو مسترد کر دیا کہ فضیلت کا تعلق آخرت سے ہے، اس کا ثواب زیادہ یا کم آخرت میں ملے گا "وھذہ معاش فالأسوۃ فیہ خیر من الاثرۃ" اور یہ معیشت ہے اس میں برابری ترجیح سے بہتر ہے۔ چنانچہ حضرت صدیق اکبرؓ اپنے دورِ خلافت میں اسی اصول پر عمل کرتے رہے۔

خلیفۂ دومؓ کے دور میں سرکاری مال کی تقسیم

لیکن جب حضرت عمرؓ خلیفہ بنے تو انہوں نے اس اصول کو بدل کر اپنی تجویز کے مطابق ترجیحات کی بنیاد پر وظائف کی تقسیم کا سلسلہ شروع کر دیا اور دس سالہ دورِ خلافت میں اسی طریق کار پر عمل کیا۔ البتہ آخری سال انہوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ تجربہ سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ بیت المال سے وظائف کی تقسیم کے بارے میں حضرت ابوبکرؓ کی رائے درست تھی اس لیے آئندہ سال سے میں موجودہ طریق کار کو ترک کر کے حضرت ابوبکرؓ کے طے کردہ اصول کے مطابق برابری کی بنیاد پر وظائف کی تقسیم کا نظام قائم کروں گا۔ لیکن اس کے بعد حضرت عمرؓ کی شہادت ہوگئی اور انہیں اپنے نظام پر نظر ثانی کا موقع نہیں مل سکا۔

اجتماعی مفاد کا تقاضہ

امام ابو یوسفؒ نے "کتاب الخراج میں" یہ ساری تفصیل بیان کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ

سرکاری اور قومی ذرائع پر تمام شہریوں کا حق یکساں ہے اور اس میں ترجیحات قائم کرنا بہتر نہیں ہے۔ البتہ یہاں زیر بحث مسئلہ کا ایک اور پہلو بھی ہے جسے نظر انداز کرنا شاید قرینِ انصاف نہ ہو۔ وہ یہ کہ صدیقی دور میں بیت المال سے وظائف کی تقسیم برابری کی بنیاد پر ہوتی رہی ہے اور فاروقی دور میں ترجیح کا اصول اپنایا گیا ہے۔ اگرچہ حضرت عمرؓ نے اس سے رجوع کا زبانی اظہار فرمادیا تھا لیکن اس کے بعد بھی ترجیحی اصول پر عملدرآمد کا تسلسل قائم رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دراصل دونوں اصول موقع محل کی مناسبت سے قابلِ عمل ہیں اور حالات کو سامنے رکھتے ہوئے ان میں سے کسی بھی اصول کو اپنایا جا سکتا ہے۔ اصل بات اجتماعی مفاد کی ہے، اگر کسی وقت حالات کا تقاضا قومی ذرائع پیداوار کی برابری کی بنیاد پر تقسیم کا ہو اور اجتماعی مفاد اس میں ہو تو ایک اسلامی حکومت اس اصول کو اپنا سکتی ہے، اور کسی دور میں اگر اجتماعی حالات کا تقاضا اس کے برعکس ہو تو دوسری صورت اختیار کرنے کی گنجائش بھی موجود ہے۔

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ - مارچ ۱۹۹۰ء)

سربراہِ مملکت کا معیارِ زندگی

حاکمِ وقت کو اپنی رعیت کی نظر میں کیسا ہونا چاہیے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے طرزِ زندگی سے خود بھی اس کی مثال پیش کی اور آپؐ کے بعد اصحابِ خلافت راشدہؓ نے بھی اسی طرز کا معیار زندگی برقرار رکھا۔

نبی اکرمؐ کا معیارِ زندگی

جناب رسالت مآب نے اپنے دور کے سب سے کمزور طبقے کے برابر اپنا معیار زندگی رکھا، اس پر علماء نے اور صوفیاء نے مستقل کتابیں لکھی ہیں کہ حضورؐ کا فقر اختیاری تھا۔ رسول اللہؐ کے گھر میں کئی کئی دن تک آگ نہیں جلتی تھی، ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ خاندانِ نبوت میں ہم نے معمولی قسم کی کھجوریں تین دن مسلسل پیٹ بھر کر کھائی ہوں۔ سوال یہ ہے کہ اگر آپؐ چاہتے تو کیا زندگی کی سہولتیں حاصل نہ کر سکتے تھے؟ لیکن نبی کریمؐ نے ایک پیغمبر ہوتے ہوئے، کمانڈر انچیف ہوتے ہوئے، چیف جسٹس ہوتے ہوئے، منتظمِ اعلیٰ ہوتے ہوئے اور حاکمِ وقت ہوتے ہوئے اپنا معیارِ زندگی معاشرے کے عام طبقے کے برابر رکھا۔ آپؐ خیال فرمائیے کہ اس معاملے میں رسول اللہؐ کس قدر حساس تھے کہ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضورؐ کا ہم سب کے ساتھ ایسا معاملہ ہوتا تھا کہ کسی اور خاوند کا اپنی بیوی کے ساتھ نہ ہوتا ہوگا، حضورؐ نے خود فرمایا کہ میں اپنے گھر والوں کے معاملے میں تم سب سے بہتر ہوں۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی ازواج کے ساتھ زندگی میں ایک مرتبہ ناراضگی کا مرحلہ آیا جس کی وجہ یہ تھی کہ غزوۂ خیبر میں جب مالِ غنیمت ہاتھ آیا تو صحابہ کرامؓ کے گھروں میں خوشحالی آئی اور معاشی صورتحال میں آسانی پیدا ہوئی جس کی بدولت سے معیارِ زندگی کچھ بہتر ہوا۔ ازواجِ مطہرات نے آپس میں مشورہ کیا کہ لوگوں کے گھروں میں تو سہولتیں آئی ہیں، ہمارے گھروں میں بھی آنی چاہئیں۔ آپس میں صلاح مشورہ کر کے طے کیا کہ جب حضورؐ گھر تشریف لائیں گے تو آپس میں سب اکٹھی ہو کر حضورؐ سے بات چیت کریں گی۔ چنانچہ نبی کریمؐ ایک زوجہ محترمہ کے گھر میں آئے تو پروگرام کے مطابق سب ازواج وہاں اکٹھی ہوگئیں، انہوں نے اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کو اپنا ترجمان بنایا۔ حضرت عائشہؓ نے اپنی گفتگو اس انداز سے کی کہ یارسول اللہ! ہمارا زیادہ وقت پھٹے ہوئے کپڑے سینے سلانے میں گزر جاتا ہے اگر تھوڑی سہولت ہمیں بھی حاصل ہو جائے تو اچھی زندگی گزار سکیں گی اور اطمینان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی عبادت کر سکیں گی، باقی لوگوں کے گھروں میں اگر سہولت آئی ہے تو ہمارے گھروں میں بھی آنی چاہیے۔

رسول اللہؐ اس پر ناراض ہوگئے کہ تم لوگوں نے یہ سوال کیوں کیا، اور قرآن کریم نے اس پر وعید اتاری "یا ایھا النبی قل لازواجک ان کنتن تردن الحیوۃ الدنیا وزینتھا فتعالین امتکن واسرحکن سراحا جمیلا" (الاحزاب ۲۸) کہ اے نبی اپنی بیویوں سے کہہ دیجیے کہ اگر تمہیں دنیا کی زندگی اور اس کی آسائش منظور ہے تو آؤ میں تمہیں کچھ دے دلا کر اچھی طرح سے رخصت کر دوں۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے پیغمبر! ان سے کہہ دیجیے کہ اگر دنیا چاہیے تو اس گھر میں نہیں ملے گی یہاں تو اسی طرح گزارا کرنا ہوگا۔ ایک ریاست کے سربراہ کے طور پر یہ جناب نبی کریمؐ کا ایک اہم پہلو تھا۔ اور پھر خیال فرمائیے کہ اس کی پیروی آپؐ کے خلفاء میں کیسے ہوئی، آنحضرتؐ کے وصال کے بعد آپؐ کے جانشینوں نے اس طرز عمل کی پیروی کیسے کی؟

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا معیار زندگی

حضرت صدیق اکبرؓ اپنے ذریعۂ معاش کے لیے مدینہ کی نواحی بستیوں میں کپڑے بیچا کرتے تھے، جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ اسلام کے خلیفۂ اول منتخب ہوئے، منصبِ خلافت سنبھالنے کے بعد دوسرے دن کپڑوں کی گٹھڑی اٹھائے بازار میں جا رہے تھے کہ حضرت عمر فاروقؓ سے ملاقات ہوگئی۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ یا خلیفۃ رسول اللہ کہاں جا رہے ہیں؟ اس زمانے میں امیر المؤمنین کی اصطلاح استعمال نہیں ہوتی تھی یہ اصطلاح حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں آئی۔

حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا کہ کپڑے بیچنے جارہا ہوں، حضرت عمرؓ نے کہا کہ آپ تو خلیفۃ المسلمین ہیں اگر آپ کپڑے بیچنے نکل پڑیں گے تو مسلمانوں کے معاملات کون نمٹائے گا۔ آپ کی عدم موجودگی میں کسی ملک کا وفد آگیا کوئی مقدمہ آگیا یا کوئی ریاستی مسئلہ درپیش ہوا تو اسے کون نمٹائے گا؟ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ اگر میں مسجد میں بیٹھ گیا تو بچے کہاں سے کھائیں گے، میرا تو یہ ذریعۂ معاش ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ جناب آپ گھر تشریف لے جائیے میں اصحاب شوریٰ کو اکٹھا کرکے اس مسئلے کا حل تلاش کرتا ہوں۔ حضرت عمرؓ اصحابِ شوریٰ کے گھروں میں گئے اور سب کو مسجد نبوی میں اکٹھا کیا۔ خلافتِ راشدہ کے قیام کے بعد سب سے پہلا اجلاس اسی مسئلے پر ہوا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے مسئلہ پیش کیا کہ میں نے راستے میں خلیفۃ المسلمین کو دیکھا کہ گٹھڑی اٹھائے کپڑا بیچنے جارہے تھے، یہ بال بچے دار ہیں اگر یہ کام نہیں کریں گے تو بچے کہاں سے کھائیں گے۔ اس لیے ہمیں بیت المال سے خلیفۃ المسلمین کے لیے تنخواہ مقرر کرنی چاہیے۔

چنانچہ سب اس بات پر متفق ہوگئے کہ خلیفۃ المسلمین کے لیے بیت المال سے تنخواہ مقرر ہونی چاہیے، پھر اس بات پر بحث ہوئی کہ خلیفۃ المسلمین کی تنخواہ کتنی ہونی چاہیے؟ اس وقت کے امیر المؤمنین بیک وقت حاکمِ وقت بھی تھے، چیف جسٹس بھی تھے اور افواج کے کمانڈر بھی تھے، تمام بڑے بڑے عہدے ان کے پاس تھے۔ تنخواہ کے متعلق مختلف آراء سامنے آئیں لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی رائے پر فیصلہ ہوا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ مدینہ منورہ کے ایک عام آدمی کا تخمینہ لگایا جائے کہ اس کا خرچہ کتنا ہے اس کے مطابق خلیفۃ المسلمین کی تنخواہ مقرر کردی جائے۔ یہ وہی اصول تھا جو رسول اللہؐ نے قائم کیا تھا کہ حاکمِ وقت کا معیار زندگی عام آدمی کے برابر ہونا چاہیے۔

حضرت ابوبکرؓ کی تنخواہ کتنی مقرر ہوئی؟ اس کا اندازہ اس واقعے سے لگا لیجیے کہ تاریخ میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت صدیق اکبرؓ کی خلافت کے آخری عرصے میں عید کا وقت قریب آرہا تھا۔ زوجہ محترمہ نے عرض کیا کہ یا خلیفۃ المسلمین! عید کا دن قریب آرہا ہے عید کے دن بچوں کے لیے کچھ میٹھا پکانے کا بندوبست کرنا چاہیے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا کہ میرے پاس تو اس کی گنجائش نہیں ہے، مجھے تو بیت المال سے جو راشن ملتا ہے میں اس سے زیادہ نہیں لے سکتا اور میرا اپنا کوئی کاروبار نہیں ہے اس لیے یہ خیال رہنے ہی دو۔ اہلیہ نے کہا کہ اگر اجازت ہو تو میں اپنے طور پر انتظام کروں؟ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا، ٹھیک ہے اگر کرسکتی ہو تو کرلو۔ چنانچہ چند دنوں کے بعد عید کا دن آیا اور حضرت ابوبکرؓ تیاری کرکے عیدگاہ کی طرف جانے لگے تو دیکھا کہ اہلیہ نے میٹھا پکایا ہوا تھا۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے پوچھا یہ بندوبست کہاں سے کیا ہے ہمارے پاس تو اس کی گنجائش نہیں تھی؟ اہلیہ نے جواب دیا کہ ہمارے گھر میں بیت المال

سے راشن کا جو آٹا روزانہ آتا ہے، میں نے اس میں سے ایک مٹھی آٹا الگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ چند دنوں میں اتنا آٹا ہو گیا کہ اس میں سے آدھا آٹا بازار میں بیچ کر میں نے گڑ اور تیل منگوایا، باقی آدھا آٹا اس میں گوندھ کر حلوہ بنا لیا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے پوچھا ابھی تک کسی نے کھایا تو نہیں؟ جواب ملا نہیں ابھی کسی نے نہیں کھایا۔ فرمایا دیگچی لاؤ، آپؓ نے دیگچی منگوا کر اٹھائی اور چل دیے۔ حضرت ابوعبیدہ عامر بن الجراحؓ جو بیت المال کے انچارج تھے ان سے جا کر فرمایا کہ ابوعبیدہؓ! یہ حلوہ ابوبکر کے گھر والوں کا حق نہیں ہے بلکہ یہ مدینہ منورہ کے یتیموں اور بیواؤں کا حق ہے۔ اور سنو! آج کے بعد میرے گھر میں ایک مٹھی آٹا کم بھیجا کرنا کیونکہ ہمارا گزارا ایک مٹھی کم آٹے سے بھی ہو جاتا ہے۔

دنیا کے کس خطے کا، کس مذہب کا، کس نظام کا، کونسا حکمران ہے جو اس کی مثال پیش کر سکے؟ رسول اللہؐ اور ان کے خلفاء نے حکمرانی کا یہ معیار بتایا کہ حکمرانی برتری اور فخر کا نہیں بلکہ فریضے اور ذمہ داری کا نام ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ کا معیارِ زندگی

ایک دفعہ حضرت عمر فاروقؓ بیمار ہو گئے۔ طبیب آئے حال احوال دیکھا نبض دیکھی اور بتایا کہ انتڑیاں خشک ہو گئی ہیں کچھ دن زیتون کا تیل استعمال کریں یہی آپ کا علاج ہے۔ فرمایا میرے گھر میں تو زیتون کا تیل نہیں ہے۔ کسی نے بتایا کہ بیت المال میں زیتون کا تیل موجود ہے۔ فرمایا اچھا! بیت المال میں زیتون کا تیل ہے، ابوعبیدہؓ کو بلائیں۔ پوچھا عبیدہ بیت المال میں زیتون کا تیل ہے؟ بتایا، جی حضرت! موجود ہے۔ پوچھا کتنا ہے؟ بتایا کہ حضرت! بہت ہے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ یہ تیل مدینہ منورہ کے سب لوگوں میں تقسیم کیا جائے تو میرے حصے میں کتنا آتا ہے؟ انہوں نے بتایا کہ حضرت پھر وہ اتنی مقدار کا نہیں ہو گا کہ کھانے کے قابل ہو۔ آپؓ نے فرمایا بس اس سے زیادہ حق میرا بیت المال پر نہیں ہے۔ بیت المال کی چیز مدینہ منورہ کے لوگوں میں برابر تقسیم ہو کر جو حصہ میرے حصے میں آتا ہے بس وہی میرا حق ہے اس سے زیادہ میں نہیں لے سکتا۔ طبیب نے کہا کہ حضرت! بطور قرض لے لیں۔ پوچھا کیا تم ضمانت دیتے ہو کہ اگر میں قرض نہ ادا کر سکا تو تم ادا کرو گے؟

میں نے عرض کیا کہ خلفائے راشدین نے جناب نبی کریمؐ کی تعلیمات کے مطابق نظامِ حکومت کی ایسی مثال پیش کی کہ دنیا کا کوئی نظام اسے دہرا نہ سکا۔ یہ اللہ کے رسولؐ کی حکمت تھی کہ حاکمِ وقت عام آدمی کے معیار کے مطابق زندگی گزارے گا تو عام لوگوں کی مشکلات و مسائل سے آگاہ ہو گا اور انہیں حل کرنے کی فکر کرے گا۔

امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطابؓ کا ایک واقعہ تاریخ والے لکھتے ہیں۔ اسلامی ریاست کے قیام کے بعد دوسرے ملکوں کی طرف سے وفود کے آنے کا سلسلہ شروع ہوگیا، رواج کے مطابق ملکوں کے وفد دوسرے ملکوں میں جاتے تھے تو تحفے تحائف لے کر جایا کرتے تھے، ایک مرتبہ قیصر روم نے تحفے میں عورتوں کے استعمال کی خوشبو بھیجی جو پاؤڈر کی شکل میں تھی۔ حضرت عمر بن الخطابؓ نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا کہ اسے عورتوں میں کیسے تقسیم کیا جائے، ساتھیوں نے کہا کہ حضرت! اپنی زوجہ محترمہ کو دے دیجیے کہ وہ اسے عورتوں میں تقسیم کردیں گی۔ حضرت عمرؓ گھر تشریف لے گئے اور اہلیہ محترمہ کو بتایا کہ یہ خوشبو تحفے میں آئی ہے اسے عورتوں میں تقسیم کرنا ہے اس کے لیے ساتھیوں نے تمہارا نام تجویز کیا ہے اس لیے تم اسے تقسیم کردو لیکن پہلے مجھے بتاؤ کہ تمہاری تقسیم کا طریقہ کیا ہوگا؟ اہلیہ نے کہا کہ عورتوں کو اکٹھا کروں گی اور سب میں برابر برابر تقسیم کردوں گی۔ پوچھا اپنا حصہ کتنا رکھو گی؟ بتایا کہ جتنا دوسروں کو دوں گی اتنا ہی اپنا بھی رکھوں گی۔ فرمایا کہ خوشبو کا وہ حصہ جو تقسیم کرتے وقت ہاتھ پر لگ جائے گا وہ کس کھاتے میں جائے گا؟ اس لیے یہ خوشبو سب میں تقسیم کرو لیکن اپنا حصہ کم رکھنا۔ دنیا کا کونسا حکمران ہے جو انصاف کو اس درجے پر قائم رکھ سکے؟

(ستمبر ۱۹۹۵ء کے دوران جامعہ الہدیٰ، ٹونگھم، برطانیہ میں خطاب)

سرکاری عہدیداران کے حقوق و فرائض

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جن لوگوں کو ڈیوٹی پر مقرر فرماتے، وقتی طور پر یا مستقل طور پر، اس زمانے میں "عامل" اور "والی" کی اصطلاح استعمال ہوتی تھی، آپؐ مالیات پر، انتظامی امور میں، ڈیوٹیز پر مختلف عامل مقرر فرماتے تھے تو ان کی ضروریات کا خیال کرتے تھے، ان کی نگرانی اور احتساب بھی کرتے تھے، اور اگر ان پر غلط الزام لگایا جاتا تو ان کا دفاع بھی کرتے تھے۔ یہ تین دائرے تھے عاملین کے ساتھ حضورؐ کے معاملات کے۔ ان تینوں پر ایک ایک واقعہ عرض کرتا ہوں۔

ضروریات کا خیال

پہلا یہ کہ آپؐ عاملین کی ضروریات کا خیال کرتے، ان کا حق الخدمت ادا کرتے، اور یہ تلقین فرماتے تھے کہ جو بھی حق الخدمت بنتا ہو، لینا چاہیے۔ اس پر حضرت عمرؓ کا واقعہ ہے، بخاری شریف کی روایت کے مطابق وہ خود کہتے ہیں کہ مجھے جناب نبی کریمؐ نے ایک ڈیوٹی پر مقرر کیا کہ جاؤ یہ کام کر کے آؤ۔ میں کام پورا کر کے آیا تو حضورؐ نے مجھے اس کا وظیفہ، حق الخدمت دیا کہ تم نے ڈیوٹی کی ہے یہ تمہارا حق بنتا ہے، وصول

کرو۔ میں نے کہا مجھے ضرورت نہیں ہے۔ پھر فرمایا، وصول کرو۔ میں نے کہا مجھ سے زیادہ ضرورتمند اور لوگ بھی ہیں، کسی اور کو دے دیں۔ حضورؐ نے فرمایا لے لو۔ میں نے پھر کہا، مجھے اللہ تعالیٰ نے بہت کچھ دیا ہوا ہے، میں للہ خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا، نہیں! یہ تمہارا حق بنتا ہے "خذه فتموله" اسے وصول کر کے اپنے مال میں شامل کر لو اس کے بعد اگر چاہو تو صدقہ کر دینا۔

حضرت عمرؓ کا بھی یہی معمول تھا۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ ایک عامل نے حضرت عمرؓ کے سامنے تنخواہ لینے سے انکار کیا تو آپؓ نے اسے کہا کہ تنخواہ وصول کرو، اور اپنا مذکورہ واقعہ اسے سنایا۔

اس کی بہت سی حکمتیں ہیں:

- ایک یہ کہ جب آدمی تنخواہ لے گا تو کام ذمہ داری سے کرے گا، اور اگر مفت میں کرے گا تو ویسی ذمہ داری نہیں ہوگی۔
- دوسرے یہ کہ تنخواہ نہ لینے سے دوسروں میں یہ احساس پیدا ہوگا کہ یہ تو بغیر تنخواہ کے کام کر رہا ہے اور ہم تنخواہ لے رہے ہیں، اس لیے بھی بلا معاوضہ کام کرنا ٹھیک نہیں ہے۔

اس لیے آپؐ نے بلا تنخواہ ڈیوٹی لینے سے انکار کر دیا اور فرمایا کام کے بعد جو بھی تمہارا حق بنتا ہے، وصول کرو۔ عقبہ بن عامرؓ حضورؐ کے عمّال میں سے تھے، انہوں نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! آپ ہمیں کسی علاقے میں ڈیوٹی پر بھیجتے ہیں، ہم جاتے ہیں، ہم وہاں مہمان ہوتے ہیں، ہمارا کھانا پینا اور رہنا ان کے ذمے ہوتا ہے، لیکن اگر اس علاقے والے ہماری ضروریات کا خیال نہ کریں تو ہم کیا کریں؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا، اگر تو وہ تمہاری ضروریات کھانا رہائش وغیرہ کا انتظام کر دیں تو ٹھیک، ورنہ جو تمہارا مہمانداری کا حق بنتا ہے، تو جو تم وصول کر کے لاؤ گے اس میں سے اتنا حق بالمعروف وصول کر سکتے ہو۔ اس کو آج کی اصطلاح میں ٹی اے ڈی اے (TA&DA) کہا جاتا ہے یعنی آنے جانے کا خرچہ۔ ہمارے ہاں تو عام طور پر اس میں بہت گڑبڑ ہوتی ہے کہ ٹی اے ڈی اے بھی لے لیتے ہیں، وہاں کسی کا مہمان بھی بن جاتے ہیں، وہاں سے بھی کھاتے ہیں اور یہاں سے بھی لیتے ہیں، یہ درست نہیں ہے۔ دیکھا گیا ہے کہ سرکاری طور پر پی سی ہوٹل منظور کروا کے اس کے مطابق خرچہ لے لیا اور وہاں جا کر عام ہوٹل میں رہے، اس طرح جو بچت ہوئی وہ اپنی جیب میں ڈال لی، یہ درست نہیں ہے۔ حضورؐ نے اس کا اصول یہ طے کیا ہے کہ اگر تمہاری حیثیت کے مطابق وہ ضروریات پوری کر دیں تو پھر تم ہم سے وصول نہیں کرو گے، اگر انہوں نے انتظام نہیں کیا تو پھر تم سرکاری رقم میں سے وصول کر سکتے ہو اور وہ بھی بالمعروف، معروف طریقہ سے، جس کا معنیٰ فقہاء یہ کرتے ہیں کہ جو تمہارا عام رہن سہن کا معیار ہے اس کے مطابق لے سکتے ہو۔ یہ تو آپؐ نے ملازم، افسر، عامل کا حق قرار دیا کہ حق الخدمت بھی لے اور اگر ضروری خرچہ وہاں سے نہ ملے تو

وہ بھی وصول کرے۔

نگرانی و احتساب

دوسرے یہ کہ حضورؐ نگرانی اور احتساب کیا کرتے تھے کہ عامل وہاں سے کیا لے کر آیا ہے، اگر اسے ناجائز سمجھتے تو ضبط بھی کر لیا کرتے تھے۔ جو لوگ مالیات کے محکمے میں ہوتے تھے، قرآن نے انہیں عاملین فرمایا ہے یعنی صدقہ وصول کرنے والے۔ آج کل مالیات وصول کرنے والے دو محکموں میں تقسیم ہیں شہروں میں صنعت کاروں اور تاجروں سے ٹیکس وصول کرنے والا انکم ٹیکس آفیسر، اور دیہاتیوں سے مالیات وصول کرنے والا تحصیلدار۔ اس زمانے میں ان کو عاملین کہا جاتا تھا۔

بخاری شریف کی روایت ہے کہ جناب نبی کریمؐ نے ایک صاحب ابن اللتبیہؓ کو خیبر سے سالانہ جزیہ، زکوۃ، عشر وغیرہ لینے کے لیے بھیجا۔ خیبر بڑا زرخیز اور سرسبز علاقہ تھا۔ وہ وہاں گئے، وصولی کر کے لائے اور سامان پیش کیا۔ سامان میں کھجوریں، گندم، جو وغیرہ ہوتے تھے، نقدی کی شکل میں بہت کم ہوتا تھا، یہ عام طور پر غلہ کی صورت میں ہوتا تھا۔ انہوں نے سامان لا کر اس کی ڈھیری لگا دی کہ یہ بیت المال کے لیے وصول کر کے لایا ہوں اور ایک ڈھیری الگ رکھ دی۔ آپؐ نے پوچھا، یہ کیا؟ انہوں نے کہا، یا رسول اللہ! یہ انہوں نے مجھے ہدیے دیے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا، "ھلا جلست فی بیت امک" اپنی ماں کے گھر بیٹھے ہوئے تمہیں یہ تحفے ملتے ہیں؟ یہ تمہارا گفٹ نہیں ہے بلکہ تمہاری ڈیوٹی کی وجہ سے لوگوں نے دیا ہے، یہ تمہارا نہیں، بیت المال کا ہے۔ حضورؐ نے وہ مال ضبط فرما کر بیت المال میں جمع کرا دیا اور مسجد میں جا کر خطبہ ارشاد فرمایا کہ لوگوں کو کیا ہو گیا کہ ہماری ڈیوٹی پر جاتے ہیں اور تحفے اپنے لیے رکھ لیتے ہیں۔

اس طرح حضورؐ نے ایک اصول طے فرما دیا کہ ڈیوٹی کی وجہ سے کہ یہ افسر ہے، جو گفٹ ملیں گے تو وہ اس کے ذاتی نہیں ہیں، وہ بیت المال اور سرکاری خزانے کے ہیں۔ ہاں اگر کسی کا ذاتی دوست کچھ دے تو وہ الگ بات ہے۔ اس پر آج کی دنیا کا اصول اور عالمی قانون بھی موجود ہے، اگرچہ داخلی ماحول میں اس اصول کی پاسداری نہیں ہوتی اور سب کچھ ہڑپ ہو جاتا ہے، ضابطہ یہ ہے کہ ایک ملک کا سربراہ کسی دوسرے ملک میں جائے تو اسے وہاں سے جو گفٹ ملتے ہیں وہ اس کی ملکیت نہیں ہوتے، ملک کا حق ہوتے ہیں، وہ کتنے ہی قیمتی کیوں نہ ہوں، واپس آ کر جمع کروانے پڑتے ہیں اور رپورٹ دینا پڑتی ہے کہ مجھے یہ یہ گفٹ ملا ہے۔ اسی طرح جو گفٹ وہ لے کر جاتا ہے وہ بھی سرکاری خزانے سے لے کر جاتا ہے۔ حضورؐ ہدیہ دیتے بھی تھے، لیتے بھی تھے اور آپؐ نے یہ تلقین فرمائی ہے کہ باہر سے آنے والا وفد کچھ لے کر آئے تو صرف وصولی نہ کرو، ان کو کچھ دو بھی، بلکہ کوشش کرو کہ بہتر ہدیہ دو۔ اس سے معلوم ہوا کہ آدمی کو ڈیوٹی کی

وجہ سے جو تحفہ ملے وہ سرکاری ہے اس کا ذاتی نہیں ہے۔

حضرت عمرؓ بھی اپنے عاملین کا سخت احتساب کرتے تھے۔ ایک گورنر کو بحرین بھیجا، سال دو سال بعد گورنر صاحب واپس آئے تو بہت سا سامان بھی ساتھ لائے۔ ان سے پوچھا کہ جب تم گئے تھے خالی ہاتھ تھے اور اب آئے ہو اتنا سارا مال بھی ساتھ لائے ہو، یہ تمہارے پاس کدھر سے آیا؟ انہوں نے جواب دیا میں وہاں تجارت کرتا رہا ہوں۔ ڈیوٹی بھی کرتا تھا اور تجارت بھی کرتا تھا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا، عامل کو ڈیوٹی کے ساتھ تجارت کی اجازت نہیں ہے۔ چنانچہ جتنا جاتے وقت اس کے پاس تھا اس کو دیا اور باقی سب لے کر بیت المال میں جمع کر دیا۔

دفاع وحمایت

تیسرے یہ کہ اگر آپؐ کے عاملین میں سے کسی پر غلط الزام لگتا تو آپؐ اس کا دفاع کرتے تھے۔ حضرت خالد بن ولیدؓ بڑے جرنیل تھے۔ ایک دفعہ مدینہ منورہ میں آپؐ نے کسی کی ڈیوٹی لگائی کہ سب سے زکوٰۃ وصول کرو۔ زکوٰۃ وصول کی گئی اور رپورٹ پیش کی گئی کہ دو آدمیوں نے زکوٰۃ نہیں دی۔ ایک حضرت عباسؓ اور دوسرے خالد بن ولیدؓ نے۔ حضورؐ نے فرمایا، حضرت عباسؓ کی زکوٰۃ تو میں دے دوں گا، جتنی بنتی ہے مجھ سے لے لو۔ "انتم تظلمون خالدا" لیکن خالد پر تم ظلم کر رہے ہو، اس کے پاس کیا ہے کہ تم اس سے زکوٰۃ لینا چاہتے ہو؟ لوگوں نے کہا، یارسول اللہ! اس کے پاس تو بہت سرمایہ ہے، اتنے اتنے قیمتی ہتھیار رکھے ہوئے ہیں۔ حضرت خالدؓ بہت قیمتی ہتھیار رکھا کرتے تھے۔ آپؐ نے فرمایا، اس نے ہتھیار اور زرہیں جہاد کے لیے رکھی ہوئی ہیں، بیچنے کے لیے تو نہیں رکھی ہوئیں۔ تو اس طرح اگر آپؐ کے افسر کے خلاف کوئی ناجائز بات ہو رہی ہوتی تو حضورؐ اپنے افسر کا دفاع بھی کرتے تھے۔

اسی طرح جناب نبی کریمؐ نے اپنی زندگی میں جہاد کے لیے آخری لشکر اسامہ بن زیدؓ کی سربراہی میں تیار کیا۔ موتہ کی جنگ میں حضرت زید بن حارثہؓ، حضرت عبداللہ بن رواحہؓ اور حضرت جعفر طیارؓ شہید ہوئے تھے، اس کا بدلہ لینے کے لیے آپؐ نے لشکر تیار کیا اور عرب روایات کے مطابق حضرت زیدؓ کے بیٹے اسامہ بن زیدؓ کو کمانڈر بنایا، جو ابھی بیس اکیس سال کے نوجوان تھے۔ یہ بات لوگوں کو محسوس ہوئی کہ بڑے بڑے صحابہ لشکر میں ہیں اور اسامہ کو امیر بنا دیا۔ لوگوں کے اس اشکال پر آپؐ نے فرمایا "انکم تطعنون فی امارۃ اسامۃ" اسامہ کی امارت پر تم اعتراض کر رہے ہو، میں نے جب اس کے باپ کو امیر بنایا تھا اس وقت بھی کچھ لوگوں نے ناک چڑھائے تھے کہ ایک آزاد کردہ غلام کو بڑے بڑے صحابہ پر امیر بنا دیا ہے "واللہ انہ لخلیق بالامارۃ" اللہ کی قسم وہ بھی امارت کا اہل تھا اور یہ بھی امارت کا اہل ہے، یہ ہی

امیر رہے گا، تمہارا اعتراض غلط ہے۔

آج میں نے افسروں اور عاملوں کے متعلق تین دائرے بیان کیے کہ حضورؐ ان کے حقوق کا خیال کرتے تھے کہ ان کو تنخواہ، حق الخدمت ملنا چاہیے۔ ان کا احتساب کرتے تھے اگر وہ کوئی زائد چیز لاتے تو اسے ضبط کر لیا کرتے، اس کے ساتھ اگر کسی نے ان کے بارے میں زیادتی کی بات کی ہے تو آپؐ اس کا دفاع بھی کرتے تھے۔

(فروری ۲۰۱۸ء کے دوران الشریعہ اکادمی، ہاشمی کالونی، گوجرانوالہ میں گفتگو)

بیت المال کا نظام

اسلام کے معاشی نظام کی اساس ''بیت المال'' پر ہے جس کا بنیادی تصور یہ ہے کہ معاشرہ کے نادار، معذور، مستحق اور ضرورتمند افراد کی کفالت کا ریاستی سطح پر اہتمام کیا جائے۔

دورِ نبویؐ میں بیت المال کا آغاز

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اس کا دائرہ یہ تھا کہ زکوٰۃ، عشر، خراج اور جزیہ وغیرہ کی رقوم آنحضرتؐ کے پاس جمع ہوتی تھیں اور آپؐ ان سے ضرورتمندوں، ناداروں اور بے سہارا لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے ساتھ ساتھ مجاہدین اور بیت المال کے لیے کام کرنے والوں کو بھی وظیفے دیتے تھے۔ قرآن کریم نے اس سلسلہ میں اصولی ہدایات اور طریق کار کا ذکر کیا ہے لیکن آنحضرتؐ چونکہ خود بحیثیت ''رسول اللہ'' اتھارٹی تھے اس لیے آپؐ کا فیصلہ اور عمل ہی حتمی ہوتا تھا اور بیت المال کے لیے تفصیلی قواعد وضوابط طے کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ بیت المال کو باقاعدہ ایک ادارہ کی شکل دینے اور اس کے قواعد وضوابط طے کرنے کی نوبت حضرت عمرؓ کے دور میں آئی جبکہ حضرت ابوبکرؓ کا دورِ خلافت اس سلسلہ میں ایک ارتقائی مرحلہ تھا۔

بیت المال کی اصولی ذمہ داری کے حوالے سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی ہماری راہنمائی کرتا ہے جو بخاری شریف کی ایک روایت میں مذکور ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ جو شخص مال چھوڑ کر فوت ہو جائے تو اس کا مال اس کے وارثوں کو ملے گا اور جو شخص قرضہ کا بوجھ اور بے سہارا اولاد چھوڑ کر گیا تو ''فالیّ وعلیّ'' وہ مجھ سے رجوع کریں گے اور میری ذمہ داری میں ہوں گے۔ فقہاء کرام نے اس سے یہ اصول اخذ کیا ہے کہ سوسائٹی کے بے سہارا افراد اور بوجھ تلے دبے ہوئے لوگوں کی کفالت بیت المال کی ذمہ داری ہے اور آنحضرتؐ کے دور میں بیت المال کی رقوم اور سامان اس مد میں تقسیم ہوتے رہے ہیں۔

جناب نبی اکرمؐ نے ایک اور ارشاد گرامی میں بھی بیت المال کے اس کردار کی وضاحت فرمائی ہے جس میں زکوٰۃ کے بارے میں یہ فرمایا ہے کہ "تؤخذ من اغنیاءھم وترد الی فقراءھم" زکوٰۃ سوسائٹی کے مالدار افراد سے وصول کی جائے گی اور نادار افراد میں تقسیم کی جائے گی۔

دورِ خلافتِ راشدہ میں بیت المال کا نظم

بیت المال کے اس کردار کو باقاعدہ ادارہ اور نظام کی شکل امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں ملی اور اس کے لیے طریق کار اور قواعد وضوابط طے کیے گئے۔ البتہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کے دور خلافت کے تین اہم فیصلوں کا ذکر کرنا چاہوں گا جنہوں نے بیت المال کے نظام کا رخ متعیّن کرنے میں اہم کردار ادا کیا:

- حضرت صدیق اکبرؓ نے مانعینِ زکوٰۃ کے ساتھ جنگ کر کے سوسائٹی کے ذمہ بیت المال کے واجبات کی نوعیت واضح کی اور یہ بتایا کہ بیت المال کو اپنا نظام چلانے اور سوسائٹی کے ذمہ اپنے واجبات کی وصولی کے لیے حکومتی قوت استعمال کرنے کا حق حاصل ہے۔
- بیت المال سے خلیفۂ وقت حضرت ابوبکر صدیقؓ کے لیے وظیفہ مقرر کرتے ہوئے یہ اصول طے کیا گیا کہ انہیں سربراہ حکومت کے طور پر اتنا وظیفہ ملے گا جس سے وہ مدینہ منورہ کے متوسط شہری کے معیار پر زندگی گزار سکیں اور اپنے گھر کے اخراجات پورے کر سکیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حکمرانوں اور عام شہریوں کے معیارِ زندگی میں فرق کو اسلام جائز نہیں سمجھتا اور حکمرانوں کو عام شہریوں کی طرح زندگی گزارنے کی تلقین کرتا ہے۔
- بیت المال سے عام لوگوں کو وظیفے دینے کے بارے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کی رائے میں اختلاف تھا۔ حضرت عمرؓ انصار اور دیگر طبقات کے درمیان فضیلت کے درجات کا لحاظ کر کے وظیفوں میں فرق قائم کرنا چاہتے تھے اور "گریڈ سسٹم" کے تحت وظائف کی تقسیم کے حق میں تھے۔ مگر حضرت ابوبکر صدیقؓ کا موقف یہ تھا کہ "ھذہ معاش فالأسوۃ فیہ خیر من الأثرۃ" یہ معیشت کا باب ہے اس میں برابری کا اصول ترجیحات سے بہتر ہے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت عمرؓ کی رائے کو قبول نہیں کیا اور بیت المال سے سب لوگوں کو برابری کی بنیاد پر یکساں وظیفے دیے۔ مگر حضرت عمرؓ جب خلیفہ بنے تو انہوں نے اس طریق کار کو تبدیل کر کے اپنی رائے کے مطابق درجہ بندی کی اور درجات کے لحاظ سے وظیفوں کا الگ الگ معیار مقرر کر دیا۔ البتہ دس سال کی حکومت کے بعد جب اس درجہ بندی اور گریڈ سسٹم کے منفی

اثرات سامنے آنا شروع ہوئے تو "کتاب الخراج" میں امام ابو یوسفؒ کی درج کردہ ایک روایت کے مطابق حضرت عمرؓ نے اس کا اعتراف کیا اور فرمایا کہ ان کا خیال ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی رائے زیادہ صائب تھی اس لیے اگلے سال وہ برابری کی بنیاد پر وظائف تقسیم کریں گے، لیکن اگلے سال سے قبل ان کی شہادت ہوگئی۔

سیدنا حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے ان اساسی فیصلوں کے ذریعے ایک اسلامی حکومت کے معاشی نظام کے سلسلہ میں جو رہنمائی فرمائی تھی وہ قیامت تک امتِ مسلمہ کے لیے مشعلِ راہ ہے۔

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۱۶ مارچ ۲۰۱۲ء)

رفاہی ریاست کا تصور اور نمونہ

پہلے یہ دیکھیں کہ ریاست اور رفاہی ریاست میں کیا فرق ہوتا ہے؟ کسی بھی ملک کی حکومت اور ریاست کے تین چار بنیادی کام سمجھے جاتے ہیں:

1. سرحدوں کی حفاظت
2. ملک میں امن قائم کرنا
3. ظلم زیادتی ہو تو انصاف فراہم کرنا
4. لوگوں کو ایک دوسرے پر ظلم کرنے سے روکنا
5. اور لوگوں کو زندگی کی سہولتیں زیادہ سے زیادہ فراہم کرنا۔

یہ ریاست کا بنیادی فریضہ سمجھا جاتا ہے۔ یعنی کسی ریاست کی بنیادی ذمہ داری یہ ہوتی ہے کہ وہ سرحدوں کی حفاظت کرے تاکہ کوئی باہر سے حملہ نہ کرے، ملک کے اندر امن ہو بدامنی نہ ہو، ظلم و زیادتی اور فساد نہ ہو، لوگ ایک دوسرے پر ظلم زیادتی کریں تو مظلوم کو انصاف فراہم کیا جائے اور ظالم کو اس کے جرم کی سزا ملے جو کہ عدلیہ کا کام ہوتا ہے، ملک کی حدود میں رہنے والوں کو زندگی کی سہولیات آسانی سے فراہم ہوتی رہیں اور ان سہولیات کو حاصل کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ یہ ریاست کا عام تصور ہے۔

شہریوں کی ضروریات اور اسوۂ نبویؐ

ویلفیئر اسٹیٹ اور رفاہی ریاست کا دائرہ اس سے آگے ہے۔ ایک رفاہی ریاست اپنے شہریوں کی بنیادی ضروریات کی فراہمی کی ضمانت دیتی ہے۔ ایک ہے سہولیات فراہم کرنا کہ لوگوں کو کوئی چیز حاصل کرنے میں دقت نہ ہو، اور ایک یہ ہے کہ حکومت خود ذمہ داری اٹھائے کہ یہ سہولیات ہم فراہم کریں

گے۔ گورنمنٹ اور ریاست لوگوں کی بنیادی ضروریات کی گارنٹی دے اور ذمہ داری اٹھائے کہ ہم فراہم کریں گے، یہ رفاہی ریاست ہوتی ہے جسے ویلفیئر اسٹیٹ کہا جاتا ہے۔ دنیا میں آج بہت سی ویلفیئر اسٹیٹس موجود ہیں۔ جب پاکستان قائم ہوا تو قائداعظم محمد علی جناح مرحوم نے بھی اس کے لیے "اسلامی فلاحی ریاست" کی اصطلاح استعمال کی تھی، اللہ کرے کہ پاکستان ایسی ریاست بن جائے۔

اس حوالے سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ کیا ہے؟ اس کو دو تین دائروں میں عرض کروں گا:

مقروضوں کی مدد

پہلی بات یہ کہ بخاری شریف کی روایت ہے کہ جناب نبی کریمؐ کا ایک عرصہ یہ معمول رہا کہ کسی مسلمان کا جنازہ پڑھانے کے لیے تشریف لاتے تو پہلے پوچھتے کہ اس میت پر کسی کا قرضہ تو نہیں ہے؟ اگر جواب ملتا کہ نہیں! تو آپ جنازہ پڑھا دیتے۔ اگر جواب ملتا کہ یہ مقروض فوت ہوا ہے تو آپ کا دوسرا سوال یہ ہوتا تھا کہ کیا اس کے ترکے میں قرضے کی ادائیگی کا بندوبست موجود ہے؟ یعنی اتنا کچھ چھوڑ گیا ہے کہ قرضہ ادا ہو جائے گا؟ اگر جواب اثبات میں ملتا تو آپ جنازہ پڑھا دیتے۔ لیکن اگر جواب یہ ملتا کہ یہ مقروض فوت ہوا ہے اور اس کے ترکے میں قرضے کی ادائیگی کا بندوبست موجود نہیں ہے تو آپ اس کا جنازہ نہیں پڑھاتے تھے، بلکہ فرماتے "صلوا علی صاحبکم" کہ تم اپنے ساتھی کا جنازہ پڑھو۔ خود حضورؐ تشریف لے جاتے اور جنازہ نہ پڑھتے۔

ایک موقع پر ایک مسلمان فوت ہوا، حضورؐ جنازہ کے لیے تشریف لائے، معمول کے مطابق سوال کیا کہ اس پر قرضہ تو نہیں ہے؟ جواب ملا کہ قرضہ ہے۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ کتنا قرضہ ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ اتنا۔ آپ نے پوچھا کہ کیا اس کے ترکے میں قرض کی ادائیگی کا بندوبست ہے؟ لوگوں نے جواب دیا کہ نہیں! تو آپ نے فرمایا "صلوا علی صاحبکم" تم جنازہ پڑھو، میں جا رہا ہوں۔ حضرت ابو قتادہؓ معروف صحابی ہیں، فوت ہونے والا ان کا دوست تھا۔ وہ کھڑے ہوئے کہ یا رسول اللہ! مہربانی فرمائیں جنازہ پڑھا دیں، اس کا قرضہ میرے ذمے رہا۔ کیونکہ کسی مسلمان کے لیے اس سے بڑھ کر محرومی کیا ہو سکتی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم موجود ہیں اور جنازہ نہیں پڑھ رہے۔ کیا اس سے زیادہ محرومی کا تصور بھی ہو سکتا ہے؟ چنانچہ نبی کریمؐ نے ان کا جنازہ پڑھا دیا اور جنازے کے بعد یہ اعلان فرمایا کہ "من ترک مالا فلورثتہ" تم میں سے جو آدمی مال اور ترکہ چھوڑ کر فوت ہو تو وہ ترکہ اس کے وارثوں کو ملے گا، ہم اس کو نہیں چھیڑیں گے، لیکن "من ترک کلا او ضیاعا" جو آدمی قرضہ چھوڑ کر مرا اور ضائع ہونے والے بچے چھوڑ کر مرا جن کا کوئی سہارا نہیں ہے "فالیّ وعلیّ" تو وہ میرے پاس آئیں گے اور میرے

ذمے ہوں گے۔ اس بے سہارا خاندان کو سنبھالنا ہمارے ذمہ ہوگا۔

تاریخ میں یہ بات تو آپ کو ہر جگہ ملے گی کہ کسی اچھے آدمی کے پاس جائیں کہ میری ضرورت پوری کر دو تو وہ کر دیتا ہے۔ "الی" کی بات تو ہمیشہ سے ہوتی آرہی ہے، لیکن "علی" کہ وہ میرے ذمہ ہوں گے یہ بات تاریخ میں غالباً سب سے پہلے جناب نبی کریمؐ نے ارشاد فرمائی ہے۔ یہ گارنٹی کہ جو بے سہارا اور مقروض ہے اور کوئی بندوبست نہیں ہے اس کی ضروریات میرے ذمہ ہیں۔ میرے ذمے سے مراد ریاست کے ذمہ ہونا۔ جناب نبی کریمؐ نے یہ اعلان مبارک فرمایا اور پھر اس کا ماحول بھی بنایا۔ اس ماحول کے حوالے سے دو تین واقعات عرض کرنا چاہوں گا کہ آنحضرتؐ نے کیسا ماحول بنایا۔ بیت المال کا تصور یہ قائم ہوا کہ جس کسی کو کسی حوالے سے کسی چیز کی ضرورت پڑی اور وہ چیز نہیں مل رہی تو وہ سیدھا حضورؐ کے پاس آتا تھا اور آپ کے ہاں سے اسے وہ چیز مل جاتی تھی۔

مسافروں کی مدد

بخاری شریف کی روایت ہے کہ ایک صاحب سفر کر رہے تھے، راستے میں ان کا سواری کا اونٹ مر گیا، سفر لمبا تھا۔ ان صاحب کو پتا تھا کہ اب سواری کہاں سے ملے گی۔ وہ سیدھا مسجد نبوی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور عرض کیا یا رسول اللہ! میں سفر پر جا رہا ہوں، سفر لمبا ہے اور سواری مر گئی ہے، لہٰذا مجھے سواری عنایت فرمائیں۔ حضورؐ اس وقت خوش طبعی کے موڈ میں تھے۔ حضورؐ خود بھی خوش طبعی فرمایا کرتے تھے اور لوگ بھی حضورؐ کے ساتھ خوش طبعی کیا کرتے تھے۔ یہ ایک مستقل موضوع ہے۔ آنحضرتؐ خوش مزاج بزرگ تھے۔ آپ نے اس سے فرمایا کہ بیٹھ جاؤ تمہیں اونٹنی کا بچہ دوں گا۔ وہ آدمی سواری مانگ رہا ہے اور حضورؐ فرما رہے ہیں کہ تمہیں اونٹنی کا بچہ دوں گا۔ وہ پریشان ہو کر بیٹھ گیا کہ اونٹنی کے بچے کو میں کیا کروں گا۔ میں نے تو سفر کرنا ہے۔ اونٹنی کا بچہ مجھے اٹھائے گا یا میں اسے اٹھاؤں گا۔ وہ پریشان بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے پھر عرض کیا تو حضورؐ نے فرمایا ٹھہرو تمہیں اونٹنی کا بچہ دوں گا۔ وہ بیچارہ پھر پریشانی کے عالم میں بیٹھ گیا۔ وہ جس کیفیت میں بیٹھا ہوگا آپ اس کا اندازہ کر سکتے ہیں؟ وہ بیٹھ کر سوچ رہا تھا کہ اونٹنی کے بچے کو میں کیا کروں گا۔ تھوڑی دیر گزری کہ حضورؐ نے بیت المال سے یا کہیں سے اونٹ منگوایا اور اس کی مہار اس آدمی کو پکڑائی اور فرمایا یہ بھی کسی اونٹنی کا بچہ ہی ہے۔

جو بات میں نے عرض کی وہ یہ ہے کہ ایک آدمی کی سواری ختم ہو گئی ہے اور سفر پر جانا ہے تو اسے یہ پتا ہے سواری کہاں سے ملے گی اور پھر اسے آپؐ کے ہاں سے سواری مل گئی۔ یہ حضورؐ نے اس کا عملی کا ماحول بنایا۔

رفیق کاروں کی معاونت

ایک اور واقعہ عرض کر دیتا وہ بھی اسی طرح کا دلچسپ واقعہ ہے۔ بخاری شریف کی روایت ہے۔ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ بیان فرماتے ہیں کہ ہمارے خاندان کے کچھ لوگوں نے سفر پر جانا تھا اور سواریاں نہیں تھیں، مشورہ ہوا کہ جناب نبی کریمؐ سے عرض کیا جائے کہ تین چار اونٹ چاہئیں۔ تین چار اونٹ کوئی کم قیمت کا مال نہیں تھا۔ اس دور کا اونٹ آج کے زمانے کی پجارو سمجھیں۔ مشورہ ہوا اور حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

مجلس کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ مجلس کا ماحول دیکھا جائے، سوال کا ماحول ہو تو سوال کیا جائے ورنہ انتظار کیا جائے، جا کر سیدھی اپنی بات نہیں کر دینی چاہیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس موقع پر کسی وجہ سے غصے میں تھے۔ حضرت ابو موسیٰؓ نے جا کر سیدھا ہی سوال کر دیا کہ یا رسول اللہ! ہم نے سفر پر جانا ہے اور تین چار اونٹ چاہئیں۔ حضورؐ نے جواب میں فرمایا کہ میرے پاس اونٹ نہیں ہیں۔ انہوں نے دوبارہ سوال کیا تو حضورؐ نے پھر فرمایا کہ نہیں ہیں۔ تیسری مرتبہ سوال کیا تو حضورؐ نے فرمایا "واللہ لا احملکم شیئا"۔ خدا کی قسم! تمہیں کوئی سواری نہیں دوں گا۔ حضرت ابو موسیٰؓ کہتے ہیں کہ مجھے اندازہ ہو گیا کہ غلطی مجھ سے ہوئی ہے کہ میں نے مجلس کا ماحول نہیں دیکھا، حضورؐ کا موڈ نہیں دیکھا اور سیدھا ہی سوال کر دیا۔ لیکن اب کیا ہو سکتا تھا لہٰذا وہ واپس چلے گئے کیونکہ حضورؐ نے انکار فرما دیا تھا اور صرف انکار نہیں فرمایا، بلکہ سواری نہ دینے کی قسم اٹھالی تھی۔

حضرت ابو موسیٰؓ نے گھر جا کر رپورٹ دی کہ یوں معاملہ ہوا، غلطی میری تھی لیکن یہ ہو گیا ہے کہ حضورؐ نے انکار فرما دیا ہے اور سواری نہ دینے کی قسم اٹھالی ہے۔ آپ اپنے خاندان والوں کو ابھی یہ بات بتا ہی رہے تھے کہ پیچھے سے کسی نے ان کو آواز دی عبداللہ! رسول اللہ تمہیں بلا رہے ہیں۔ حضرت ابو موسیٰؓ کا نام عبداللہ بن قیسؓ تھا۔ کہتے ہیں کہ میں واپس گیا تو اونٹوں کی دو جوڑیاں کھڑی تھیں، حضورؐ نے فرمایا یہ لے جاؤ۔

حضرت ابو موسیٰؓ کہتے ہیں کہ دوسری غلطی مجھ سے یہ ہوئی کہ میں نے حضورؐ سے قسم کے بارے میں بات ہی نہیں کی، اونٹوں کی لگام پکڑی اور لے کر چلا گیا۔ راستے میں مجھے خیال آیا کہ یہ میں نے کیا کیا۔ حضورؐ نے تو فرمایا تھا کہ تمہیں سواری نہیں دوں گا اور آپ نے قسم اٹھالی تھی۔ اس قسم کے بارے میں حضورؐ سے کیوں نہیں پوچھا اور ایسے ہی سواریاں لے کر چل پڑا۔ حضورؐ سے پوچھ تو لینا تھا، لہٰذا میں واپس حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ نے تو فرمایا تھا کہ تمہیں سواری نہیں دوں گا اور آپ نے قسم اٹھالی تھی۔ آپ نے فرمایا ہاں قسم اٹھائی تھی۔ انہوں نے عرض کیا کہ پھر آپ نے کیوں

دے دیے؟ تو آپ نے فرمایا کہ اس وقت میرے پاس اونٹ نہیں تھے۔ یہ میں نے قیس بن سعدؓ کے باڑے سے تمہارے لیے منگوائے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ میں نے قسم اٹھالی تھی کہ تمہیں کوئی سواری نہیں دوں گا، لیکن میرا معمول یہ ہے کہ کوئی قسم اٹھالوں اور پھر دیکھوں کہ قسم کسی خیر کے کام میں رکاوٹ بن رہی ہے تو میں قسم توڑ دیتا ہوں، خیر کے کام کو نہیں چھوڑتا اور قسم کا کفارہ دے دیتا ہوں۔ جناب نبی کریمؐ نے امت کو حکم بھی یہی فرمایا ہے اور خود آپ کا معمول بھی یہی تھا۔ بہرحال حضرت ابو موسیٰؓ کے خاندان کو سواری کے لیے حضورؐ کے ہاں سے اونٹ مل گئے۔

میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ جس کی ضرورت پوری نہیں ہو رہی اس کی ضرورت بیت المال پوری کرے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں اس کا یہ ماحول تھا۔

تیسرا واقعہ بھی بخاری شریف میں ہے کہ حضرت عقبہ بن عامرؓ معروف صحابی ہیں۔ فرماتے ہیں کہ عید الاضحیٰ سے دو تین دن پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بیت المال سے بکریوں کا ایک ریوڑ دیا۔ چالیس پچاس بکریاں ہوں گی اور فرمایا کہ ابھی دو تین دن بعد قربانی والی عید آ رہی ہے، یہ بکریاں لوگوں میں تقسیم کر دو تاکہ لوگ ان کی قربانی کر لیں۔ حضرت عقبہؓ کہتے ہیں کہ میں نے وہ بکریاں لوگوں میں تقسیم کر دیں۔ ایک بکری کا بچہ بچ گیا۔ میں نے حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے بکریاں تقسیم کر دی ہیں اور میرے حصے میں یہ بکری کا بچہ بچا ہے جس کی عمر پوری نہیں ہے تو کیا میں اس کی قربانی کر لوں؟ حضورؐ نے فرمایا کہ ہاں تم کر لو۔

میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قربانی تو لوگوں پر واجب تھی مگر بکریاں بیت المال دے رہا ہے۔ حضورؐ نے ''فالیّ و علیّ'' کا یہ ماحول بنایا کہ جس کی ضرورت پوری نہیں ہو رہی اس کی ضرورت بیت المال پوری کرے گا۔ حضورؐ نے ریاست کے شہریوں کی ذمہ داری اٹھائی اور ذمہ داری پوری کرنے کا ماحول بھی بنایا۔ یہی ماحول آگے چل کر بیت المال کا نظام بنا ہے اور وہی بیت المال کا ماحول آگے چل کر رفاہی ریاست کی صورت میں سامنے آیا۔

اس ویلفیئر اسٹیٹ کے دو تین واقعات بھی عرض کر دیتا ہوں۔ ابو عبید قاسم بن سلامؒ معروف محدث، فقیہ اور معاشیات کے ماہرین میں سے گزرے ہیں اور امام ابو یوسفؒ کے معاصرین میں سے ہیں۔ انہوں نے یہ واقعات اپنی تصنیف ''کتاب الاموال'' میں نقل فرمائے ہیں۔ ان کی یہ معروف کتاب معیشت کے باب میں کلاسیکل کتابوں میں سے ہے۔

''کتاب الخراج'' اور ''کتاب الاموال''

معیشت کے باب سے دلچسپی رکھنے والے طلباء سے عرض کیا کرتا ہوں کہ عام طور پر سوال ہوتا ہے کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے؟ میں اس پر دو کتابوں کا حوالہ دیا کرتا ہوں، دونوں تیسری صدی کے بزرگوں کی تصنیفات ہیں۔

1. ایک امام ابو یوسفؒ کی ''کتاب الخراج'' جو انہوں نے خلیفہ ہارون الرشیدؒ کے کہنے پر ملک کے معاشی قانون کے طور پر لکھی تھی اور ملک میں نافذ رہی۔ ہارون الرشید نے امام ابو یوسفؒ سے کہا تھا کہ معیشت کے ضوابط اور قوانین مقرر کر دیں کہ مالیات کہاں سے وصول کرنے ہیں، کیسے خرچ کرنے ہیں اور معاشیات کا پورا سسٹم کیا ہونا چاہیے؟ اس پر انہوں نے کتاب الخراج لکھی جو عباسی دور میں نافذ العمل رہی۔
2. اور دوسری کتاب امام ابو عبید قاسم بن سلامؒ کی ''کتاب الاموال'' ہے۔

میں معیشت کے ماہرین سے کہتا ہوں کہ یہ دو کتابیں پڑھ لو جو کہ اصل عربی میں ہیں۔ ان کا اردو اور انگلش ترجمہ بھی موجود ہے۔ معیشت کا کسی بھی سطح کا ماہر یہ دو کتابیں پڑھ لے اس کے بعد اگر معیشت کے باب میں اس کا کوئی سوال رہ گیا تو مجھ سے پوچھ لے، میں اسے بتاؤں گا کہ اس کا حل کہاں ہے۔ ہماری کمزوری یہ ہے کہ ہم نے پڑھنے کا کام چھوڑ دیا ہے۔ ہم جناب نبی کریمؐ کی سیرت بھی پڑھتے ہیں تو مستشرقین سے، ولیم میور سے اور واٹ اور منٹگمری سے پڑھتے ہیں، اصل سورسز سے نہیں پڑھتے۔ ہم اپنا دین بھی مستشرقین سے پڑھتے ہیں کہ فقہ حنفی کیا ہے اور فقہ مالکی کیا ہے؟

حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں یمن کا سالانہ بجٹ

امیر المومنین حضرت عمر بن خطابؓ کے زمانے میں یمن کے گورنر حضرت معاذ بن جبلؓ تھے۔ حضرت معاذؓ حضورؐ کے زمانے میں یمن کے گورنر رہے ہیں اور حضرت عمرؓ کے دور میں بھی یمن کے گورنر تھے۔ امام ابو عبیدؒ نے کتاب الاموال میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ حضرت معاذ بن جبلؓ نے ایک سال اپنے صوبے سے زکوۃ، جزیہ، خراج اور عشر وغیرہ وصول کیا۔ جس طرح حکومت کے محکمے ریونیو لیتے ہیں، زمینداروں سے تحصیلدار وغیرہ ٹیکس وصول کرتے ہیں، اور شہریوں سے انکم ٹیکس آفیسر جو تاجروں اور صنعتکاروں سے ٹیکس وصول کرتا ہے۔ حضرت معاذؓ کو اپنے صوبے سے سال بھر کا جو ریونیو وصول ہوا۔ انہوں نے اس کا تیسرا حصہ مرکز کے کسی مطالبے کے بغیر مرکز کو بھیج دیا، حالانکہ صوبہ مرکز سے لیتا ہے، لیکن یہاں صوبہ ایک تہائی مرکز کے مطالبے کے بغیر مرکز کو بھیج رہا ہے۔

اس پر مرکز کو خوش ہونا چاہیے یا ناراض ہونا چاہیے؟ حضرت عمرؓ ناراض ہوئے اور حضرت معاذؓ کو خط لکھا۔ یہ خط بھی ریکارڈ پر موجود ہے کہ معاذ تم تو عالم آدمی ہو، تمہیں پتہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مالیات کا یہ اصول بیان فرمایا ہے "توخذ من اغنیائھم و ترد الی فقرائھم" کہ زکوٰۃ اور صدقات جس علاقے کے مالداروں سے وصول کیے جائیں اسی علاقے کے مستحقین پر تقسیم کیے جائیں۔ تم نے یہ رقم مجھے کیوں بھیجی ہے، یہ تو یمن کے لوگوں کا حق ہے؟ اس پر حضرت معاذؓ نے جواب دیا کہ اپنے صوبے کے پورے اخراجات کے بعد یہ فاضل بجٹ تھا جو بچ گیا اور میں نے آپ کو بھیج دیا۔ اس رقم کا میرے پاس کوئی مصرف نہیں اس لیے آپ کو بھیجی ہے۔ اگلے سال حضرت معاذؓ نے اپنے صوبے کا نصف ریونیو مرکز کو بھیج دیا اور ساتھ لکھا کہ یہ رقم بچ گئی ہے۔ اس سے اگلے سال دو تہائی مرکز کو بھیج دیا اور اس سے اگلے سال پورے کا پورا بجٹ مرکز کو بھیج دیا کہ اللہ کے قانون کی برکت سے اور آپ جیسے عادل حکمران کے عدل کی برکت سے آج میرے صوبے میں ایک بھی مستحق نہیں ہے جس پر خرچ کر سکوں۔ لہٰذا سارا بجٹ آپ کو بھیج رہا ہوں۔

میں یہ بتا رہا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے "فالیّ و علیّ" کا جو ماحول بنایا تھا وہ بڑھتے بڑھتے کس مقام پر پہنچا ہے۔ دوسرا واقعہ بھی حضرت عمرؓ کے زمانے کا ہے جو کہ علامہ شبلی نعمانیؒ نے "الفاروق" میں نقل کیا ہے۔ انہوں نے اس حوالے سے کئی واقعات لکھے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ حضرت عمرؓ اپنے دورِ خلافت میں رات کو چکر لگا کر دیکھا کرتے تھے کہ لوگوں کا کیا حال ہے۔ ان کو بھیس بدلنے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی، ایسے ہی جاتے تھے۔ ایک رات چکر لگا رہے تھے، ایک گھر کے سامنے سے گزرے تو اندر سے بچے کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ آپ وہاں سے گزر گئے کہ بچہ ہے اٹھا ہوگا اور رو رہا ہوگا۔ تھوڑی دیر کے بعد دوبارہ گزرے تب بھی بچہ رو رہا تھا۔ اب آپ کو پریشانی محسوس ہوئی کہ بچہ مسلسل ہو رہا ہے کوئی وجہ ہے۔ بہرحال گزر گئے۔ جب تیسری جگہ اس گھر کے پاس سے گزرے تو بچہ تب بھی رو رہا تھا۔ اب حضرت عمر وہاں کھڑے ہو گئے کہ یقیناً کوئی مسئلہ ہے۔ اس گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا، ایک شخص باہر آیا، آپ نے اس سے پوچھا کہ بچہ کیوں رو رہا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ بچہ بھوکا ہے اور ماں اسے دودھ نہیں پلا رہی اس لیے بچہ رو رہا ہے۔ آپ نے پوچھا کہ ماں بچے کو دودھ کیوں نہیں پلا رہی؟ اس نے جواب دیا کہ ماں اس لیے دودھ نہیں پلا رہی کہ وہ دودھ چھڑوانا چاہتی ہے تاکہ بچے کا وظیفہ لگ جائے۔

حضرت عمر فاروقؓ اور بچے کا وظیفہ

حضرت عمرؓ نے بیت المال سے بچوں کا وظیفہ مقرر کر رکھا تھا لیکن اس شرط پر کہ جب ماں کا دودھ

چھوڑ کر بچے کو الگ خوراک کی ضرورت ہوگی تو چونکہ گھر میں ایک فرد کا اضافہ ہوگیا ہے اور خرچہ بڑھ گیا ہے تو بچے کو وظیفہ دیا کرتے تھے۔ ہر بچے کو جوان ہونے تک وظیفہ ملا کرتا تھا۔ اس نے بتایا کہ ماں اس لیے دودھ نہیں پلا رہی کہ بچہ دودھ چھوڑے گا تو اس کو وظیفہ ملے گا۔ ماں بچے سے دودھ چھڑوا کر دوسری چیزیں کھانے کی عادت ڈالنا چاہتی ہے تاکہ اس کا وظیفہ لگ جائے۔ حضرت عمرؓ نے اس سے کہا کہ ماں سے کہو دودھ پلائے، میں ہی عمر ہوں، بچے کا وظیفہ لگ جائے گا۔ جبکہ حضرت عمرؓ نے اپنے ساتھ والے ساتھی سے کہا، جو غالباً حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ تھے، اور یہ بات حضرت عمر ہی کہہ سکتے ہیں کہ عمرؓ نے کتنے معصوم بچوں کو رلایا ہوگا۔ اے عمر! تیری اس شرط کی وجہ سے کتنے بچے روئے ہوں گے۔ اس کے بعد آپ نے مشورہ کیا اور قانون بدل دیا کہ بچہ پیدا ہوتے ہی اس کا وظیفہ جاری ہوجائے گا۔

حضرت عمرؓ اس بنیاد پر بچوں کو وظیفہ دیتے کہ خاندان میں ایک فرد کا اضافہ ہوا ہے اور بجٹ میں اضافہ ہوا ہے تو اس بجٹ کا بوجھ بیت المال برداشت کرے گا۔ آج بھی دنیا کی بہت سی ریاستوں میں چائلڈ الاؤنس دیا جاتا ہے۔ برطانیہ میں جس زمانے میں میں جایا کرتا تھا تو ۹ پونڈ فی ہفتہ ہر بچے کو وظیفہ ملا کرتا تھا۔ اب بھی وہاں ملتا ہے، ناروے میں بھی ملتا ہے اور کئی دیگر مغربی ممالک میں بھی چائلڈ الاؤنس ملتا ہے۔ برطانیہ کے چائلڈ الاؤنس پر ایک واقعہ ذکر دیتا ہوں۔ وزیر آباد کے سابق ایم این اے جسٹس افتخار چیمہ نے ایک مجلس میں یہ واقعہ بیان کیا۔ کہتے ہیں ہم کیمبرج یونیورسٹی میں لاء کر رہے تھے تو وہاں ایک عمر رسیدہ انگریز تھا، لوگ اس سے ملنے آیا کرتے تھے۔ سیانے لوگوں سے ملتے رہنا چاہیے، کوئی کام کی بات مل جاتی ہے۔ افتخار چیمہ کہتے ہیں کہ ہم نے اس کی شہرت سن رکھی تھی تو ہم تین چار پاکستانی ساتھی اس کے پاس گئے۔ اس نے پوچھا کہ کہاں سے آئے ہو۔ ہم نے بتایا پاکستان سے۔ پاکستان نیا نیا بنا تھا تو وہ ہماری بات سے بہت خوش ہوا۔ باتوں باتوں میں بچوں کو وظیفہ دینے کا ذکر چھڑ گیا۔ برطانیہ میں ویلفیئر اسٹیٹ کا پورا سسٹم ہے۔ اس انگریز نے ہم سے پوچھا کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ برطانیہ میں ویلفیئر اسٹیٹ کا جو سسٹم ہے اور بچوں، بے روزگاروں اور معذوروں کو وظیفہ ملتا ہے۔ جب یہ قانون نافذ ہوا تھا تو یہ کس نے بنایا تھا؟ ہم نے کہا ہمیں تو معلوم نہیں ہے۔ اس نے بتایا کہ پارلیمنٹ کی جس کمیٹی نے یہ قانون بنایا تھا میں اس کا چیئرمین تھا۔ پھر اس نے پوچھا کہ کیا تمہیں معلوم ہے کہ میں نے یہ سارا سسٹم کہاں سے لیا تھا؟ میں نے یہ سب جنرل عمرؓ سے لیا تھا۔ مغرب والے حضرت عمرؓ کا نام لیتے ہیں تو ان کو جنرل عمر کہتے ہیں۔ اس نے کہا کہ میں نے یہ سارا سسٹم حضرت عمرؓ سے لیا تھا۔ یہ ہے رفاہی ریاست نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ویلفیئر اسٹیٹ کا جو ماحول دیا تھا وہ چلتے چلتے یہاں تک پہنچا تھا۔

ایک بات کا اور اضافہ کر دوں کہ ناروے میں اس وقت بھی جو سوشل بینیفٹ کا سسٹم ہے اسے کہتے ہی

"عمر لاء" ہیں اور بچوں کو ملنے والے وظیفے کو عمر الاؤنس کہتے ہیں اور وہ خود اقرار کرتے ہیں کہ ہم نے یہ سب حضرت عمرؓ سے لیا ہے۔ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہماری باتیں دوسرے اپنا کر عمل کر رہے ہیں اور ہم آرام سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہم اس پر خوش ہیں کہ ہمارے بڑوں نے یہ کیا۔ بڑوں نے تو کیا تھا مگر ہمیں یہ بھی پتہ ہونا چاہیے کہ ہم نے کیا کرنا ہے؟

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے دور میں عراق کا سالانہ بجٹ

کتاب الاموال ہی کی روایت ہے کہ عمر ثانی امیر المومنین حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانے میں عراق کے گورنر عبدالحمیدؒ تھے۔ امیر المومنین کے نام ان کا خط آیا کہ ہمارے صوبے کا اس سال کا جو ریونیو وصول ہوا ہے، ضروریات پوری ہونے اور سال کا بجٹ پورا ہونے کے بعد فاضل بجٹ میں رقم بچ گئی ہے، اس کا کیا کرنا ہے؟

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے جواب لکھا کہ صوبے میں اعلان کراؤ کہ کوئی ایسا مقروض جو اپنا قرض ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہے اس کی تحقیق کر کے اس کا قرض ادا کر دو۔

انہوں نے جواب دیا کہ حضرت! یہ کام میں کر چکا ہوں، رقم اس سے زائد ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ان کو دوبارہ خط لکھا کہ جن لوگوں کی بچیوں کی شادیاں نہیں ہوئیں اور وہ شادی کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے، اس انتظار میں ہیں کہ اخراجات ہوں گے تو ان کی شادیاں کریں گے، تو ان کی شادیاں اس رقم سے کروا دو۔

گورنر صاحب کی طرف سے جواب آیا کہ حضرت! میں یہ بھی کر چکا ہوں۔

حضرت عمرؒ نے تیسرا خط لکھا کہ جن خاوندوں نے اپنی بیویوں کے مہر ادا نہیں کیے اور مہر ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں ان کے مہر ادا کر دو۔

درمیان میں ضمناً یہ بات عرض کر دوں کہ ہمارا یہ بھی المیہ ہے کہ نکاح کے وقت تو بہت زیادہ مہر مقرر کر دیتے ہیں، لیکن بعد میں جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ مہر کا شرعی اصول یہ ہے کہ مہر ایسا ہونا چاہیے جو لڑکے پر بوجھ نہ ہو اور لڑکی کے لیے عار نہ ہو۔ اس پر چند سال پہلے کا ایک واقعہ ذکر کرتا ہوں کہ گوجرانوالہ میں ایک شادی میں گیا تو جس کی شادی تھی وہ نوجوان دیہاڑی دار مزدور تھا اور مہر بہت زیادہ مقرر کر رہے تھے۔ میں نے اس کے باپ سے کہا کہ یہ کیا ظلم کر رہے ہو، یہ اتنا مہر کہاں سے ادا کرے گا؟ اس نے یہ جملہ بولا کہ مولوی صاحب! اللہ سے خیر مانگیں ہم نے کونسا مہر دینا ہے۔ یہ اکثر ذہنوں میں مغالطہ ہوتا ہے کہ مہر دینے کی نوبت تب آتی ہے جب کوئی جھگڑا ہو، طلاق کی نوبت آئے۔ میں نے اس

سے کہا کہ بھائی! مہر نکاح کا ہوتا ہے، طلاق کا نہیں ہوتا۔ جب نکاح ہو گیا تو مہر تو دینا ہی ہے۔ بلکہ فقہاء نے یہاں تک لکھا ہے کہ اگر کوئی آدمی فوت ہو گیا اور اس نے مہر ادا نہیں کیا تو اس کے ترکے میں سے سب سے پہلے قرضے کے حساب میں بیوی کو مہر ادا کیا جائے گا، اور وراثت کا حصہ علیحدہ ملے گا کیونکہ مہر بھی عورت کا حق ہے۔

بہرحال حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے گورنر صاحب کو خط لکھا کہ جن خاوندوں نے اپنی بیویوں کو مہر ادا نہیں کیے اور وہ مہر ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں تو آپ اس رقم سے ان کے مہر ادا کر دیں۔ انہوں نے جواب لکھا کہ حضرت! یہ بھی کر چکا ہوں۔

اس پر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے چوتھا خط لکھا کہ جو زمینیں قابل کاشت ہیں اور ویران پڑی ہوئی ہیں ان کی حد بندی کراؤ اور لوگوں کو زراعت کے لیے قرضہ کے طور پر دے دو۔

یہ ہے ویلفیئر اسٹیٹ کا تصور۔ یہ بات میں نے کراچی میں ایک اجتماع میں بیان کی تو ایک نوجوان کھڑا ہو گیا کہ یہ صوبے کا بجٹ تھا یا اٹلانٹک سی (سمندر) تھا کہ صوبے کے خرچے بھی پورے ہو رہے ہیں، تنخواہیں بھی پوری ہو رہی ہیں، مقروضوں کے قرضے بھی ادا ہو رہے ہیں، بے نکاحوں کی شادیاں بھی ہو رہی ہیں اور مہر بھی ادا ہو رہے ہیں؟ اس کا سوال یہ تھا کہ یہ صوبے کا بجٹ تھا یا کوئی سمندر تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ بیٹا تمہارا سوال ٹھیک ہے، لیکن ایک واقعہ اور سن لو تو اس سوال کا جواب بھی سمجھ میں آجائے گا۔

سرکاری خزانہ، آگ کا انگارہ

ایک دن حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ خلافت کے فرائض سرانجام دینے کے بعد شام کو گھر تشریف لائے تو راستے میں ریڑھی پر انگور دیکھے، جیب میں ہاتھ ڈالا تو جیب خالی تھی۔ آپؒ کی اہلیہ محترمہ فاطمہ بنت عبد الملکؒ بڑی اچھی خاتون تھیں، بادشاہ کی بیٹی تھی، بادشاہ کی بیوی تھی، بادشاہ کی بہن تھی۔ عبدالملک کی بیٹی، کمانڈر انچیف مسلمہؒ کی بہن، اور ان کا بھائی ولیدؒ بھی بعد میں بادشاہ بنا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے گھر آکر اہلیہ سے کہا کہ فاطمہ! تمہارے پاس ایک آدھ درہم ہو گا؟ ضرورت پڑ گئی ہے۔ امیر المؤمنین، دمشق کا حکمران کہ آدھی دنیا اس کے تابع ہے اور بیوی سے پوچھ رہے ہیں کہ ایک آدھ درہم ہو گا؟ بیوی نے پوچھا کیوں؟ انہوں نے بتایا کہ راستے میں ریڑھی پر انگور دیکھے ہیں، کھانے کو جی چاہتا ہے لیکن جیب میں پیسے نہیں ہیں۔ ایک آدھ درہم گھر میں ہو تو انگور لے لیں۔ اہلیہ نے کہا آپ کی جیب میں نہیں ہے تو میرے پاس کہاں سے آئے گا؟ پھر اہلیہ نے بیویوں والی بات بھی کی کہ حضرت! امیر المومنین ہیں اور ایک صاع

انگور خریدنے کے لیے آپ کے پاس پیسے نہیں ہیں؟ اتنے پیسے بھی نہیں ہیں کہ انگور خرید سکیں۔ اس پر امیر المومنین حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے تاریخی جواب دیا۔ فرمایا، فاطمہ! جس درہم کی تم بات کر رہی ہو، وہ درہم نہیں، آگ کا انگارہ ہے۔ آج کی اصطلاح میں اس کو "صوابدیدی فنڈ" کا نام دیا جاتا ہے، ہر حاکم کا صوابدیدی فنڈ ہوتا ہے، جہاں چاہے خرچ کرے۔

میں نے اس سوال کرنے والے نوجوان سے کہا بیٹا! جس ملک کا حکمران بیت المال کے درہم کو آگ کا انگارہ سمجھے گا وہاں پیسے ہی پیسے ہوں گے۔ مقروضوں کے قرضے بھی ادا ہوں گے، کنواروں کی شادیاں بھی ہوں گی، مہر بھی ادا ہوں گے اور کسانوں کو قرضے بھی ملیں گے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ملک کا حکمران سرکاری خزانے کے روپے کو آگ کا انگارہ سمجھے۔

میں نے یہ بات بیان کی ہے کہ رفاہی ریاست کیا ہوتی ہے؟ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا کیا ماحول دیا ہے؟ یہی ماحول حضرات خلفائے راشدین کے زمانے میں ویلفیئر اسٹیٹ کا معیار بنا، جسے آج تک دنیا فالو کر رہی ہے، اور ہم نے اسے چھوڑ رکھا ہے۔ پاکستان بنتے ہوئے یہ کہا گیا تھا کہ پاکستان ایک اسلامی فلاحی ریاست ہوگی، لیکن کیا ہمارے پاس وسائل کم ہیں، کیا پاکستان وسائل کے اعتبار سے غریب ملک ہے؟ نہیں! پاکستان اپنے وسائل کے اعتبار سے دنیا کے خوشحال ترین ممالک میں سے ہے۔ ہمیں اللہ کی نعمتوں کی ناشکری نہیں کرنی چاہیے، اللہ تعالیٰ نے ہمیں ہر چیز عطا کی ہوئی ہے۔ صرف دو باتوں کی ضرورت ہے۔ حکمران سرکاری مال کو آگ کا انگارا سمجھیں، اور حکومت کو یہ فکر ہو کہ مقروضوں کے قرضے ادا کرنے ہیں، کنواروں کی شادیاں کرنی ہیں، خاوندوں کے مہر ادا کرنے ہیں، کسانوں کو قرضے دینے ہیں۔ حکمرانوں کا یہ مزاج ہو جائے تو پاکستان کسی سے کم بھی نہیں ہے، صرف اس رخ پر واپس جانے کی ضرورت ہے۔

میں نے جناب نبی کریمؐ کا ارشاد گرامی ذکر کیا کہ آپ نے اعلان فرمایا تھا "من ترک مالا فلورثتہ" کہ جو آدمی مال چھوڑ کر فوت ہوا، اس کے مال کو ہم ہاتھ نہیں لگائیں گے، مال وارثوں کا ہے۔ "ومن ترک کلا او ضیاعا فالیّ وعلیّ" جو آدمی بوجھ اور قرضہ چھوڑ کر مرا یا بے سہارا خاندان چھوڑ کر مرا وہ ہمارے ذمے ہوں گے۔ اللہ کرے کہ ہم نبی کریمؐ کی سنتِ مبارکہ کے ہزاروں پہلوؤں میں سے اس ضرورت کی طرف متوجہ ہوں جو آج کی سب سے بڑی قومی ضرورت ہے۔ اور اپنی مشکلات اور مسائل کا حل امریکہ، برطانیہ اور چین سے مانگنے کے بجائے حضور نبی کریمؐ سے پوچھیں، حضرات خلفائے راشدینؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے پوچھیں۔ ان کے ہاں سے ہی اس کا حل ملے گا کیونکہ سب کچھ تاریخ کے ریکارڈ پر موجود ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں صحیح رخ پر اور جناب نبی کریمؐ کی سنتِ مبارکہ کے راستے پر آنے کی توفیق عطا

فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

(۳۰ستمبر ۲۰۲۲ء کو جمعیت اشاعت التوحید والسنۃ کے زیر اہتمام
مرکزی جامع مسجد محمدیہ، قلعہ دیدار سنگھ، گوجرانوالہ میں خطاب)

معاشی خود کفالت کی اسلامی بنیادیں

سیرتِ طیبہؐ کا سبق

غزوۂ خیبر کے بعد مال غنیمت کی کثرت ہوئی اور سرسبز و شاداب علاقے بھی مسلمانوں کی تحویل میں آئے تو مدینہ منورہ کے عام لوگوں کی زندگی میں بہتری کے آثار نمودار ہوئے اور تنگی و عسرت کے دن پھرنے لگے۔ یہ دیکھ کر جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہراتؓ نے باہم مشورہ کیا کہ رسول اللہؐ سے تقاضہ کیا جائے کہ ہمارے حالات میں بھی کچھ بہتری آنی چاہیے اور خرچ اخراجات کا معاملہ پہلے سے کچھ سہولت والا ہونا چاہیے۔ سب ازواجؓ نے مل کر جناب نبی اکرمؐ سے بات کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے لیے ام المومنین حضرت عائشہؓ کو اپنا نمائندہ اور متکلّم بنایا۔ انہوں نے بڑی حکمت اور دانشمندی کے ساتھ ازواج مطہراتؓ کی یہ درخواست حضورؐ کے گوش گزار کی لیکن پھر بھی درخواست الٹی پڑ گئی۔

رسول اللہؐ ناراض ہو گئے، اپنی بیویوں سے بول چال بند کر دی اور مسجد کے حجرہ میں گوشہ نشین ہو گئے۔ اتنے دن گزر گئے کہ شہر میں چہ مگوئیاں شروع ہو گئیں اور یہ افواہ پھیل گئی کہ رسول اللہؐ نے اپنی ازواجؓ کو طلاق دے دی ہے۔ آپؐ کی ازواج میں حضرت عمرؓ کی دختر حضرت حفصہؓ بھی تھیں، حضرت عمرؓ یہ سن کر تڑپ اٹھے اور بے چینی و اضطراب کے عالم میں اس حجرے کا رخ کیا جس میں آنحضرتؐ گوشہ نشین تھے۔ بڑی مشکل سے اندر جانے کی اجازت ملی، سامنے ہوتے ہی بے ساختہ پوچھا کہ کیا آپؐ نے اپنی بیویوں کو طلاق دے دی ہے؟ حضورؐ نے نفی میں سر ہلایا تو حضرت عمرؓ الٹے پاؤں واپس پلٹے، حجرہ سے نکل کر نعرۂ تکبیر بلند کیا اور لوگوں کو خوشخبری دی کہ طلاق والی افواہ غلط تھی۔ اس اطلاع پر لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا اور ان کے چہروں پر رونق واپس آئی۔

پھر سورۃ الاحزاب کی آیات نازل ہوئیں جن میں ازواج مطہراتؓ سے خطاب کر کے کہا گیا ہے کہ اگر وہ دنیا کی سہولت چاہتی ہیں تو وہ بھی مل سکتی ہے لیکن اس کے لیے انہیں پیغمبر خدا کا گھر چھوڑنا ہو گا۔ اور اگر وہ اسی مقدس گھر میں رہنا چاہتی ہیں تو جیسی تنگی ترشی کی زندگی پہلے سے گزارتی آ رہی ہیں اسی پر قناعت کرنا ہو گی۔ چنانچہ انہیں اختیار دے دیا گیا کہ انہیں دنیا کی سہولتوں اور رسول اللہؐ کی رفاقت میں سے ایک کا

انتخاب کرنا ہوگا کیونکہ یہ دونوں چیزیں ایک جگہ جمع نہیں ہوسکتیں۔ اس کے جواب میں سب سے پہلے ام المومنین حضرت عائشہؓ نے اور پھر باقی سب امہات المومنین نے رسول اللہؐ کی رفاقت میں رہنے کا اعلان کیا۔ اور یوں ان کا مدینہ منورہ کے عام لوگوں کی طرح کی سہولتوں کا تقاضہ بھی مسترد ہوگیا جو اسی بستی کی ان جیسی دوسری عورتوں اور انہی جیسے دوسرے گھروں کو میسر تھیں۔

سیرت کی کتابوں میں لکھا ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی فقر و فاقہ کی زندگی تھی۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضورؐ کی زندگی میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ تین دن مسلسل عام قسم کی کھجوریں بھی پیٹ بھر کر کھانے کو ملی ہوں۔ ارباب دانش کا کہنا ہے کہ یہ فقر و فاقہ اختیاری تھا۔ رسول اللہؐ اگر چاہتے تو دنیاوی سہولتیں بے دام غلام کی طرح ہاتھ باندھے ان کے دروازے پر کھڑی نظر آتیں، لیکن نبی اکرمؐ نے فقر و فاقہ اور تنگی و عسرت کا راستہ اختیار کیا جو ان کی حکمت و دانش کا خوبصورت اظہار تھا۔ اور اسی میں پوری امت کے لیے اور خاص طور پر حکمران طبقہ کے لیے سبق ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبرؐ نے یہ تعلیم دی ہے کہ حکمران اور رہنما جس قدر سادہ زندگی گزاریں گے اور عام لوگوں کے قریب رہیں گے اسی قدر انہیں عام لوگوں کے مسائل اور مشکلات سے آگاہی حاصل ہوگی اور اس سوسائٹی کی اجتماعی نفسیات پر ان کی گرفت قائم رہے گی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے اس معاملہ میں جناب نبی اکرمؐ کے اسوۂ حسنہ کو اپنانے کا بطور خاص اہتمام کیا اور انسانی تاریخ میں زندہ و جاوید ہوگئے۔

تحریکِ آزادیٔ برصغیر کے راہنما مہاتما گاندھی کی تلقین

کہا جاتا ہے کہ متحدہ ہندوستان میں انگریزی عملداری کے تحت داخلی و خود مختاری فارمولا کے مطابق جب پہلی بار انتخابات ہوئے اور چند صوبوں میں کانگریس کی وزارتیں قائم ہوگئیں تو جناب گاندھی نے اپنے وزراء کو اس بات کی تلقین کی کہ اگر وہ حکمرانی میں کسی شخصیت کو بطور آئیڈیل سامنے رکھنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سب سے پہلی شخصیات ہیں۔ یہ تاریخ کا خراج عقیدت ہے جو خلفائے راشدینؓ کے حصے میں آیا اور اس کی وجہ ان کا کوئی کروفر یا بلند و بالا محلات اور پر شکوہ ایوان نہیں تھے بلکہ سادگی، قناعت اور فقر و فاقہ کی زندگی تھی۔ اس طرز زندگی نے انہیں اپنی ہی رعیت کے عام لوگوں سے ممتاز نہیں ہونے دیا تھا اور یہی ان کی کامیابی اور فخر و امتیاز کا سب سے بڑا راز ہے۔

خلفائے راشدینؓ نے قومی خزانے کو امانت کا درجہ دیا اور اس حد تک آگے چلے گئے کہ ایک بار امیر المومنین حضرت عمرؓ بیمار ہوگئے۔ بیماری کیا تھی کہ خشک روٹی کھاتے کھاتے انتڑیوں میں خشکی اور سوزش

پیدا ہوگئی تھی۔ طبیب نے زیتون کا تیل بطور علاج تجویز کیا تو فرمایا کہ میرے پاس زیتون کا تیل استعمال کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ کسی نے کہا کہ زیتون کا تیل بیت المال میں موجود ہے اس میں سے لے لیں۔ حضرت عمرؓ نے بیت المال کے انچارج کو بلایا اور پوچھا کہ بیت المال میں زیتون کا جو تیل ہے اسے اگر مدینہ منورہ میں عام دستور کے مطابق تقسیم کیا جائے تو میرے حصے میں کتنا آئے گا؟ اس نے جواب میں جتنی مقدار بتائی وہ بہت تھوڑی تھی، طبیب نے کہا کہ اس سے کام نہیں چلے گا۔ اس پر امیر المومنین حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ اس سے زیادہ اس تیل پر میرا کوئی حق نہیں ہے۔ اور ساتھ ہی اپنے پیٹ پر ہاتھ مار کر کہا کہ ”جتنا چاہے گڑگڑاتا رہ، تجھے وہی ملے گا جو مدینہ کے عام شہریوں کو ملتا ہے“۔

یہ محض قصے کہانیاں نہیں کہ انہیں پڑھ سن کر ہم سر دھنتے رہیں اور ان بزرگوں کو خراج عقیدت پیش کر کے راہنمائی کے لیے دوسری قوموں کی لائبریریاں کھنگالنے میں لگ جائیں۔ یہ ہماری تاریخی روایات ہیں، شاندار ماضی ہے، راہنمائی کی اصل بنیادیں ہیں اور حکمت و دانش کے سرچشمے ہیں جو آج بھی ہمارے لیے مشعل راہ اور سنگ میل ہیں۔

آج ہمارے قائدین معاشی خود کفالت اور اقتصادی استحکام کا نعرہ لگا کر ملک کے نظام معیشت میں اصلاحات کی باتیں کر رہے ہیں، قناعت اور سادگی کی نوید سنائی جا رہی ہے، ایوان صدر، وزیر اعظم اور گورنر ہاؤس چھوڑنے کے اعلانات ہو رہے ہیں اور قوم کے منتخب نمائندے بجٹ اور اقتصادی اصلاحات پر بحث و تمحیص میں مصروف ہیں۔ اس لیے ان سب سے گزارش ہے کہ جی چاہتا ہے تو آؤ ہم سب مل کر چودہ سو سال پہلے کے ”زیرو پوائنٹ“ پر واپس چلے جائیں اور وہاں سے از سرِ نو انہی خطوط پر اجتماعی زندگی کا آغاز کریں کیونکہ اس کے سوا سب فریب ہے۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد۔ ۲۸ جون ۱۹۹۸ء)

سود کی حیثیت رسول اللہؐ کی نظر میں

سود کے بارے میں سپریم کورٹ آف پاکستان میں بحث جاری ہے اس مناسبت سے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چند ارشادات پیش کیے جا رہے ہیں:

1. بخاری شریف میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے کبیرہ گناہوں میں سات بڑے گناہوں کا ذکر فرمایا اور ان میں سود کا بھی ذکر کیا کہ سات بڑے گناہوں میں سود کا لین دین بھی شامل ہے۔

2. بخاری شریف میں حضرت عبد اللہؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے فرمایا کہ سود کھانے والوں، دینے والوں، سودی کاروبار کے گواہوں، اور سود کا معاملہ لکھنے والوں پر اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی ہے۔
3. مستدرک حاکم کی روایت کے مطابق حضرت ابوہریرہؓ نے فرمایا کہ چار آدمیوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرمایا ہے کہ انہیں جنت میں نہیں داخل کیا جائے گا:
(۱) شراب کا عادی (۲) سود خور (۳) یتیم کا مال کھانے والا (۴) ماں باپ کا نافرمان۔
4. ابن ماجہؒ میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا کہ سود کی برائی کے ستر درجے ہیں جس میں سب سے کم درجہ ایسا ہے جیسے کوئی شخص (معاذ اللہ) اپنی ماں سے بدکاری کا ارتکاب کرے۔
5. مستدرک حاکم میں حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے ارشاد فرمایا کہ جب کسی بستی میں زنا اور سود عام ہو جائے تو گویا اس بستی کے لوگوں نے اپنی جانوں کو اللہ تعالیٰ کے عذاب کا مستحق بنا لیا ہے۔
6. مسند احمد میں حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے اپنے سفر معراج کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ اس سفر میں اللہ تعالیٰ نے مختلف لوگوں کو ان کے جرائم پر ملنے والی سزاؤں کی کیفیات آپؐ کو دکھائیں۔ ان میں سے ایک گروہ کی کیفیت یہ بیان کی گئی ہے کہ ان لوگوں کے پیٹ اتنے بڑے بڑے تھے جیسے کمرے ہوں، ان میں سانپ دوڑتے پھرتے تھے جو باہر سے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ حضورؐ نے ساتھ والے فرشتے سے پوچھا کہ یہ لوگ کون ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ یہ سود کھانے والے لوگ ہیں جو اس عذاب کا شکار ہیں۔
7. بخاری شریف میں حضرت سمرۃ بن جندبؓ سے روایت ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے اپنا ایک خواب بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ انہیں خواب میں یہ منظر دکھایا گیا کہ خون کی نہر ہے جس کے درمیان میں ایک شخص ہے جو تیرتے ہوئے کنارے کی طرف آتا ہے اور باہر نکلنا چاہتا ہے مگر کنارے پر کھڑا ایک شخص پتھر مار کر اسے واپس نہر کے وسط میں دھکیل دیتا ہے۔ وہ پھر نکلنے کی کوشش کرتا ہے تو کنارے والا شخص دوبارہ بھاری پتھر مار کر اسے واپس دھکیل دیتا ہے اور یہ سلسلہ مسلسل جاری ہے۔ آپؐ نے فرشتوں سے دریافت کیا کہ یہ کون شخص ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ یہ سود خور ہے جسے اس صورت میں عذاب دیا جا رہا ہے۔

8. طبرانی میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ قیامت سے قبل لوگوں میں سود، زنا، اور شراب نوشی کی کثرت ہوجائے گی۔
9. مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ جب لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے بخل کرنے لگیں گے اور لوگ عینہ (سود کی ایک قسم) کا کاروبار کرنے لگیں گے اور جہاد فی سبیل اللہ ترک کردیں گے تو اللہ تعالیٰ ان پر عذاب نازل کریں گے۔ پھر وہ عذاب اس وقت تک ان سے نہیں ہٹے گا جب تک وہ دین کی طرف واپس نہیں لوٹ جائیں گے۔
10. مسلم شریف میں روایت ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے حجۃ الوداع کے موقع پر منیٰ میں جو خطبہ ارشاد فرمایا اس میں سود کی ممانعت کا اعلان کیا۔ اور ارشاد فرمایا کہ جاہلیت کے دور کا سود ختم کردیا گیا ہے، اس سے قبل جن لوگوں نے سود پر رقوم کا لین دین کر رکھا ہے وہ اصل رقم واپس کریں گے اور سود کی رقم ادا نہیں کریں گے۔ آپؐ نے فرمایا کہ سب سے پہلے سود کی جس رقم کے ختم کرنے کا میں اعلان کرتا ہوں وہ میرے چچا حضرت عباسؓ کی رقوم ہیں جو سودی کاروبار کے سلسلہ میں لوگوں کے ذمہ تھیں، وہ سب ساقط کردی گئی ہیں۔
11. مسند احمد میں حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ جناب نبی اکرمؐ نے ارشاد فرمایا کہ میری امت میں ایک وقت ایسا بھی آئے گا کہ کچھ لوگ بندروں اور خنزیروں کی شکل میں مسخ کردیے جائیں گے جس کی وجہ یہ ہوگی کہ وہ شراب پیتے ہوں گے، ریشم پہنتے ہوں گے، ناچنے گانے والیاں ان کی محفلوں میں ہوں گی، اور وہ سود کھاتے ہوں گے۔
12. مصنف ابن ابی شیبہ میں روایت ہے کہ نجران کے عیسائیوں نے جناب رسول اللہؐ کے ساتھ جب اسلامی ریاست میں غیر مسلم اقلیت کے طور پر رہنے کا معاہدہ کیا تو اس معاہدہ میں حضورؐ نے ایک شق یہ بھی لکھوائی کہ تم میں سے جس نے سود کا کاروبار کیا وہ اس ذمہ داری (معاہدہ) میں شامل نہیں ہوگا۔
13. مصنف عبدالرزاق میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا ارشاد نقل کیا گیا ہے جس میں انہوں نے فرمایا کہ اے مسلمانو! تم یہودیوں، عیسائیوں، اور مجوسیوں کے ساتھ کاروبار میں شرکت نہ کرو۔ وجہ پوچھی گئی تو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ وہ سودی کاروبار کرتے ہیں جو حلال نہیں ہے۔
14. دارقطنی میں حضرت عبداللہ بن حنظلہؓ سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہؐ نے فرمایا کہ سود کا

ایک درہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے بھی زیادہ سخت اور برا ہے۔

15. اغاثۃ اللھفان میں حافظ ابن القیمؒ نے جناب نبی اکرمؐ کا ارشاد گرامی نقل کیا ہے کہ میری امت پر ایک دور ایسا آئے گا جب لوگ تجارت کے نام پر سود کو حلال قرار دینے لگیں گے۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد-۱۱ جون ۲۰۰۲ء)

سود کی برائی اور استحصال

سود کی بنیاد ہی استحصال پر ہے جس کے ذریعہ ایک مجبور شخص کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اس کی رقم کسی معاوضے اور محنت کے بغیر محض سرمائے کی بنیاد پر ہتھیالی جاتی ہے۔ اور سودی نظام کا خاصہ یہ ہے کہ وہ سوسائٹی کے متوسط اور عام طبقوں کی رقوم کو جمع کر کے اسے ایک طبقہ کے ہاتھ میں دے دیتا ہے جس سے معاشرہ پر اس طبقہ کی بالادستی اور گرفت قائم ہو جاتی ہے اور وہ سوسائٹی کو اپنے مفادات اور خواہشات کے مطابق چلانے کی پوزیشن میں آجاتا ہے۔ اسی لیے تمام آسمانی شریعتوں میں سود کی ممانعت موجود ہے اور وحیٔ الٰہی نے کسی دور میں بھی انسانی معاشرہ میں سودی کاروبار کو گوارا نہیں کیا۔

قرآن کریم نے سودی کاروبار پر اصرار کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کے خلاف اعلانِ جنگ سے تعبیر کیا ہے۔ صحیح مسلم کی روایت کے مطابق جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سود دینے والے، لینے والے، لکھنے والے، اور اس کے بارے میں گواہی دینے والے سب افراد کو لعنت کا مستحق قرار دے کر سود کے پورے نظام کو ملعون ٹھہرایا ہے۔ اس لیے اسلام میں کسی بھی درجے میں اس کی گنجائش نہیں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد سے ملک بھر کے دینی حلقوں کا سب سے زیادہ زور اس بات پر رہا ہے کہ ملک سے سودی نظام جلد از جلد ختم کیا جائے تاکہ مروّجہ ملعون اور منحوس معاشی نظام سے ملک کو نجات حاصل ہو۔

دورِ جاہلیت میں سود کی حیثیت

سود کے برا نظام ہونے کا تصور اس دور میں بھی موجود تھا جب عرب معاشرہ میں سودی نظام لوگوں کے رگ وپے میں سرایت کیے ہوئے تھا۔ اور اس سے چھٹکارے کو اس قدر مشکل سمجھا جاتا تھا کہ طائف کے شہریوں نے جناب رسول اللہؐ کی خدمت میں اسلام قبول کرنے کے لیے وفد بھیجا تو قبول اسلام کی شرائط میں اس بات کو شامل کیا کہ ہمارے کاروبار کی بنیاد ہی سود پر ہے اس لیے ہم سود کو کسی حال میں نہیں چھوڑ سکتے۔ مگر آنحضرتؐ نے ان کی یہ شرط قبول کرنے سے انکار فرما دیا تھا۔ اس دور میں بھی سود کو

بطور نظام اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا جیسا کہ معروف محقق ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے اپنی کتاب ''محمد رسول اللہ'' میں روایت بیان کی ہے کہ جناب رسول اللہؐ کی بعثت سے قبل جب کعبۃ اللہ کو آگ لگ جانے کے باعث اس کی دوبارہ تعمیر کی گئی تو قریشِ مکہ کے سرداروں کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ بیت اللہ کی تعمیر کے لیے صرف حلال کی کمائی سے چندہ دیا جائے اور حرام کی کمائی کا کوئی پیسہ اللہ تعالیٰ کے اس پاک گھر کی تعمیر پر نہ لگایا جائے۔ حتیٰ کہ پورے مکہ مکرمہ سے حلال کمائی کا اتنا چندہ جمع نہ ہو سکا کہ پورے بیت اللہ پر چھت ڈالا جا سکے چنانچہ مجبوراً حطیم کا حصہ چھت سے باہر چھوڑ کر باقی حصے پر چھت ڈالا گیا۔ اس موقع پر جس کمائی کو ناپاک اور حرام کی کمائی قرار دے کر اسے بیت اللہ کی تعمیر میں نہ لگانے کا اعلان کیا گیا اس میں سود کی رقم اور طوائف کی کمائی بھی شامل ہے۔

حجۃ الوداع پر سود کی حرمت کا اعلان

جناب نبی اکرمؐ نے سود کی حرمت کا اعلان حجۃ الوداع کے موقع پر اپنے تاریخی خطبہ میں کیا تھا۔ اور لوگوں کو آئندہ سودی کاروبار اور سود کی رقوم کی وصولی سے منع کرتے ہوئے سب سے پہلے جن سودی رقوم کو ختم کرنے کا اعلان فرمایا وہ خود حضورؐ کے چچا محترم حضرت عباس بن عبد المطلبؓ کی رقوم تھیں جو سود کا کاروبار کرتے تھے۔ مگر آپؐ نے اپنے پہلے اعلان میں ہی واضح کر دیا کہ حضرت عباسؓ کی رقوم جن لوگوں کے ذمہ ہیں وہ صرف اصل رقم واپس کریں، ان رقوم پر سود ختم کیا جاتا ہے۔

سود کی یہ حیثیت تو شرعی ہے کہ قرآن و سنت کی ہدایات کی روشنی میں کسی مسلمان ملک اور سوسائٹی میں سودی کاروبار کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن اس سے قطع نظر آج کے عالمی حالات کے تناظر میں صورتحال کا جائزہ لیا جائے تو بھی حالات کا رخ اس طرف دکھائی دیتا ہے کہ سودی نظام کے خاتمہ کے بغیر عالمِ اسلام کی گردن کو یہودی سرمایہ داروں کے شکنجے سے نجات دلانے کی اور کوئی صورت ممکن نہیں ہے۔

عالمِ اسلام اور سودی شکنجہ

کیونکہ یہودی سرمایہ کاروں نے بین الاقوامی مالیاتی اداروں کے ذریعہ عالمِ اسلام کے گرد جو اقتصادی شکنجہ قائم کر رکھا ہے اس کے نتیجہ میں معروف بھارتی دانشور جناب اسرار عالم کے بقول

> ''جنگ خلیج کے بعد سعودی عرب کی مالی صورتحال نہایت متزلزل ہو گئی ہے۔ گزشتہ سال سعودی عرب نے تقریباً تین سو بلین ڈالر قرض لیے ہیں، ہر چند کہ حکومتِ سعودیہ کا کہنا ہے کہ یہ سارے قرضے بیرونی نہیں بلکہ اندرونی ہیں۔ تاہم بیس تا تیس بلین سالانہ

آمدنی کے ملک کے لیے یہ قرض اسے (اگر موجودہ صورتحال برقرار رہی تو) پچاس سال سے زیادہ عرصے تک مقروض رکھے گا۔

ترکی میں قائم او آئی سی کی مالیاتی کمیٹی کے جاری کردہ اعداد و شمار کے مطابق مسلم ملکوں پر بیرونی قرض کا بوجھ بیش از بیش ہوتا جارہا ہے۔ پوری دنیا پر جو بیرونی قرض واجب ہے اس کا تیس فیصد تنہا مسلم ممالک پر ہے۔

گزشتہ دنوں قرض کی بروقت ادائیگی نہ کرنے کی پاداش میں آئی ایم ایف نے سوڈان کی رکنیت معطل کردی ہے۔ آئی ایم ایف کے مطابق بہت دنوں سے قرض ادا نہ کرسکنے والے ملکوں میں چار مسلم ممالک ہیں (۱) سیرالیون (۲) لائبیریا (۳) صومالیہ (۴) سوڈان۔

جنگِ خلیج کے بعد مسلم ملکوں کی قوت مدافعت بالکل ٹوٹ چکی ہے اور یہودی سرکاری و غیر سرکاری مالیاتی اداروں کے دباؤ کے سبب انہیں مجبور ہوکر پرائیویٹائزیشن کو قبول کرنا پڑرہا ہے جو دراصل ملک کے تمام معاشی کاروبار کو یہودی بنکاروں، ملٹی نیشنل کارپوریشنوں اور منی مارکیٹ و ڈسکاؤنٹ مارکیٹ کی براہ راست تحویل میں دینے کے مترادف ہے۔ چنانچہ عنقریب تمام مسلم ملکوں میں تمام معاشی کاروبار یہودیوں کے ہاتھوں میں چلے جانے والے ہیں اور وہ اجرتوں کی اجارہ داری قائم کرنے والے ہیں۔ یعنی خرید و فروخت کے دونوں بازاروں میں ان کی Monopoly اور Monopsony قائم ہوجائے گی جس کا انجام یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تمام مسلم ملکوں کی ساری عوام غلام اور بندھوا مزدوروں کی طرح ہوجائے۔" (بحوالہ عالم اسلام کی اقتصادی صورتحال۔ مطبوعہ دارالعلم نئی دہلی)

ہماری صورتحال عالمی سودی نظام کی پیداکردہ ہے اور یہودی ساہوکاروں نے جس مقصد کے لیے یہ نظام تشکیل دیا تھا یہ اس کا نقطۂ عروج ہے جو بتدریج اپنے درجۂ تکمیل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اب یہ فیصلہ کرنا عالمِ اسلام اور مسلم حکومتوں کا کام ہے کہ مروجہ عالمی معاشی نظام کے نیٹ ورک کے اندر رہتے ہوئے اپنے گرد معاشی غلامی کے اس خوفناک شکنجے کا حصار خود اپنے ہاتھوں تنگ کرتے چلے جانا ہے یا اس منحوس و ملعون اور استحصالی نظام کو کلیتاً مسترد کرکے اس طلسم ہوشربا سے نجات حاصل کرنی ہے۔ ہمارے خیال میں سود اور اس کے نظام سے نجات ہمارا صرف دینی مسئلہ نہیں بلکہ معیشت و اقتصاد کے حوالہ سے ملتِ اسلامیہ کی آج کی سب سے بڑی ضرورت ہے اور یہودی ساہوکاروں کے آہنی شکنجے سے چھٹکارا حاصل کرنے کا واحد ذریعہ بھی ہے۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد-۲ جنوری ۲۰۰۰ء)

سود اور نفع کا تقابلی جائزہ

قرآن مجید سود اور منافع کا تقابل نہیں کرتا بلکہ قرآن مجید نے سود کا تقابل صدقہ سے کیا ہے (جبکہ) منافع کا تقابل قرآن پاک نے ماپ تول میں کمی اور تجارتی بد دیانتی سے کیا ہے، میں اس پر چند آیات کا حوالہ دینا چاہوں گا۔

قرآن میں ایک جگہ فرمایا گیا ہے کہ "یمحق اللہ الربا و یربی الصدقات" (البقرہ ۲۷۶) اللہ تعالیٰ سود سے بے برکتی بڑھاتے ہیں اور صدقہ سے برکت بڑھاتے ہیں۔ یہاں سود اور صدقے کا باہمی تقابل کیا ہے کہ سود سے برکت اٹھ جاتی ہے اور صدقہ سے برکت بڑھ جاتی ہے۔ میں اس کی چھوٹی سی مثال دوں گا۔ دیکھیے بظاہر ایسا ہے کہ سود سے رقم بڑھتی ہے اور صدقہ سے کم ہوتی ہے۔ اگر سود کی شرح دس فیصد ہے تو سو سے ایک سو دس ہو جائیں گے، اور صدقہ سے کم از کم اڑھائی فیصد تو کمی ہوتی ہے، لہٰذا سو سے ساڑھے ستانوے رہ جائیں گے۔ تو ظاہری منظر یہ ہے کہ سود سے رقم بڑھتی ہے اور صدقے سے کم ہوتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے بلکہ سود سے رقم کم ہوتی ہے اور صدقہ سے بڑھتی ہے۔ یہ قرآن مجید کا واضح اور دوٹوک ارشاد ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں مال کی گنتی اور اس کی قدر

اس پر اشارہ کے طور پر یہ بات عرض کرنا چاہوں گا کہ ایک ہے گنتی اور ایک ہے ویلیو۔ گنتی اور چیز ہے، ویلیو اور چیز ہے۔ سود سے گنتی بڑھتی ہے، ویلیو کم ہوتی ہے۔ جبکہ صدقہ سے ویلیو بڑھتی ہے، گنتی کم ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیں کہ میری شادی ۱۹۷۰ء میں ہوئی تھی، میں نے تھوڑا سا زیور بنوایا اور گوجرانوالہ کے صرافہ بازار سے ایک سو ستر روپے تولہ سونا خریدا تھا، لیکن آج ایک تولہ سونے کا بھاؤ سوا دو لاکھ ہے۔ گنتی ایک سو ستر سے سوا دو لاکھ تک چلی گئی ہے، جبکہ ویلیو وہی ایک تولہ سونا ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی دیکھ لیں کہ ویلیو کا بڑھنا یا کم ہونا اس آدمی کے اختیار میں نہیں ہے جس کی جیب میں رقم ہے، بلکہ اس کا اختیار کسی اور قوت کے پاس ہے۔ کچھ قوتیں ہیں جو ویلیو کو کم زیادہ کرتی رہتی ہیں۔ مثلاً میری جیب میں پانچ ہزار کا نوٹ ہے، اس کا کنٹرول کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔ یہ پانچ ہزار کل سات ہزار ہو جائے یا تین ہزار رہ جائے، اس میں میرا کوئی اختیار نہیں ہے۔ اسی طرح مال میں برکت پیدا کرنا یا بے برکتی ڈالنا اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے اور اللہ تعالیٰ نے یہ اصول بیان فرمایا کہ "یمحق اللہ الربا و یربی الصدقات"

(البقرہ ۲۷۶) اللہ تعالیٰ سود سے رقم میں بے برکتی پیدا کرتے ہیں اور صدقہ سے برکت پیدا کرتے ہیں۔ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے اسے زیادہ وسیع انداز میں بیان فرمایا ہے "وما اٰتیتم من ربا لیربو فی اموال الناس فلا یربوا عنداللہ وما اٰتیتم من زکوٰۃ تریدون وجہ اللہ فاولئک ھم المضعفون" (الروم ۳۹) کہ جو تم سود لیتے ہو اس نیت سے کہ رقم بڑھے گی، اللہ کے نزدیک نہیں بڑھتی، اور جو تم اللہ کی رضا کے لیے زکوٰۃ دیتے ہو در حقیقت وہ بڑھتی ہے۔ یہاں بھی اللہ رب العزت نے سود کا نفع سے تقابل نہیں کیا، بلکہ سود کا تقابل صدقہ اور زکوٰۃ سے کیا ہے۔

البتہ قرآن مجید میں ایک مقام پر نفع سے تقابل بھی کیا ہے جو تجارتی بد دیانتی اور ماپ تول میں کمی کے ساتھ ہے۔ لیکن یہ بات کہنے سے پہلے ایک بات عرض کروں گا کہ انبیاء کرام علیہم الصلوات والتسلیمات دنیا میں مخلوق کو اللہ تعالیٰ سے جوڑنے اور اس کی اصلاح کے لیے تشریف لائے ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ قومی، معاشرتی اور سماجی مسائل بھی انبیاء کرام علیہم الصلوات والتسلیمات کے ایجنڈا کا حصہ رہے ہیں ..... چنانچہ اللہ رب العزت نے حضرت شعیب علیہ السلام کی زبان سے فرمایا "بقیت اللہ خیر لکم کنتم مؤمنین" (ہود ۸۶) جو تم ڈنڈی مار کر کماتے ہو اس کی بجائے وہ منافع جو اللہ دیتا ہے وہ بہتر ہے۔ ماپ تول میں کمی کر کے پیسے کمانے سے دیانت کے ساتھ مال سے ملنے والا منافع بہتر ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ نے ماپ تول میں کمی اور تجارتی بد دیانتی کا منافع سے تقابل کیا ہے کہ اللہ کا دیا ہوا منافع بہتر ہے۔

دولت کی گردش اور امام غزالیؒ کی مثال

میں نے عرض کیا کہ اللہ رب العزت سود کو منافع کے مقابلے میں بیان نہیں کرتے، بلکہ صدقہ و خیرات کے مقابلے میں بیان کرتے ہیں۔ اسے اگر آج ہم سوسائٹی کے اجتماعی مسائل کے حوالے سے دیکھیں تو قرآن مجید نے دولت اور مال کا یہ بنیادی اصول بیان کیا ہے کہ "کی لا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم" (الحشر ۷) دولت کو اوپر اوپر مالداروں میں نہیں گھومتے رہنا چاہیے بلکہ دولت کی گردش نیچے آنی چاہیے تاکہ سارا معاشرہ دولت سے اپنی اپنی ضرورت کے مطابق فیضیاب ہو۔

امام غزالیؒ نے اس پر بڑی مزے کی مثال دی ہے۔ کہتے ہیں کہ معاشرہ میں دولت کی مثال ایسے ہے جیسے جسم میں خون ہوتا ہے۔ خون پورے جسم میں حرکت کرے گا، ہر جگہ ضرورت کے مطابق پہنچے گا تو جسم کا نظام ٹھیک رہے گا۔ اگر خون ہر عضو تک ضرورت کے مطابق نہیں پہنچے گا تو وہ عضو مفلوج ہو جائے گا۔ اور اگر خون ضرورت سے زیادہ پہنچ گیا تو وہاں پھوڑے پھنسیاں بن جائیں گی۔ ایسے ہی دولت کی گردش ہے کہ معاشرے کے ہر طبقے تک دولت کی گردش صحیح طور پہ پہنچنی چاہیے۔ ایسا سسٹم ہو کہ

معاشرے کے ہر فرد اور ہر طبقے کی ضرورت پوری ہوتی رہے۔ اگر ضرورت پوری ہوتی رہے گی تو نظام ٹھیک چلے گا۔ جہاں دولت نہیں پہنچے گی تو وہاں کفر پیدا ہوگا اور جہاں دولت ضرورت سے زیادہ پہنچے گی وہاں عیاشی پیدا ہوگی.....

میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ دولت اوپر سے نیچے گردش کرنی چاہیے۔ اس تناظر میں عرض کرتا ہوں کہ سود کے نظام سے گردش نیچے سے اوپر چلی جاتی ہے، جبکہ زکوٰۃ اور صدقات کے نظام سے دولت کی گردش نیچے آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ غریبوں سے سود لے کر اغنیاء کی تجوریاں مت بھرو، بلکہ امیروں سے لے کر غریبوں کو دو۔ صدقات اور زکوٰۃ سے دولت کی گردش اوپر سے نیچے ہوگی جس سے تقسیم صحیح ہو جائے گی۔ اللہ رب العزت نے یہاں تک فرمایا ہے کہ "یا ایھا الذین امنوا اتقوا اللہ وذروا ما بقی من الربا ان کنتم مؤمنین" (البقرہ ۲۷۸) اے اہلِ ایمان! اللہ سے ڈرو اور سود کھانا چھوڑ دو۔ "فان لم تفعلوا فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ" (البقرہ ۲۷۹) اگر سود نہیں چھوڑو گے تو اللہ اور رسول کی طرف سے اعلانِ جنگ ہے۔

(ماخوذ از خطاب بمقام ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن گوجرانوالہ بتاریخ ۳۰ مارچ ۲۰۲۴ء)

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ضابطہ

آج عید کا دن ہے، عید خوشی کو کہتے ہیں اور آج دنیا بھر کے مسلمان اس بات پر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں خوشی اور تشکر کا اظہار کر رہے ہیں کہ رمضان المبارک کا رحمتوں اور برکتوں والا مہینہ نصیب ہوا اور اس میں ہر مسلمان کو اپنے ذوق اور توفیق کے مطابق اللہ تعالیٰ کی بندگی اور نیک اعمال کا موقع ملا۔ روزہ، قرآن کریم کا سننا سنانا، صدقہ خیرات اور نوافل کی توفیق ہوئی، اس خوشی میں مسلمان بارگاہ ایزدی میں سجدہ ریز ہیں اور تشکر و امتنان کا اظہار کر رہے ہیں۔

شکر گزاری اور ناشکری کا عمومی ضابطہ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے کہ وہ شکر گزاری پر نعمتوں میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ قرآن کریم میں سورۃ ابراہیم کی آیت ۷ میں ارشاد خداوندی ہے کہ:

"اگر تم میری نعمتوں پر شکر ادا کرو گے تو میں تمہیں مزید دوں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بہت سخت ہے۔"

یعنی جس طرح شکر گزاری پر نعمتوں میں اضافہ ہوتا ہے اسی طرح ناشکری پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے

سخت عذاب اور سزا بھی دی جاتی ہے۔

خود مانگی ہوئی نعمتوں کی ناشکری کا ضابطہ

اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ایک اور ضابطہ بھی بیان فرمایا ہے کہ جو نعمتیں خود انسانوں کی فرمائش پر انہیں دی جاتی ہیں، ان کی ناشکری پر عذاب بھی سب سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ میں نے آج خطبہ کے بعد سورۃ المائدۃ کی جو آیات کریمہ (۱۱۲ تا ۱۱۵) آپ کے سامنے تلاوت کی ہیں ان میں اللہ رب العزت نے اسی ضابطہ اور قانون کی وضاحت کی ہے اور ایک تاریخی واقعہ کا تذکرہ کیا ہے، سورۃ المائدۃ اسی واقعہ سے منسوب ہے۔

"مائدہ" دستر خوان کو کہتے ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں بنی اسرائیل کے لیے آسمان سے تیار کھانوں کا خوان اترنے کا واقعہ اس سورت میں بیان ہوا ہے جس کی وجہ سے اس سورت کو "المائدۃ" کہا جاتا ہے، وہ واقعہ انہی آیات میں ہے جو میں نے آپ کے سامنے پڑھی ہیں اور ان کا مفہوم یہ ہے کہ:

> "اور جب حواریوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ کیا آپ کا رب اس کی طاقت رکھتا ہے کہ ہم پر آسمان سے خوان اتارے؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اگر تم ایمان رکھتے ہو۔ حواریوں نے کہا کہ ہم یہ ارادہ کرتے ہیں کہ ہم اس میں سے کھائیں گے جس سے ہمارے دلوں کو اطمینان نصیب ہوگا اور ہم یہ جان لیں گے کہ آپ نے ہم سے سچ کہا اور ہم اس پر گواہ ہو جائیں گے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دعا کی کہ یا اللہ ہم پر خوان اتار دے۔ وہ ہمارے پہلوں اور پچھلوں کے لیے عید ہوگی اور آپ کی قدرت کی نشانی ہوگی، آپ ہمیں رزق عطا فرمادیں کیونکہ آپ بہترین رزق دینے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تم پر خوان اتار دوں گا مگر اس کے بعد تم میں سے جس نے ناشکری کی تو میں اسے ایسا عذاب دوں گا کہ وہ عذاب اس کائنات میں اور کسی کو نہیں دوں گا۔"

یعنی جس نعمت کی فرمائش کی جا رہی ہے اس کے ملنے کے بعد بھی اگر ناشکری کی گئی تو اس پر خدا کا عذاب بہت زیادہ سخت اور بے مثال ہوگا اور اس کی سنگینی اور شدت دوسرے عذابوں سے کہیں زیادہ ہوگی۔

ان آیات کے ضمن میں امام ابن جریر طبریؒ نے "تفسیر طبری" میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ

عنہما سے اور حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے "تفسیر مظہری" میں حکیم ترمذیؒ کی "نوادر الاصول" کے حوالہ سے حضرت سلمان فارسیؓ کی تفصیلی روایات نقل کی ہیں، ان دونوں کو سامنے رکھ کر واقعہ کی تھوڑی سی تفصیل آپ کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔

ان روایات کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے پیروکاروں کو جب روزہ رکھنے کی تلقین کی اور فرمایا کہ اگر تم ایک ماہ کے روزے رکھو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری دعا کو قبول کریں گے۔ چنانچہ بنی اسرائیل نے ایک ماہ مسلسل روزے رکھے اور جب تیس روزے مکمل ہوگئے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ان کے حواریوں نے عرض کیا کہ ہمارے ہاں رواج ہے کہ جب ہم ایک ماہ تک کسی کے ہاں مزدوری اور کام کرتے ہیں تو وہ ہمیں اپنی طرف سے کھانا کھلاتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ سے درخواست کریں کہ وہ ہمارے لیے آسمان سے تیار کھانوں کا خوان اتارے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پہلے تو انہیں تنبیہ کی کہ خدا سے ڈرو، اس قسم کے سوالات مناسب نہیں لیکن جب وہ اپنے سوال پر قائم رہے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے خوان اتارنے کی درخواست کردی جس پر اللہ رب العزت نے خوان اتارنے کا وعدہ کرلیا اور ساتھ ہی فرمایا کہ اگر اس کے بعد بھی ناشکری کی تو پھر میرا عذاب ایسا ہوگا کہ اس کی مثال پوری کائنات میں نہیں ہوگی۔

چنانچہ آسمان سے تیار کھانوں کا دسترخوان اترا بلکہ مسلسل چالیس دن تک اترتا رہا اور بنی اسرائیل سب کے سب روزانہ اس سے کھاتے رہے۔ چالیس دن کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش شروع ہوئی اور حکم ہوا کہ آج کے بعد یہ خوان غریب اور مستحق لوگوں کے لیے ہوگا اور امیر اور صاحبِ استطاعت افراد کو اس سے کھانے کی اجازت نہیں ہوگی۔ اس سے قبل یہ شرط بھی لگائی گئی تھی کہ دسترخوان پر بیٹھ کر جتنا کھا سکتے ہو کھاؤ مگر ساتھ لے جانے اور ذخیرہ کرنے کی اجازت نہیں ہے، اور دسترخوان سے کوئی چیز اٹھا کر لے جانے کو خیانت شمار کیا جائے گا۔ مگر امیر لوگ اور صاحبِ استطاعت افراد ان شرائط کی پابندی نہ کرسکے اور طرح طرح کے حیلے نکال کر خلاف ورزی شروع کردی جس کی وجہ سے یہ خوان اترنا بند ہوگیا اور خلاف ورزی کرنے والے سینکڑوں افراد کو یہ عذاب ہوا کہ رات کو بے فکری کے ساتھ اپنے بستروں پر محوِ خواب تھے کہ ان کی شکلیں بدل گئیں اور انہیں خنزیروں کی شکل میں مسخ کردیا گیا۔ صبح اٹھے تو عجیب صورتحال تھی۔ دھڑ اور جسم انسانوں کے تھے مگر چہرے اور شکلیں خنزیروں کی بن چکی تھیں۔ بنی اسرائیل میں کہرام مچ گیا، سب لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے گرد جمع ہوکر آہ و زاری کرنے لگے۔ وہ سینکڑوں خنزیر نما انسان بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے گرد گھومتے اور روتے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان میں سے کسی کا نام لے کر پکارتے تو وہ سر ہلا کر ہاں کرتا مگر گفتگو کی طاقت سلب ہوچکی تھی۔ ان کا رونا دھونا بعد از

وقت تھا اس لیے کسی کام نہ آیا اور وہ خنزیر نما سینکڑوں انسان تین دن اس حال میں رہنے کے بعد موت کا شکار ہو گئے۔ ان میں سے کوئی زندہ نہ رہا اور نہ ہی کسی کی نسل آگے چلی۔

گویا اس واقعہ کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قانون کا عملی اظہار فرما دیا کہ وہ عام نعمتوں کی ناشکری پر بھی سزا دیتے ہیں لیکن جو نعمت فرمائش اور درخواست کر کے لی جائے اس کی ناشکری پر ان کا عذاب بہت زیادہ سخت ہوتا ہے۔

تیل کی دولت اور عربوں کی بے بصیرتی

اس حوالہ سے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کا ایک ارشاد گرامی بھی آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں جو انہوں نے یہ واقعہ بیان کر کے عربوں سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا۔ "تفسیر ابن کثیرؒ" میں انہی آیات کریمہ کے ضمن میں منقول ہے کہ حضرت عمار بن یاسرؓ نے ایک مجلس میں "مائدہ" والا یہ واقعہ بیان فرمایا اور پھر کہا کہ اے اہل عرب! تم پر اللہ تعالیٰ نے بہت بڑا احسان کیا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسے عظیم پیغمبر تمہیں عطا فرمائے۔ حالانکہ ان سے پہلے تم صرف اونٹ اور بکریاں چرانے والے چرواہے تھے لیکن رسول اللہؐ کی برکت سے تمہیں عرب و عجم کی بادشاہت مل گئی اور نبی اکرمؐ نے تمہیں ہدایت کی کہ سونا چاندی ذخیرہ نہ کرنا یعنی دولت کو جمع کرنے کے بجائے اسے مستحقین پر خرچ کرتے رہنا مگر تم نے دولت کو ذخیرہ کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس لیے یاد رکھو کہ تم بھی اسی طرح خدا کے عذاب کا شکار ہو گے جس طرح مائدہ والے بنی اسرائیل خدا کے عذاب میں مبتلا ہوئے تھے۔

حضرت عمار بن یاسرؓ نے یہ بات اپنے دور کے پس منظر اور حالات میں کہی تھی لیکن آج کے حالات اور تناظر میں ان کے اس ارشاد گرامی کو دیکھ لیجئے کہ کس طرح حرف بہ حرف صادق آ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے گزشتہ پون صدی میں عربوں کو تیل اور سونے کی صورت میں جس دولت سے مالا مال کیا، اس کی مثال نہیں ملتی لیکن یہ دولت کہاں خرچ ہوئی؟ یہ دولت ملت اسلامیہ کے اجتماعی اور ملی مفاد میں خرچ ہوتی تو اس کا میدان سائنس، ٹیکنالوجی، دفاع اور معیشت تھا مگر عربوں کی دولت ان معاملات میں مسلمانوں کے کسی کام نہ آئی اور نہ ہی غریب مسلمانوں اور نادار لوگوں کی ضروریات پر یہ دولت صرف کی گئی البتہ عیاشی پر، اللوں تللوں پر، بیکار بلڈنگوں پر اور شاہانہ اخراجات پر تیل کی دولت برباد ہو گئی۔ اور جو دولت ان کاموں پر صرف نہ ہو سکی وہ مغربی ملکوں کے بینکوں میں ذخیرہ کر دی گئی ہے جو مسلمانوں کے بجائے ان کے دشمنوں کے تصرف میں ہے اور ان کے کام آ رہی ہے۔

اللہ نے چھپر پھاڑ کر عربوں کو دولت دی تھی، زمین کا سینہ ان کے لیے چاک کر دیا تھا مگر انہوں نے اس

عظیم نعمت کی جو ناشکری کی، اس کی سزا آج ہم سب بھگت رہے ہیں اور اسرائیل جیسے چھوٹے سے ملک کے سامنے تمام عرب ممالک بے بسی کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔ یہ خدا کا عذاب ہے اور اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ وہ نعمتیں بھی بے حساب دیتا ہے مگر ان کی ناشکری پر اس کی گرفت بھی بڑی سخت اور عبرتناک ہوتی ہے۔

پاکستان جیسی نعمت کی ناقدری

عربوں کو ایک طرف رکھیے خود ہمارا حال کیا ہے؟ ہم نے یعنی جنوبی ایشیا کے مسلمانوں نے "پاکستان" جیسی عظیم نعمت اللہ تعالیٰ سے مانگ کر لی تھی اور یہ کہا تھا کہ یا اللہ! اس خطہ کے مسلمانوں کو الگ ملک عطا فرما دے، ہم اس میں تیرے احکام کی پابندی کا اہتمام کریں گے، ہمارے ایک ہاتھ میں قرآن شریف اور دوسرے ہاتھ میں بخاری شریف تھی اور ہم نے لاکھوں کے اجتماع میں عہد کیا تھا کہ پاکستان بن گیا تو ان دو کتابوں کی حکمرانی قائم کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں الگ ملک دے دیا اور پاکستان بن گیا مگر ہم نے کیا کیا؟ اور نصف صدی سے مسلسل کیا کر رہے ہیں؟ ہم نے مملکتِ خداداد پاکستان کو لوٹ کھسوٹ اور مار دھاڑ کا مرکز بنا لیا۔ ہم میں سے جس کا جتنا داؤ چلا اس نے ملک کو لوٹنے اور اس کے وسائل کو برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ہم نے خدا کے قانون کو، اسلام کے نظام کو اور قرآن و سنت کی ہدایات کو نظر انداز کر دیا اور خواہشات کی غلامی میں لگ گئے۔ آج غریب آدمی کے پاس تن ڈھانپنے کو کپڑا نہیں ہے، بجلی کا بل دینے کے لیے پیسے نہیں ہیں، کھانے کو روٹی نہیں ہے، اور سر چھپانے کو مکان نہیں ہے، مگر چند افراد نے اپنی تجوریوں اور بیرون ملکوں بینکوں میں دولت کے انبار لگا رکھے ہیں۔

آج مجھے اور آپ سب کو اپنے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھنا چاہیے اور اس بات کا جائزہ لینا چاہیے کہ ہم تو عید کے روز نئے کپڑے پہنے، خوشبو لگائے اور بنے سنورے بیٹھے ہیں مگر ہمارے اردگرد کتنے لوگ ہیں جو آج کے دن بھی اپنے بچوں کے لیے ایک دن کی عارضی خوشیوں کا اہتمام نہیں کر سکے۔ ان کی تعداد تھوڑی نہیں بہت زیادہ ہے اور دن بدن بڑھتی جا رہی ہے، ان لوگوں کا بھی وہی خدا ہے جو سب کچھ دیکھ رہا ہے اور ان لوگوں کے دلوں سے بھی آہیں نکلتی ہیں جو سیدھی عرش پر جاتی ہیں۔ اس لیے ہمیں بنی اسرائیل کے اس واقعہ سے عبرت حاصل کرنی چاہیے، سبق لینا چاہیے اور نصیحت پکڑنی چاہیے۔ ابھی وقت ہے اگر ہم ندامت اور توبہ کے ساتھ اپنی اصلاح کا راستہ اختیار کر لیں تو توبہ کا دروازہ کھلا ہے لیکن اگر ہم نے اب بھی سبق نہ سیکھا تو عذاب کا قانون سب کے لیے یکساں ہوتا ہے اللہ تعالیٰ ہمیں اصلاح اور توبہ کی توفیق عطا فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

(مرکزی عید گاہ اہل سنت، مبارک شاہ روڈ، گوجرانوالہ میں خطاب - جنوری ۲۰۰۱ء)

قمری سال کے حوالے سے دو اہم مسئلے

اسلام میں حسابات و معاملات طے کرنے اور عبادات کی ادائیگی کے لیے سورج اور چاند دونوں کی گردش کا اعتبار کیا گیا ہے۔ اور اس فرق کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ مہینوں اور دنوں کا تعیّن چاند کے حساب سے ہو گا جبکہ اوقات سورج کی گردش کے ساتھ طے پائیں گے۔ اور اس میں حکمت بھی ہے کہ روزہ اور حج میں مختلف موسموں کا تنوع قائم رہتا ہے۔ یہاں دو مسئلے بھی عرض کر دینا مناسب سمجھتا ہوں:

- ایک یہ کہ چاند کی گردش میں چونکہ کمی بیشی ہوتی رہتی ہے اس لیے چاند کے طلوع وغیرہ کا حساب رکھنا فرضِ کفایہ ہے اور ہر علاقہ کے کچھ لوگوں کو اس کا اہتمام ضرور کرنا چاہیے، جس طرح ہمارے ہاں رؤیتِ ہلال کمیٹی ہے جس میں سرکردہ علمائے کرام اس کا حساب رکھتے ہیں اور چاند دیکھ کر اس کا اعلان کرتے ہیں۔ اگر اس کا کوئی اہتمام بھی کسی علاقہ میں نہ ہو تو وہاں کے سب مسلمان گنہگار ہوں گے۔
- دوسرا مسئلہ زکوٰۃ کے حوالہ سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے ہاں عام طور پر کاروبار وغیرہ کے حسابات جنوری فروری کے شمسی سال کے مطابق رکھے جاتے ہیں اور چونکہ سرکاری محکموں کے ساتھ سابقہ درپیش ہوتا ہے اس لیے حسابات میں شمسی سال کا لحاظ رکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ مگر زکوٰۃ قمری سال کے حساب سے ادا کرنا ضروری ہے اور اگر کوئی شخص شمسی یعنی جنوری فروری کے حساب سے زکوٰۃ ادا کرے گا تو تیس پینتیس سال کے عرصہ میں اس کی ایک سال کی زکوٰۃ ماری جائے گی کیونکہ اتنے عرصہ میں قمری سال کی گنتی شمسی سالوں سے ایک سال بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ زکوٰۃ قمری سال کے حساب سے ادا کی جائے۔

(اپریل ۱۹۹۹ء کے دوران مسجد امن، باغبانپورہ، لاہور میں خطاب)

عام طور پر یہ خیال ہوتا ہے کہ اسلام میں صرف چاند کا اعتبار ہے، ایسی بات نہیں ہے۔ چاند کا اعتبار دنوں کے تعیّن میں ہے لیکن عبادات کے اوقات میں ہم روزمرہ سورج کی گردش کے مطابق چلتے ہیں۔ اس طرح ہمارے ہاں عبادات میں چاند اور سورج دونوں کا یکساں اعتبار ہے۔ البتہ چاند کا سال سورج کے سال سے چھوٹا ہوتا ہے، تقریباً دس دن کا فرق ہے۔ مفسرین اس میں بہت سی حکمتیں بیان فرماتے ہیں۔

ایک حکمت یہ بیان کرتے ہیں کہ چاند کا مہینہ ہر تینتیس سال میں چکر مکمل کر لیتا ہے۔ یعنی تینتیس سال میں چاند چاروں موسموں میں، دنیا میں جہاں جہاں چار موسم ہوتے ہیں، گردش پوری کر لیتا ہے۔ اگر ایک مسلمان کو بالغ ہونے کے بعد طبعی عمر کو پہنچنے تک تیس پینتیس سال مل جائیں تو وہ سال کے ہر موسم کے روزے رکھ لیتا ہے۔ اسے ٹھنڈے روزے بھی مل جاتے ہیں اور گرم بھی۔ چھوٹے، درمیانے اور لمبے روزے سبھی مل جاتے ہیں۔ حج کا بھی یہی معاملہ ہے، حج بھی تینتیس سال میں موسموں کی گردش پوری کرتا ہے۔ یہاں ضمناً ایک بات قابلِ ذکر ہے۔ فقہاء یہ فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ کا حساب قمری سال کے اعتبار سے کرنا چاہیے اور ایسا کرنا شرعاً ضروری ہے۔ ورنہ اگر ہم شمسی سال کے اعتبار زکوٰۃ کا حساب کریں گے تو تینتیس سال میں ایک سال کی زکوٰۃ کم ادا ہوگی۔ جیسا کہ ہمارے زندگی کے عام حسابات شمسی مہینوں یعنی جنوری اور فروری وغیرہ کے حساب سے چلتے ہیں۔ اگر کوئی اپنی سالانہ زکوٰۃ بھی اسی حساب سے دیتا ہے تو تینتیس شمسی سالوں میں چونتیس قمری سال گزریں گے، اس حساب سے ایک سال کی زکوٰۃ ادا ہونے سے رہ جائے گی۔

(ستمبر ۲۰۰۸ء کے دوران مدینۃ العلوم، سپرنگ فیلڈ، ورجینیا، امریکہ میں خطاب)

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے افکار

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر حضرت شاہ صاحبؒ کی تعلیمات کا مختصر سا خلاصہ پیش کر دیا جائے جو ان کی معرکۃ الانصار تصنیف ''حجۃ اللہ البالغہ'' اور دیگر تصانیف سے ماخوذ ہے۔

سیاسی اصول اور شہریوں کے بنیادی حقوق:

1. زمین کا مالکِ حقیقی خدا ہے، باشندگانِ ملک کی حیثیت وہ ہے جو کسی مسافر خانے میں ٹھہرنے والے لوگوں کی ہوتی ہے۔ ملکیت کا مطلب یہ ہے کہ اس کے حقِ انتفاع (فائدہ اٹھانے) میں کسی دوسرے کی دخل اندازی قانوناً ممنوع ہے۔
2. سارے انسان برابر ہیں۔ کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنے آپ کو مالکِ ملک، ملک الناس، مالکِ قوم، یا انسانوں کی گردنوں کا مالک سمجھے، نہ کسی کے لیے جائز ہے کہ وہ کسی صاحبِ اقتدار کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرے۔
3. ریاست کے سربراہ کی وہ حیثیت ہے جو کسی وقف کے متولی کی ہوتی ہے۔ وقف کا متولی اگر ضرورتمند ہو تو اتنا وظیفہ لے سکتا ہے کہ عام باشندۂ ملک کی طرح زندگی گزار سکے۔
4. روٹی، کپڑا، مکان اور ایسی استطاعت کہ نکاح کر سکے اور بچوں کی تعلیم و تربیت کر سکے، بلا لحاظ

مذہب و نسل ہر ایک انسان کا پیدائشی حق ہے۔

5. مذہب، نسل یا رنگ کے کسی تفاوت کے بغیر عام باشندگان کے لیے ملک کے معاملات میں یکسانیت کے ساتھ عدل و انصاف، ان کے جان و مال کی حفاظت، حقِ ملکیت میں آزادی، حقوقِ شہریت میں یکسانیت ہر باشندۂ ملک کا بنیادی حق ہے۔
6. زبان اور تہذیب کو زندہ رکھنا ہر ایک فرقہ کا بنیادی حق ہے۔

اقتصادی اصول:

1. دولت کی اصل بنیاد محنت ہے۔ مزدور اور کاشت کار قوتِ کاسبہ (کمانے والی قوت) ہیں۔ باہمی مدنیت (شہریت) کی روح رواں باہمی تعاون ہے۔ جب تک کوئی شخص ملک و قوم کے لیے کام نہ کرے، ملک کی دولت میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔
2. جوا، سٹہ اور عیاشی کے اڈے ختم کیے جائیں جن کی موجودگی میں تقسیمِ دولت کا صحیح نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ اور بجائے اس کے کہ قوم اور ملک کی دولت میں اضافہ ہو، دولت بہت سی جیبوں سے نکل کر ایک طرف سمٹ آتی ہے۔
3. مزدور، کاشت کار اور جو لوگ ملک اور قوم کے لیے دماغی کام کریں، دولت کے اصل مستحق ہیں۔ ان کی ترقی و خوشحالی ملک اور قوم کی ترقی اور خوشحالی ہے۔ جو نظام ان قوتوں کو دبائے وہ ملک کے لیے خطرہ ہے اس کو ختم ہو جانا چاہیے۔
4. جو سماج محنت کی صحیح قیمت ادا نہ کرے اور مزدوروں اور کاشت کاروں پر بھاری ٹیکس لگائے، قوم کا دشمن ہے، اس کو ختم ہو جانا چاہیے۔
5. ضرورتمند (مجبور) مزدور کی رضامندی قابلِ اعتبار نہیں جب تک اس کی محنت کی وہ قیمت ادا نہ کی جائے جو امدادِ باہمی کے اصول سے لازم ہوتی ہے۔
6. جو پیداوار یا آمدنی تعاونِ باہمی کے اصول پر نہ ہو وہ خلافِ قانون ہے۔
7. کام کے اوقات محدود کیے جائیں۔ مزدوروں کو اتنا وقت ضرور ملنا چاہیے کہ وہ اخلاقی و روحانی اصلاح کر سکیں اور ان کے اندر مستقبل کے متعلق غور و فکر کی صلاحیت پیدا ہو سکے۔
8. تعاونِ باہمی کا بہت بڑا ذریعہ تجارت ہے، لہٰذا اس کو تعاون کے اصول پر ہی جاری رہنا چاہیے۔ پس جس طرح تاجروں کے لیے جائز نہیں کہ وہ بلیک مارکیٹ یا غلط قسم کی کمپیٹیشن سے تعاون کی روح کو نقصان پہنچائیں، ایسے ہی حکومت کے لیے درست نہیں کہ بھاری ٹیکس لگا کر تجارت کے فروغ و ترقی میں رکاوٹ پیدا کرے یا رخنہ ڈالے۔

9. وہ کاروبار جو دولت کی گردش کو کسی شخص یا طبقہ میں منحصر کردے، ملک کے لیے تباہ کن ہے۔
10. وہ شاہانہ نظامِ زندگی جس میں چند اشخاص یا چند خاندانوں کی عیش و عشرت کے سبب دولت کی صحیح تقسیم میں خلل واقع ہو، اس کا مستحق ہے کہ اس کو جلد از جلد ختم کرکے عوام کی مصیبت ختم کی جائے اور ان کو مساویانہ زندگی کا موقع دیا جائے۔

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور - ۲۴ اکتوبر ۱۹۷۵ء)

علامہ ابن خلدونؒ کے افکار

علامہ ابن خلدونؒ آٹھویں صدی ہجری کے وہ نامور مؤرخ ہیں جنہوں نے نہ صرف تاریخ پر قلم اٹھایا ہے اور انسانی معاشرہ کی تاریخ کے مختلف ادوار کے حالات و واقعات کو قلمبند کیا ہے بلکہ قوموں کی نفسیات، انسانی تاریخ کے مد و جزر اور اتار چڑھاؤ کے پس منظر اور اقوام کے عروج و زوال کے اسباب و عوامل پر فلسفیانہ گفتگو بھی کی ہے اور انہیں تاریخ کی فلسفہ نگاری کا بانی شمار کیا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی مرتب کردہ تاریخ اور اس کے مقدمہ میں قوموں کے عروج و زوال اور حکومتوں کی کامیابی و ناکامی کے معاشی اسباب پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ جب حکومتوں اور ان کے قوانین کے ہاتھوں ملک کے شہری معاشی پریشانیوں کا شکار ہوتے ہیں اور روزگار کے مواقع کم ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے لیے آمدنی اور اخراجات میں تناسب کا رشتہ قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے تو پھر قوموں اور ملکوں پر کس طرح تباہی آتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے خوشحالی اور مستحکم معاشرے کتنی تیزی سے زوال کا شکار ہو جاتے ہیں۔

مرکز معارف اسلامی لاہور کی شائع کردہ کتاب ''عربی نگارشاتِ عالیہ'' کے مصنف شیخ نذیر حسین نے عربی کے ادبی شہ پاروں کے انتخاب میں ''ملک کی خرابی'' کے عنوان سے ابن خلدونؒ کی مندرجہ ذیل تحریر کو شامل کیا ہے، ملاحظہ فرمائیے اور غور کیجئے کہ اس میں موجودہ حالات میں ہمارے لیے کیا سبق پوشیدہ ہے۔

> ''جاننا چاہیے کہ لوگوں کے مال پر دست درازی آئندہ کے لیے ان کو اس کے حصول اور اکتساب سے روکتی ہے، اس لیے کہ اس صورت میں وہ دیکھتے ہیں کہ محنت و جانفشانی سے مال پیدا کرنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مال ان سے چھن جائے گا۔ اس لیے جب لوگوں کو اپنے مال و منال کے لٹ جانے کا خیال ہوتا ہے تو اس کے حصول اور اکتساب کا جذبہ دب جاتا ہے اور ان کے ہاتھ کوشش سے رک جاتے ہیں۔ جس قدر ظلم و تعدی کو جائز رکھا

جاتا ہے اسی قدر رعایا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاتی ہے۔ اس لیے جب ظلم زیادہ اور عام ہوتا ہے تو تمام مکاسب سے لوگ ہاتھ اٹھا لیتے ہیں، اور اٹھانا بھی چاہیے، جب انہیں کسی کام سے فائدہ ہی نہیں ہوتا تو وہ کس امید پر خون پسینہ ایک کریں؟

جس حالت میں ظلم کم ہوتا ہے تو رعایا بھی خوش دلی سے کاروبار کرتی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ آبادی اور اس کی زیادتی اور بازاروں کی چہل پہل محض کاروبار اور ضروری مصارف اور معاملات میں لوگوں کی سعی و کوشش سے ہے۔ کیونکہ بازار میں آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ جب لوگ کسبِ معاش سے ہاتھ کھینچ لیں گے اور اپنے اپنے کاروبار کو چھوڑ دیں گے تو شہروں کے بازار بھی بے رونق ہو جائیں گے، ملک کی حالت بگڑے گی اور لوگ متنفر ہو کر رزق کی تلاش میں، جو انہیں وہاں نہیں مل سکتا، دوسرے ملکوں کی راہ لیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ملک کی آبادی گھٹ جائے گی اور شہر اور قصبات ویران ہو جائیں گے اور ملکی اضمحلال سے سلطنت اور سلطان پر بھی تباہی آئے گی۔ اس لیے کہ سلطنت کی رونق اور شان و شوکت وابستہ ہے آبادی سے، جب وہی بگڑ گئی تو پھر سلطنت اپنے حال میں کیوں کر قائم رہ سکتی ہے۔

دیکھو کہ مسعودیؒ (مؤرخ) نے موبذ اور بہرام بن بہرام (شاہ فارس) کا کیا خوب قصہ لکھا ہے، اور ظلم و غفلت کی برائی کس طرح کے ساتھ بوم (الو) کی زبانی بیان کی ہے۔ ایک دن بہرام (بادشاہ) نے الو کی آواز سنی تو موبذ (وزیر) سے پوچھا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ ایک نر بوم مادہ بوم سے نکاح کرنا چاہتا ہے، مادہ بوم اپنے مہر میں بیس ویران گاؤں مانگتی ہے۔ نر نے اس شرط کو قبول کر لیا ہے اور کہا ہے کہ اگر اسی بادشاہ کی سلطنت قائم رہی تو میں تجھ کو ہزار گاؤں دے دوں گا، رفتار زمانہ کو دیکھتے ہوئے یہ بات کچھ مشکل نہیں ہے۔ بہرام نے جب یہ بات سنی تو غفلت سے چونک پڑا، موبذ کو خلوت میں بلایا اور پوچھا کہ تم نے وہ کیا بات کہی تھی؟

اس نے عرض کیا کہ اے بادشاہ! بادشاہ کی عزت، شریعت اور اس کے امر و نہی کو ماننے میں ہے۔ شریعت کا قیام ملک سے وابستہ ہے، ملک کی عزت مردانِ کار کے ساتھ ہے، مردانِ کار ملتے ہیں مال سے، مال حاصل ہوتا ہے عمارت و آبادی سے، آبادی ہے عدل کے ساتھ، اور عدل ترازو ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے مخلوقات میں نصب کیا ہے اور

اس کی دیکھ بھال بادشاہ کو دی ہے۔ اے بادشاہ! تو نے زمین، زمین کے مالکوں اور ان کے آباد کاروں سے چھین لی ہے، حالانکہ وہ لوگ خراج دیتے تھے اور تجھ کو ان سے مال حاصل ہوتا تھا۔ پھر وہ زمین تو نے اپنے حاشیہ نشینوں، خادموں اور بے کار لوگوں کو دے دی ہے جن کو نہ اس کی آبادی کی فکر ہے، نہ اس کے انجام پر نظر ہے اور نہ زمین کی اصلاح و درستی کی فکر کرتے ہیں۔ چونکہ وہ لوگ ہر وقت تیرے پاس رہتے ہیں اس لیے ان سے خراج لینے میں بھی درگزر کی جاتی ہے، اور ظلم ان لوگوں پر کیا جاتا ہے جو خراج ادا کرنے اور زمین کو آباد رکھنے والے ہیں۔ ناچار انہوں نے اپنی زمینیں چھوڑ دیں، ان کی آبادیاں ان سے خالی ہوگئیں۔ ویرانوں میں جا پڑے اور وہیں رہنے لگے تاکہ تیرے ظلم سے بچیں۔ ان باتوں سے ملک کی آبادی کم ہوگئی، زمینیں ویران ہوگئیں، خراج کم ہوگیا ہے، لشکر اور رعیت تباہ حال ہے، آس پاس کے حکمران تیرے ملک کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے ہیں اس لیے کہ تیرے پاس ساز و سامان ہی نہیں جس سے تو حکمرانی کر سکے۔

جب بادشاہ نے سنا تو انتظام پر کمر باندھی اور اپنے خواص اور حاشیہ نشینوں سے زمینیں چھین کر اصلی مالکوں کو دے دیں۔ آبادی بڑھنے لگی اور جو لوگ خستہ حال ہوگئے تھے خوشحال ہوگئے۔ زمینیں معمور اور آباد ہوگئیں، ملک کی پیداوار میں اضافہ ہوا، دیوانِ خراج کے پاس مال پر مال آنے لگا، لشکر درست ہوا، دشمن ناامید ہو کر بیٹھ گیا، ملک کے اطراف و اکناف فوجوں سے معمور ہوگئے، بادشاہ بنفس نفیس مہمات میں مشغول ہوا، ملک میں ہر طرف بندوبست ہوگیا۔

غرض اس بیان سے یہ ہے کہ ظلم و عدوان سے آبادی میں نقصان واقع ہونا ضروری ہے۔ یہ بھی نہ سمجھنا چاہیے کہ ظلم فقط یہی ہے کہ کوئی مال یا ملک اس کے مالک سے بلا سبب اور بلا معاوضہ چھین لی جائے، جب کہ عام طور پر لوگوں نے ظلم کا معنیٰ یہی سمجھ رکھا ہے۔ حقیقت میں ظلم مذکورہ بالا تعریف سے زیادہ وسعت رکھتا ہے۔ ملک کا چھین لینا، عمل میں غصب کرنا، ناحق کسی بات کا طالب ہونا، غیر شرعی حق واجب کر دینا سب ظلم ہے۔ بغیر حق کے مال پر ٹیکس لگانا ظلم ہے اور ایسا کرنے والے بے شک ظالم ہیں۔ مال و دولت کو لوٹنے کھسوٹنے والے بھی ظالم ہیں اور جو شخص لوگوں کو ان کے حقوق سے محروم رکھے وہ بھی ظالم ہے۔

غرض یہ کہ علی العموم ملک کے غصب کرنے والے ظالم ہیں اور ان سب کا وبال سلطنت کی گردن پر پڑتا ہے کیونکہ ان باتوں سے لوگوں میں جوش اور ولولہ نہیں رہتا جس سے آبادی گھٹتی ہے۔ اور آبادی گھٹنے سے ہی، جو سلطنت کی دولت و ثروت اور شان و شوکت کا ذریعہ ہے، سلطنت کو نقصان پہنچتا ہے۔ جاننا چاہیے شارع علیہ السلام نے محض اسی مصلحت سے ظلم کو محرماتِ شرعیہ میں داخل کیا ہے کہ اس سے عمارت و بربادی کی تباہی و بربادی لازم آتی ہے اور انسانی آبادی کی بربادی، انقطاعِ نوعی (نسل کا خاتمہ) کو مستلزم ہے۔ اور یہی شرع کی وہ عامۃ المراعات حکمت ہے جو شریعت کے پانچوں ضروری مقاصد یعنی حفاظتِ دین، حفاظتِ نفس، حفاظتِ عقل اور حفاظتِ مال میں ملحوظ و مرعی ہے۔"

علامہ ابن خلدونؒ کی تحریر کا یہ طویل اقتباس ہم نے اس لیے پیش کیا ہے کہ اس آئینے میں ہمارا قومی چہرہ صاف طور پر دکھائی دے رہا ہے اور یہ ہمیں درپیش قومی بحران کے کم و بیش تمام پہلوؤں کی عکاسی کرتا ہے۔ لیکن کیا ہمارے "بادشاہ سلامتوں" کی کلاس اس آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے کی زحمت گوارا فرمائے گی؟

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد-۲۸ نومبر ۲۰۰۰ء)

عالمی منظر نامہ اور اسلامی نقطۂ نظر

محنت کشوں کا عالمی دن اور اسلام

یکم مئی محنت کشوں کا عالمی دن ہے جو شکاگو میں اپنے حقوق کی خاطر جدوجہد کرنے والے مزدوروں پر فائرنگ کے نتیجہ میں جاں بحق ہونے والے مزدوروں کی یاد میں منایا جاتا ہے، اس روز پوری دنیا میں مزدور اپنے حقوق کی خاطر جلوس نکالتے ہیں اور اجتماعات منعقد کرتے ہیں۔ ہمیں ''یوم'' منانے سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں لیکن محنت کشوں کے مسائل اور حقوق کے بارے میں ہمارے اکابر نے ہمیشہ واضح اور دوٹوک موقف اختیار کیا ہے۔ اسلام نے دنیا کے تمام مذاہب اور نظاموں سے زیادہ محنت کشوں کے حقوق کا تحفظ کیا ہے اور کوئی مذہب یا نظام اس معاملہ میں اسلام کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

برصغیر میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں محنت کشوں کے حقوق و مفادات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور آج دنیا میں محنت کشوں کے بڑے سے بڑے ہمدرد بھی محنت کشوں کے حقوق پر اس قدر واضح موقف اختیار نہیں کر سکے۔ ولی اللہ تحریک کے قائدین نے ہر دور میں جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی کھل کر مخالفت کی ہے اور مزدوروں، کسانوں اور دیگر محنت کشوں کے حقوق کے تحفظ کو ہمیشہ ترجیح دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج سے دس سال قبل جب پاکستان میں جاگیردارانہ و سرمایہ دارانہ نظام کے ستائے ہوئے مظلوم عوام کے ردعمل کو بعض ناعاقبت اندیش جماعتوں نے کفر اور اسلام کا معرکہ بنانے کی کوشش کی اور کچھ علماء نے فتویٰ بھی صادر فرما دیا، ولی اللّٰہی تحریک کی نمائندہ ''جمعیت علماء اسلام'' نے اس معرکہ میں فریق بننے اور اسے اسلام اور کفر کا معرکہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

آج جب ملک میں اسلامی قوانین کے نفاذ کا عمل شروع ہو چکا ہے، یہ بات زیادہ ضروری ہے کہ محنت کش طبقہ کو بھی اس معاملہ میں اعتماد میں لیا جائے اور اسے محنت کشوں کے حقوق کے بارے میں اسلامی تعلیمات اور اسلام میں دی گئی ضمانتوں سے روشناس کرایا جائے، تاکہ اسلامی نظام کا نفاذ ہمہ گیر اور مکمل ہو اور مزدوروں اور کسانوں کے نام نہاد ہمدردوں کو اس مظلوم طبقہ کا ذہنی استحصال کرنے کی گنجائش نہ مل سکے۔

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور - ۴ مئی ۱۹۷۹ء)

کمیونزم، نوآبادیاتی نظام، اسلامی تعلیمات

روزنامہ نوائے وقت کی ۱۷ اپریل کی اشاعت ملی میں ''کمیونزم اور سوشلزم کے سبز باغ'' کے عنوان

سے منشی عبدالرحمان خان صاحب کا مضمون نظر سے گزرا جس میں بعض باتیں اگرچہ مبالغہ آمیز ہیں، مثلاً مصر کے صدر ناصر مرحوم کے بارے میں یہ لکھا گیا ہے کہ انہوں نے سوشلزم کے خلاف فتوے دینے سے علماء ازہر کو حکماً روک دیا، جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ ناصر مرحوم کے دور حکومت میں مصر میں "کمیونسٹ پارٹی" مسلسل خلافِ قانون رہی اور روسی وزیراعظم مسٹر خروشچیف اپنے دورۂ مصر کے موقع پر بار بار اصرار کے باوجود ناصر مرحوم کو کمیونسٹ پارٹی پر عائد پابندی ہٹانے پر آمادہ نہ کر سکے۔ تاہم اس مبالغہ آمیزی کے باوجود مذکورہ مضمون کمیونسٹوں کے طریق کار، عزائم اور مقاصد کو سمجھنے میں کسی حد تک مدد دیتا ہے۔

مجھے اپنی گزارشات میں مذکورہ مضمون کو زیر بحث لانے کی بجائے اس کی مناسبت سے کمیونزم کے بڑھتے ہوئے خطرات، اس کے اسباب و محرکات اور اس ضمن میں مسلمانوں کی اجتماعی ذمہ داریوں کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے تاکہ اس بحث کے تمام پہلو قارئین کے سامنے آسکیں۔

کمیونزم کا خطرہ

کمیونزم کے بارے میں غور کرتے وقت ہم یہ حقیقت اکثر نظر انداز کر جاتے ہیں کہ کمیونزم کے خطرہ کی حیثیت خارجی کم اور داخلی زیادہ ہے۔ اور اگرچہ خارجی عوامل اس فتنہ کو بھڑکانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں لیکن فتنہ کا اصل منبع کمیونزم کا شکار ہونے والے معاشرے کی داخلی صورتحال ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں اس فتنہ کو خارجی سمجھ کر اس کی داخلی حیثیت سے چشم پوشی کی گئی وہاں کمیونزم کا اثر و نفوذ بڑھتا چلا گیا اور یورپی ممالک کی طرح جس معاشرہ میں کمیونزم کے داخلی سرچشمہ کو بند کرنے کی حکمتِ عملی اختیار کی گئی وہاں کمیونزم کا خطرہ ہمیشہ کے لیے ٹل گیا۔

آج مسلم ممالک کمیونزم کی جارحانہ یلغار کی زد میں ہیں اور مسلم حکومتیں، ادارے اور مسلمانوں کی نظریاتی تحریکیں کمیونزم کی مسلح پیشرفت سے پیدا شدہ صورتحال کا جائزہ لے رہی ہیں۔ اگر آج بھی کمیونزم کے داخلی محرکات و اسباب کو دور کرنے کی بجائے صرف خارجی یلغار سے مذاحمت آرائی کو ہی کافی سمجھ لیا گیا تو یہ حکمتِ عملی کمیونزم کی راہ روکنے کی بجائے اس کی منزل کو اور قریب لانے کا باعث بنے گی۔ اس لیے ہمیں ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لینا چاہیے۔

کمیونزم کے جراثیم ہمیشہ معاشرہ میں مختلف طبقات کے درمیان معیارِ زندگی کے ہوشربا تفاوت، اور سرمایہ دارانہ و جاگیردارانہ نظام کے تحت گنے چنے افراد پر مشتمل طبقے کی طرف سے آبادی کی اکثریت کے استحصال کے نتیجہ میں جنم لیتے ہیں۔ اور معاشرہ کی طبقاتی تقسیم کمیونزم کے جراثیم کے لیے پیدائش اور

افزائش کا باعث بنتی ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں طبقاتی تقسیم نہ صرف اپنی تمام تر فتنہ سامانیوں سمیت موجود ہے بلکہ کمیونزم کے خطرہ کو قریب لانے کا سب سے بڑا داخلی محرک یہی ہے۔ پاکستانی معاشرہ کمیونزم کی یلغار کا براہ راست ہدف ہے اور یہاں معاشرہ کی طبقاتی تقسیم کی فتنہ خیزیوں کا جائزہ لینے کے لیے زیادہ تفصیلات کو کریدنے کی بجائے ایک طرف ڈیفنس کالونی، شادمان کالونی اور گلبرگ کے معیارِ زندگی کو دیکھ لیں اور دوسری طرف کچی آبادیوں میں قیام پذیر لوگوں کے معیارِ زندگی پر ایک نظر ڈال لیں۔ اگر آپ ان دونوں کے درمیان فرق کا فاصلہ ماپنے میں کامیاب ہو جائیں تو اس تفاوت سے پیدا شدہ غلاظت کے ڈھیر پر پلنے والے کمیونزم کے وہ جراثیم بھی نظر آجائیں گے جنہیں ''کرم کش ادویات'' کے ذریعے ہلاک کرنے کی تمام تر کوششیں ناکام ہو چکی ہیں اور اب اس کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہیں رہا کہ ایک ہی معاشرہ کے مختلف طبقوں کے درمیان معیارِ زندگی کے ہوشربا تفاوت اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے غلاظت کے ڈھیر کو ہلا تاخیر اٹھا دیا جائے تاکہ کمیونزم کے جراثیم پورے معاشرہ کو اپنی لپیٹ میں لینے سے قبل ہی اپنی پناہ گاہ اور کمین گاہ سے محروم ہو جائیں۔

ہمارا نوآبادیاتی معاشی و معاشرتی ڈھانچہ

ہمارا موجودہ معاشی اور معاشرتی ڈھانچہ نوآبادیاتی دور کی یادگار ہے جس کا اسلام کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ مگر بدقسمتی سے اس وقت صورتحال یہ ہے کہ اس نوآبادیاتی نظام کے خلاف کمیونزم کی جنگ میں اسلام کے نام پر کام کرنے والی تحریکوں نے توازن اور حکمتِ عملی کا دامن چھوڑ دیا ہے۔ اسلامی نظامِ عدل جہاں کمیونزم کو ایک لمحہ کے لیے قبول کرنے کو تیار نہیں ہے وہاں وہ موجودہ معاشی و معاشرتی ڈھانچہ کی موافقت بھی نہیں کرتا۔ اس صورتحال میں حکمتِ عملی کا تقاضا تو یہ تھا کہ موجودہ نوآبادیاتی نظام کے خلاف جدوجہد میں اسلام اور کمیونزم کے درمیان مسابقت کی فضا پیدا کر دی جاتی، اور اسلامی عناصر جو یہاں کمیونسٹ عناصر سے کہیں زیادہ مؤثر، طاقتور اور مستحکم ہیں اسی مسابقت کے ساتھ آنے والے انقلاب کی زمام کار کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے جیسا کہ پڑوسی ملک ایران میں ہوا ہے۔ لیکن یہاں بدقسمتی سے نہ صرف یہ کہ اسلام کو نوآبادیاتی نظام کے خلاف جدوجہد کا سالار بنانے کی بجائے اس نظام کے حمایتی اور پناہ گاہ کے طور پر پیش کیا گیا بلکہ نوآبادیاتی نظام کے خلاف اٹھنے والی ہر آواز پر ''سوشلسٹ'' اور ''کمیونسٹ'' کی پھبتی کس کر کمیونزم کے دائرۂ اثر کو وسیع کرنے اور نوآبادیاتی نظام کے مخالفین کو ''کمیونسٹ کیمپ'' میں زبردستی دھکیلنے کی ناعاقبت اندیشانہ مساعی روا رکھی گئیں۔

اور اس کے ساتھ ساتھ پاکستانی عوام کی عظیم قربانیوں کے بعد گزشتہ سال اسلامی قوانین کے نفاذ کے

جس عمل کا آغاز ہوا اسے مصلحتوں، گروہی نزاکتوں اور بے تدبیری کے شکنجے میں اس بری طرح جکڑ دیا گیا کہ اسلامی نظام کے نفاذ سے وابستہ خوش فہمیوں اور آرزوؤں کا محل شگاف آشنا ہو چکا ہے۔ آج صورتحال یہ ہے کہ اسلام اور نظریۂ پاکستان کی بات کرنے والے لوگوں کے چہرے معذرت و خجالت کی جھریوں سے سجے ہوئے ہیں جبکہ لادینیت اور اخلاقی انارکی کے علمبردار اپنے چہروں سے جھجھک کے نقاب اتار کر دور پھینک چکے ہیں۔ اسلام اور اسلامی نظام کے بارے میں عوامی اعتماد سے بہرہ ور طبقہ صرف علماء کا طبقہ تھا اور کسی حد تک آج بھی ہے لیکن علماء کرام نے فرقہ بندی کے عنوان سے قوم کو وہ تگنی کا ناچ نچایا ہے کہ لادینیت کے پرچارک آج زیر لب یہ گنگناتے پھر رہے ہیں کہ

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو؟

پھر علماء کرام سے معذرت کے ساتھ اس حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ علماء کی اکثریت اس معاشرے کے پسے ہوئے اور معاشی ناہمواری کے ستائے ہوئے طبقوں کے مسائل معلوم کرنے، ان کی مشکلات کا جائزہ لینے، ان سے میل جول رکھنے اور انہیں اپنی رفاقت کا احساس دلانے سے گریزاں ہے۔ حالانکہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت خود کو محنت کشوں اور معاشرہ کے مظلوم طبقوں کے ساتھ وابستہ رکھنا ہے، لیکن آج علماء کرام سہل پسندی کے ہاتھوں اس سنت نبویؐ سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔

ان حالات میں کمیونزم کا مقابلہ اور سدباب خالی خولی محاذ آرائی کی فضا قائم کر کے نہیں بلکہ تکنیکی اور منطقی طرز عمل اختیار کر کے ہی کیا جا سکتا ہے۔ اور اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اور نازک ذمہ داری علماء کرام پر عائد ہوتی ہے کہ وہ مروجہ نوآبادیاتی معاشی اور معاشرتی نظام کی غیر اسلامی حیثیت کی دوٹوک وضاحت کریں اور اس غلط فہمی کو جرأت اور استقامت کے ساتھ دور کرنے کی کوشش کریں کہ موجودہ نظام کو اسلام یا علماء کرام کی پشت پناہی حاصل ہے۔ کیونکہ اس امر کی عملی اور دوٹوک وضاحت کے بغیر کمیونزم کی کسی بھی عنوان سے مخالفت نوآبادیاتی نظام کی حمایت سمجھی جائے گی جو نہ صرف علماء کرام بلکہ اسلام کے عادلانہ نظام کے بارے میں خطرناک منفی نتائج پیدا کر سکتی ہے۔

معاش و اقتصاد کا اسلامی نقطۂ نظر

ہمارا موجودہ معاشرتی اور معاشی ڈھانچہ طبقاتی تقسیم اور دولت کے سرکاری ذرائع کی ترجیحانہ تقسیم کی بنیاد پر استوار ہے اور یہ دونوں اصول اسلامی تعلیمات کے سراسر منافی ہیں۔ اس لیے کہ اسلام معاشرہ میں طبقات کے وجود کو تسلیم نہیں کرتا، نہ رنگ و نسل کے اعتبار سے، نہ مال و دولت کے اعتبار سے، نہ قوت و اختیار کے لحاظ سے اور نہ ہی کسی اور نقطۂ نظر سے۔ اسلام سے قبل یہ تقسیم اور ترجیحات موجود تھیں

لیکن اسلام نے اسے یکسر مٹا دیا۔ اسلام نے جائز ذرائع سے دولت کمانے کی اجازت ضرور دی اور حلال دولت کا ذخیرہ کرنے سے بھی نہیں روکا لیکن دولت کی ایسی نمائش اور معیارِ زندگی کو معاشرہ کے عام معیار سے مختلف اور بلند کرنے کی اجازت نہیں دی کہ اسی سے طبقاتی تقسیم جنم لیتی ہے۔

خلافتِ راشدہ اسلامی نظام کا آئیڈیل معاشرہ ہے، اس پر ایک نظر ڈالیے کہ معاشرے میں امیر المومنین، گورنر، عمال اور دیگر ارباب اختیار موجود تھے۔ حضرت عبد الرحمان بن عوفؓ، حضرت طلحہؓ، حضرت زبیرؓ اور حضرت عثمانؓ جیسے اصحابِ ثروت بھی موجود تھے۔ حضرت بلالؓ اور حضرت ابوہریرہؓ جیسے مفلس بھی موجود تھے۔ لیکن نہ حکمران طبقہ نے اپنے لیے امتیازی معیارِ زندگی کا تقاضا کیا اور نہ ہی اصحابِ ثروت نے الگ بستیاں بسانے کو پسند کیا، بلکہ معاشرہ کے تمام افراد کے درمیان معیارِ زندگی کی یکسانیت نے ایسی بہار پیدا کر دی جو خلافتِ راشدہ کی اصل روح ہے۔

یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہوگا کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے محنت کشوں کے سب سے نچلے طبقہ غلاموں کے بارے میں حکم دیا کہ یہ تمہارے بھائی ہیں جنہیں خدا نے تمہارا ماتحت کر دیا ہے، پس تم میں سے جس شخص کے تحت اس کا بھائی ہو تو اسے وہی کھلائے جو خود کھاتا ہے، وہ پہنائے جو خود پہنتا ہے، اور اس کی طاقت سے زیادہ کام اس پر نہ ڈالے (بخاری ص ا ج ا)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مالک اور غلام کے درمیان معیارِ زندگی کی یکسانیت کی ہدایت فرمائی اور صحابہ کرامؓ نے اس پر عمل کر کے دکھایا۔ سوال یہ ہے کہ اگر مالک اور اس کے زر خرید غلام میں معیارِ زندگی کی برابری اسلام کا ایک روشن اصول ہے تو آج کا کارخانہ دار اپنے آزاد مزدور اور اپنے درمیان معیارِ زندگی کی مساوات کا اصول قبول کرنے سے کیوں جھجکتا ہے؟ اور اگر خلافتِ راشدہ میں معیارِ زندگی کے لحاظ سے طبقاتی تقسیم کا کوئی وجود نہیں ہے بلکہ پہلے سے موجود طبقاتی تقسیم کی عمارت ڈھا کر اس کے کھنڈرات پر خلافتِ راشدہ کا غیر طبقاتی معاشرہ استوار کیا گیا ہے تو آج ایک ہی معاشرہ کے مختلف طبقات کے درمیان اس ہوشربا تفاوت کا کیا جواز ہے جس کا اندازہ شادمان کالونی اور کچی آبادی کے مکینوں کے درمیان معیارِ زندگی کے تفاوت پر ایک نظر ڈالنے سے بآسانی ہو سکتا ہے۔

اسی طرح دولت اور اس کے قومی ذرائع کی ترجیحانہ تقسیم بھی اسلام کے سراسر منافی ہے۔ انسان انفرادی طور پر جائز ذرائع سے جس قدر چاہے دولت کما لے لیکن دولت کے قومی ذرائع پر معاشرہ کے تمام افراد کا حق یکساں ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے خلیفہ بننے کے بعد جب بحرین وغیرہ سے آئے ہوئے مال کو مدینہ منورہ کے شہریوں میں برابر تقسیم کر دیا تو کچھ لوگوں نے اعتراض کیا کہ آپؓ نے فضیلت والے حضرات اور غیر فضیلت والے حضرات کو مساوی حصہ دیا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ فضیلت کا

معاملہ اللہ کے ساتھ ہے، اس کا ثواب وہ دیں گے "وھذا معاش فالاسوۃ فیہ خیر من الاثرۃ" (کتاب الخراج ص ۵۰) اور یہ معیشت ہے اس میں برابری کا اصول ترجیح سے بہتر ہے۔ اور خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے معیشت میں مساوات کی بنیاد پر دولت کی تقسیم کو صحیح اصول قرار دیا ہے۔

حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہؐ نے قیامت سے پہلے امام مہدیؓ کے ظہور کا ذکر کیا اور فرمایا کہ جب وہ ظاہر ہوں گے خدا کی زمین ظلم و جور سے پر ہوگی اور امام مہدیؓ اسے عدل و انصاف سے بھر دیں گے۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ "ویقسم المال صحاحا قال رجل ما صحاحا قال بالسویۃ بین الناس رواہ احمد و ابویعلی ورجالھما ثقات" (مجمع الزوائد ص ۳۱۳ ج ۷) امام مہدیؓ دولت کو صحیح طریقہ سے تقسیم کریں گے، ایک شخص نے پوچھا کہ صحیح طریقہ کیا ہے؟ فرمایا کہ لوگوں کے درمیان مساوات کی بنیاد پر۔

الغرض خلافتِ راشدہ کی طرز پر غیر طبقاتی معاشرہ کی تشکیل اور دولت کے قومی ذرائع کی مساویانہ تقسیم اسلام کے نظامِ عدل کی مستحکم بنیادیں ہے جس کے بغیر اسلامی نظام کے حقیقی نفاذ کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اور اسلامی نظام کی یہی بنیاد کمیونزم کے راستہ میں ناقابلِ شکست رکاوٹ بن سکتی ہے۔ ورنہ نوآبادیاتی دور کی یادگار موجودہ معاشرتی و معاشی ڈھانچہ کمیونزم کے چیلنج کا سامنا کرنے کی سکت نہیں رکھتا۔ اربابِ اختیار، علماء کرام اور اسلامی نظام کے نفاذ کی دلی خواہش رکھنے والے عناصر اس حقیقت کا جتنی جلدی ادراک و اعتراف کرلیں ملک و قوم کے حق میں اتنا ہی بہتر ہوگا۔

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور - ۹ مئی ۱۹۸۰ء)

سرمایہ داریت، کمیونزم اور اسلام

روزنامہ نوائے وقت لاہور ۲۱ جولائی ۲۰۰۱ء کی ایک خبر کے مطابق روس کی پارلیمنٹ نے ملک میں اراضی کی آزادانہ خرید و فروخت کی اجازت دینے کی منظوری دے دی ہے۔ واضح رہے کہ کمیونسٹ دورِ اقتدار میں روسی اراضی کی آزادانہ خرید و فروخت سختی سے ممنوع تھی، اور انتہائی اہم ضرورت کے علاوہ اراضی کی فروخت نہیں ہو سکتی تھی۔ اس سلسلہ میں غیر ملکی کمپنیوں نے ایک عرصہ سے مطالبہ کر رکھا تھا کہ کمیونسٹ دور کے اس ضابطہ میں نرمی کی جائے۔ جس کے بعد روسی پارلیمنٹ نے اب ایک قانون کی منظوری دی ہے جس کے تحت اراضی کی آزادانہ فروخت کی اجازت ہوگی۔ کمیونسٹ پارٹی اور روسی قدامت پرست چرچ نے اس اقدام کی سخت مخالفت کی ہے اور کہا ہے کہ زمین عوام کی ملکیت رہنی

چاہیے۔

اس خبر سے اندازہ ہوتا ہے کہ سوویت یونین کے بکھرنے اور ایک سپر پاور کے طور پر روس کی شکست کے بعد نظریاتی اور فکری محاذ پر بھی کمیونزم کی پسپائی کا عمل مسلسل جاری ہے، اور روسی پارلیمنٹ کا منظور کردہ یہ قانون بھی اسی کا حصہ ہے۔

کمیونزم دراصل مغرب کے جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام کی تباہ کاریوں کا ردعمل تھا۔ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام نے کاشتکار اور مزدور کو جبر و استحصال کے مذموم شکنجے میں جکڑ رکھا تھا اور مظالم کی انتہا کر دی تھی۔ جس کے ردعمل میں مزدوروں اور کسانوں نے بغاوت کر دی، اور دوسری طرف انتہا پر جاتے ہوئے سرے سے انفرادی ملکیت ہی کی نفی کر کے ''عوام کی مشترکہ ملکیت'' کا تصور پیش کیا، جسے کنٹرول کرنے کے لیے پارٹی آمریت کو ذریعہ قرار دیا۔ اسی فلسفہ کی بنیاد پر روس اور چین سمیت بہت سے ممالک انقلاب سے دوچار ہوئے، اور محنت کشوں کی حکمرانی کے نام پر یہ نظام نافذ کر دیا گیا۔ لیکن یہ چونکہ خود کوئی مستقل نظام نہیں تھا بلکہ ردعمل اور غصہ و انتقام کی بنیاد پر استوار ہوا تھا، اس لیے زیادہ دیر تک نہ چل سکا اور انسانی سوسائٹی کے فطری تقاضوں کے سامنے اسے سپر انداز ہونا پڑا، جس کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے۔

اسلام نے اسی لیے فرد کی آزادی، عوام کے اجتماعی مفاد، ریاست کے کنٹرول، اور مختلف طبقات کی باہمی کشمکش میں سے کسی ایک کو اپنے اجتماعی نظام کی بنیاد بنانے کی بجائے ان سب کی اہمیت اپنی اپنی جگہ تسلیم کرتے ہوئے ان سب کے درمیان ایک حسین امتزاج اور توازن قائم کیا ہے۔ جو انسانی سوسائٹی اور اجتماعیت کا فطری تقاضہ ہے اور اسلام کے نظام کا حسن ہے۔ اس لیے سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام اور اس کے بعد کمیونزم کی پسپائی کے بعد اب اسلام ہی واحد چوائس باقی رہ گیا ہے، جو انسانی معاشرہ کو سیاسی، معاشی اور معاشرتی طور پر توازن اور اعتدال پر مبنی نظام دے سکتا ہے۔ خدا کرے کہ ہمارے اربابِ علم و دانش وقت کے اس چیلنج کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے اسلام کو ایک فطری اور متوازن نظام کے طور پر دنیائے انسانیت کے سامنے پیش کر سکیں، آمین یارب العالمین۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔ اگست ۲۰۰۱ء)

سرمایہ دارانہ نظام اور پاپائے روم

انسٹیٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اسلام آباد کے جریدہ ماہنامہ ''عالمِ اسلام اور عیسائیت'' نے جولائی ۱۹۹۶ء کے شمارے میں روزنامہ ڈان کے حوالہ سے رپورٹ شائع کی ہے کہ کیتھولک فرقہ کے سربراہ پوپ پال

جان دوم نے مشرقی یورپ کی ریاست سلووینیا کے پہلے دورے کے موقع پر رومن کیتھولک برادری سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ بے لگام سرمایہ داری اور کمیونزم میں سے کوئی بھی ایک دوسرے سے کم خطرناک نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ سابق یوگوسلاویہ کی یہ جمہوریہ ان دنوں کلیسا پسند آئیڈیالوجی کے اثرات سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کر رہی ہے تاہم اسے بے لگام سرمایہ داری سے ہوشیار رہنا چاہیے کیونکہ وہ بھی کم خطرناک نہیں ہے۔

مشرقی یورپ کا کمیونزم

سلووینیا مشرقی یورپ کے سابق کمیونسٹ ملک یوگوسلاویہ کی ریاست ہے جو ربع صدی قبل کمیونزم کا بہت بڑا گڑھ سمجھا جاتا تھا اور اس کے سربراہ مارشل ٹیٹو عالمی سطح کے کمیونسٹ لیڈروں میں شمار ہوتے تھے۔ سوویت یونین کے خاتمہ کے بعد مشرقی یورپ کو اس کی آہنی گرفت سے نجات ملی تو سوویت کی طرح یوگوسلاویہ بھی بکھر گیا، اور اس کی ٹوٹ پھوٹ کا یہ عمل سربوں کے ہاتھوں بوسنیائی مسلمانوں کے وحشیانہ قتلِ عام کے حوالے سے تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش باب بن گیا۔ مشرقی یورپ کے ممالک کم و بیش پون صدی تک کمیونزم کے جہدی نظام کا شکار رہے ہیں، اور اب اس کے اثرات سے نجات حاصل کر کے سرمایہ دارانہ نظام کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ چنانچہ پوپ پال جان دوم نے انہیں خبردار کیا ہے کہ وہ بے لگام سرمایہ داری سے بچ کر رہیں کیونکہ وہ بھی کمیونزم سے کم خطرناک نہیں ہے۔

متوازن نظام قبول کرنے میں ہچکچاہٹ

پاپائے روم کا یہ ارشاد بجا ہے کیونکہ کمیونزم اور سرمایہ دارانہ دونوں انسانی معاشرہ کے لیے یکساں طور پر خطرناک ہیں، لیکن ان دونوں سے ہٹ کر انہوں نے کسی تیسرے نظام کی نشاندہی نہیں کی، اور یہ بتانے کی زحمت نہیں فرمائی کہ کمیونزم کے اثرات سے نجات حاصل کرنے والے ممالک اگر سرمایہ دارانہ نظام کی طرف نہ جائیں تو آخر کدھر کا رخ کریں؟

عالمی معیشت میں تیسرے نظام کی ضرورت پر ایک عرصہ سے بات ہو رہی ہے اور آزادانہ سرمایہ داری اور جبری معیشت کے بین بین "مخلوط معیشت" کا تذکرہ ماہرینِ معیشت کی زبانوں کے ساتھ ساتھ بعض ممالک کی پالیسیوں میں بھی ہونے لگا ہے، لیکن اس کی فکری بنیادوں کی نشاندہی میں سب کو ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد اباحیتِ مطلقہ پر ہے اور کمیونزم کا جبری نظام اسی کا ردِ عمل ہے، تو اباحت اور جبر کے درمیان توازن قائم کرنے کی فکری اساس کیا ہو گی؟ اور تیسرے نظام کے متلاشیوں کے پاس اس خلا کو پُر کرنے کے لیے کونسا فلسفہ اور نظریہ موجود ہے؟

اصل بات یہ ہے کہ یہ بات سب لوگ سمجھ چکے ہیں کہ متوازن تیسرے معاشی نظام کی فکری اساس مہیا کرنے کی صلاحیت اب اسلام کے سوا کسی کے پاس نہیں ہے، اور اسلامی تعلیمات ہی انسانی معاشرہ کو سرمایہ دارانہ نظام اور کمیونزم کی تباہ کاریوں سے نجات دلا سکتی ہیں۔ لیکن اسلام کا نام لینا ان کے لیے اس طرح مشکل ہو گیا ہے جس طرح مدینہ منورہ کے یہودی جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بحیثیت پیغمبر پہچانتے ہوئے بھی انہیں قبول کرنے میں حجاب محسوس کرتے تھے، مگر یہ حجاب اور ہچکچاہٹ اسلام کے راستے میں کب تک رکاوٹ بن سکے گی؟ شاید وقت کو اس کا فیصلہ کرنے میں اب زیادہ وقت درکار نہیں ہوگا۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔ اگست ۱۹۹۶ء)

غیر فطری نظاموں سے نجات کا راستہ

گزشتہ دنوں پوری دنیا میں مزدوروں کا عالمی دن منایا گیا۔ یہ دن شکاگو میں کچھ عرصہ قبل مزدور تحریک کے جاں بحق ہونے والے محنت کشوں کی یاد میں منایا جاتا ہے اور مزدور تحریکیں اپنے حقوق کے لیے جلوسوں اور مظاہروں کا اہتمام کرتی ہیں۔ محنت کشوں کے حقوق کے لیے چلائی جانے والی تحریکوں میں عام طور پر بائیں بازو کی چھاپ ہوتی ہے اور کمیونسٹ عناصر اس عنوان پر اپنے افکار و نظریات اور پروگرام کے تعارف کی راہ ہموار کرتے ہیں۔ پاکستان میں بھی یہ دن پورے اہتمام کے ساتھ منایا جاتا ہے اور دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح بائیں بازو کی نظریاتی قوتیں اس دن کو مزدوروں کی صفوں میں اثر و رسوخ بڑھانے کے لیے استعمال کرتی ہیں۔

کمیونزم ایک انتہا پسندانہ اور منتقمانہ نظام کا نام ہے جو سرمایہ دارانہ و جاگیردارانہ نظام کے مظالم کے ردعمل کے طور پر ظاہر ہوا ہے۔ محنت کشوں اور چھوٹے طبقوں کی مظلومیت اور بے بسی کو ابھارتے ہوئے اس نظام نے منتقمانہ جذبات اور افکار کو منظم کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے اور یہ کھیل اسلامی ممالک اور پاکستان میں بھی کھیلا جا رہا ہے۔

پاکستان سمیت مسلم ممالک میں سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام اپنی تمام تر خرابیوں اور مظالم کے ساتھ آج بھی نافذ ہے۔ اور اس ظالمانہ نظام نے انسانی معاشرت کو طبقات میں تقسیم کر کے انسان پر انسان کی خدائی اور بالادستی کا بازار گرم کر رکھا ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام اور کمیونزم کی اس کشمکش میں انصاف اور فطرت کا راستہ صرف اور صرف اسلام ہے

جو اعتدال اور توازن کے ساتھ انسانی معاشرہ کے تمام طبقات کو ان کے حقوق و مفادات کے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اسلامی نظام کے حقیقی فوائد و برکات سے محنت کشوں کو متعارف کرا کے انہیں کمیونزم کے دام ہمرنگ زمین سے نجات دلائی جائے۔ یہ وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے اور اس سلسلہ میں سب سے زیادہ ذمہ داری علماء کرام پر عائد ہوتی ہے کہ وہ اسلام کو ایک اجتماعی نظام کی حیثیت سے پیش کر کے غیر اسلامی نظاموں کی فریب کاریوں کو بے نقاب کریں۔

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور - مئی ۱۹۸۸ء)

یومِ مئی اور محنت کشوں کی بے کسی

یکم مئی ایک بار پھر آیا اور گزر گیا۔ یہ دن مزدوروں کے عالمی دن کے طور پر منایا جاتا ہے اور محنت کش پوری دنیا میں شکاگو کے ان مزدوروں کی یاد تازہ کرتے ہیں جو سرمایہ دارانہ نظام کے جبر و استحصال کے سامنے ڈٹ گئے تھے۔ اور اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے انہوں نے استحصالی طبقوں کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ محنت کشوں کو بھی اپنے جیسا انسان سمجھیں اور ان کے حقوق کا اعتراف کریں۔ حسبِ معمول اس سال بھی یکم مئی کو مزدوروں کی ریلیاں ہوئیں، اجتماعات کا اہتمام کیا گیا، اخبارات نے خصوصی ایڈیشن شائع کیے، راہنماؤں نے بیانات دیے، مزدور تنظیموں نے مطالبات دہرائے، اور پھر یہ ساری فائلیں لپیٹ کر اگلے سال یکم مئی کے لیے الماری کے محفوظ خانے میں رکھ دی گئیں۔

محنت کش اور تنخواہ دار طبقہ ہمارے معاشرے میں جس خوفناک معاشی دباؤ کا شکار ہے اس نے اس طبقہ کے لیے زندگی کو سزا بنا کر رکھ دیا ہے جسے وہ بہر حال بھگتنے پر مجبور ہے۔ محدود آمدنی اور ہوشربا مہنگائی کے دو پاٹوں کی اس چکی نے محنت کش اور تنخواہ دار لوگوں کا جس بری طرح کچومر نکالا ہے اس کی صحیح تعبیر کے لیے مناسب الفاظ کی تلاش بھی مشکل ہو گئی ہے۔ مگر ہمارے پاس ان کے لیے رسمی بیانات اور خوشنما وعدوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے اور نہ ہی ہم صورتحال کی اس سنگینی کے بارے میں سنجیدگی کے ساتھ سوچنے کے لیے تیار ہیں۔

معاشی و اقتصادی مشکلات اور خلافتِ راشدہ

اس مصیبت کے اسباب کو تلاش کرنا کچھ زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ اگر ہم سرمایہ دارانہ نظام، جاگیرداری سسٹم، اور سوشلزم و کمیونزم کی کشمکش کے دائروں سے نکل کر اسلام کے صاف اور شفاف سرچشمے کی طرف رجوع کریں تو سادہ، فطری، اور متوازن معیشت کی ایک ایسی شاہراہ ہمارے سامنے موجود ہے جو

انسانی معاشرہ کو آج بھی امن اور خوشحالی کی منزل تک پہنچانے کی ضمانت دیتی ہے۔ ہمارے اجتماعی نظام کی بنیاد خلافتِ راشدہ پر ہے۔ اور حضراتِ خلفائے راشدین حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، اور حضرت علیؓ نے سیاسی اور معاشی زندگی میں جو روایات ہمیں دی ہیں وہ نہ صرف ہمارے لیے بلکہ قیامت تک پوری نسلِ انسانی کے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ اور اپنی مشکلات و مصائب سے نجات حاصل کرنے کے لیے زود یا بدیر ہمیں بہرحال اپنی روایات کی طرف واپس پلٹنا ہوگا۔

- حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جب خلیفہ بنے تو ان کا ذریعہ معاش کپڑا بننا اور بیچنا تھا جسے وہ خلافت کی ذمہ داریوں کے ساتھ جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔ چنانچہ خلافت راشدہ کی پہلی مجلسِ شوریٰ نے ان کے لیے قومی خزانے (بیت المال) سے وظیفہ مقرر کیا۔ اس کے لیے اصول یہ طے پایا کہ خلیفہ محترمؓ کو مدینہ منورہ کے ایک عام شہری جیسی زندگی گزارنے کے لیے ضروریات فراہم کی جائیں۔
- حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلافت سنبھالی تو وہی اصول قائم رہا بلکہ انہوں نے ایک قدم آگے بڑھ کر اپنے گورنروں اور آفیسرز پر پابندی لگادی کہ ان میں سے کوئی باریک لباس نہیں پہنے گا، ترکی گھوڑے پر سوار نہیں ہوگا، گھر کے دروازے پر ڈیوڑھی نہیں بنائے گا، اور چھنے ہوئے آٹے کی روٹی نہیں کھائے گا۔ یہ باتیں اس دور میں معاشرتی طور پر امتیاز کی علامتیں (اسٹیٹس سیمبل) سمجھی جاتی تھی۔ گویا حضرت عمرؓ نے حکمران طبقہ اور سرکاری افسران کو حکماً پابند کر دیا کہ وہ ایک عام شہری جیسی زندگی گزاریں گے۔ حتیٰ کہ انہوں نے بعض حکام کو ان حدود سے تجاوز کرنے پر سزائیں بھی دیں۔
- حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مسندِ خلافت پر رونق افروز ہوئے تو وہ خود مالدار تھے اس لیے بیت المال سے وظیفہ نہیں لیتے تھے۔ ان کا شمار عرب کے مالدار ترین افراد میں ہوتا تھا لیکن انہوں نے عام لوگوں کی سی زندگی برقرار رکھی اور حکمرانی اور مالداری دونوں کے اجتماع کے باوجود عام شہریوں کے معیار زندگی سے دوری اختیار نہیں کی۔ وہ لوگوں کے درمیان عام آبادی میں رہے اور لباس و خوراک میں بھی واضح طور پر نظر آنے والا فرق پیدا نہیں ہونے دیا۔ اور یہ انہی کا واقعہ ہے کہ ایک موقع پر جمعہ کا خطبہ دینے کے لیے بہت تاخیر سے مسجدِ نبوی میں پہنچے اور منبر پر کھڑے ہوتے ہی سب سے پہلے یہ عذر پیش کیا کہ گھر سے وقت پر چل پڑا تھا مگر راستے میں ایک گھر کے پرنالے سے کپڑوں پر چھینٹے پڑ گئے۔ واپس گھر جا کر لباس دھویا اور غسل کیا، چونکہ دوسرا جوڑا موجود نہیں تھا اس لیے اس لباس کے خشک ہونے کے انتظار میں دیر ہوگئی ہے۔

- اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ تو تھے ہی "صاحب الفقر"۔ اس لیے ان کے بارے میں کسی واقعاتی شہادت کو تلاش کرنے کی سرے سے ضرورت ہی نہیں ہے۔

خلفائے راشدینؓ کے طرزِ عمل پر ایک نظر ڈالیے اور اندازہ کیجیے کہ انہوں نے سوسائٹی کے مختلف طبقات یعنی شہریوں، مالداروں، اور حکمران طبقہ کے معیارِ زندگی کو ایک دائرے میں رکھنے کی شعوری کوشش کی اور اس امر کا اہتمام کیا کہ ان طبقوں کے معیارِ زندگی میں کوئی واضح طور پر نظر آنے والا فرق پیدا نہ ہو۔ اور یہی وہ توازن ہے جسے نظر انداز کر کے ہم نے اپنی معیشت اور معاشرت دونوں کا بیڑا غرق کر لیا ہے۔

تنخواہوں کے تفاوت کا مسئلہ

معیارِ زندگی کو ایک متوازن دائرے میں پابند رکھنے کے ساتھ ساتھ تنخواہوں کا معیار بھی ایک بنیادی مسئلہ ہے۔ اور خلافتِ راشدہ اس سلسلہ میں ہمیں یہ اصول فراہم کرتی ہے کہ جو شخص اپنی صلاحیتوں اور خدمات کو اسٹیٹ کے لیے وقف کرتا ہے اس کی تنخواہ کم سے کم اتنی ضرور ہونی چاہیے کہ وہ سوسائٹی کے دوسرے افراد کی طرح زندگی بسر کر سکے اور اس کی ضروریات اس تنخواہ سے پوری ہوتی رہیں۔ مگر ہمارے ہاں ایسا نہیں ہے، اس لیے اپنے ضروری اخراجات کو پورا کرنے کے لیے محنت کش اور عام تنخواہ دار شخص کو حلال و حرام کے دائرے توڑتے ہوئے خدا جانے کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں تب کہیں وہ مہینہ پورا کر پاتا ہے۔ اس سلسلہ میں ایک محنت کش تنظیم کے عہدیدار کا یہ بیان توجہ طلب ہے جو اسی "یومِ مئی" کو کسی اخبار میں نظر سے گزرا ہے کہ جس معاشرے میں ایک ادارے کا اعلیٰ ترین افسر بارہ لاکھ روپے ماہانہ تنخواہ پاتا ہو اور اسی ادارے کے ایک معمولی ملازم کو دو ہزار روپے ماہانہ تنخواہ ملتی ہو، اس معاشرے میں کرپشن اور بددیانتی کو کون روک سکتا ہے؟ یہ بات سو فیصد درست ہے اور جب تک اس تفاوت کو کم نہیں کیا جائے گا کرپشن اور بدعنوانی پر قابو پانے کا کوئی منصوبہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔

محنت کش کی مجبوری اور امام ابوحنیفہؒ

پھر امام ابوحنیفہؒ تو ایک اور بات کہتے ہیں، ان کا ارشاد ہے "لا رضاء مع الاضطرار" کہ مجبوری کی حالت میں رضا کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ یعنی اگر کوئی شخص مجبوری اور اضطرار کی حالت میں اپنے حق سے کم پر راضی ہو جاتا ہے تو اس کی رضا کا شرعاً کوئی اعتبار نہیں ہے اور اسے اس کا وہ حق بہر حال ملنا چاہیے جس سے وہ مجبوری کی وجہ سے دستبردار ہو گیا ہے۔ اس اصول پر اگر مزدوروں اور چھوٹے ملازمین کی ملازمت کے معاہدوں کو پرکھا جائے تو وہ سارے کنٹریکٹ مشکوک ہو جاتے ہیں جو بے روزگار لوگوں نے فاقے

اور بھوک سے بچنے کے لیے مجبوراً سائن کیے ہیں۔ اور حکومت پابند ہوجاتی ہے کہ انہیں معاشرے میں ان جیسے دوسرے افراد کی طرح باعزت زندگی بسر کرنے کے لیے وہ تمام ضروریات فراہم کرے جو اس کے لیے ناگزیر ہیں۔

سالانہ بجٹ اور خوشحالی کا راستہ

بجٹ کی آمد آمد ہے اور پوری قوم سانس روکے اس عذاب کی آمد کی منتظر ہے کہ خدا جانے اب کے ہم پر کون سا قہر ٹوٹے گا۔ ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کے نمائندے اپنے لاؤ لشکر اور ہتھیاروں سمیت بجٹ تیار کرنے والے حکام کے سروں پر مسلط ہیں۔ ٹیکس بڑھانے، نرخوں میں اضافہ کرنے، کرنسی کی قیمت کم کرنے، ملازمین کی چھانٹی کرنے، سرکاری ادارے بیچ دینے، اور قومی فوج کی ڈاؤن سائزنگ کرنے کی تجاویز تلوار کی طرح قوم کے سروں پر لٹک رہی ہیں۔ ان حالات میں کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ہم اپنا قبلہ درست کر لیں اور ”پالیسی راہنمائی“ کے لیے ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کی دریوزہ گری کرنے کی بجائے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے مایہ ناز خلفائے راشدینؓ کا دروازہ کھٹکھٹائیں؟

ہمارے خیال میں اگر ہم مندرجہ ذیل تین اصولوں کو اپنا کر اس سمت اپنی قومی معیشت کا رخ موڑ لیں تو معاشی خود کفالت اور خوشحالی کے ساتھ ساتھ عالمی اداروں اور استعماری قوتوں کی معاشی غلامی سے نجات حاصل کرنے میں بھی چند برسوں سے زیادہ کا وقت درکار نہیں ہوگا۔

1. تعیش کے اسباب اور مظاہر پر قانوناً پابندی لگا کر معیارِ زندگی میں زیادہ سے زیادہ یکسانیت پیدا کرنے کے لیے عملی اقدامات کیے جائیں۔
2. تنخواہوں اور معاوضوں کا تعیّن معاشرہ میں باعزت زندگی کی معروف ضروریات کی بنیاد پر کرنے کا اصول تسلیم کیا جائے۔
3. تنخواہوں اور معاوضوں میں خوفناک تفاوت کو اگر کلیتاً ختم نہیں کیا جا سکتا تو اسے کم کر کے زیادہ سے زیادہ ایک اور پانچ کے تناسب پر لایا جائے۔

اگر ہم اس بجٹ میں اس سمت اپنا رخ موڑ سکیں تو یہ محنت کشوں کے لیے ”یومِ مئی“ کا حسین تحفہ ہوگا اور خوشگوار مستقبل کا پیغام بھی۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد-۱۱ مئی ۱۹۹۸ء)

مزدوروں کی محنت پر امیروں کی عیاشی کا استحصالی نظام

مزدوروں کا عالمی دن اس سال بھی آیا اور روایتی سرگرمیوں کے ساتھ گزر گیا۔ یہ دن ہر سال یکم مئی کو منایا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس دن شکاگو کے مظلوم مزدور استحصال پسندوں کے سامنے ڈٹ گئے تھے اور انہوں نے محنت کشوں کے حقوق کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر دیا تھا۔ انہی کی یاد میں اس دن کا اہتمام کیا جاتا ہے، جلسے ہوتے ہیں، سیمینار منعقد کیے جاتے ہیں، ریلیاں نکالی جاتی ہیں، مزدور انجمنیں اپنے مطالبات دہراتی ہیں، محنت کشوں کے حقوق کی حمایت میں بیانات جاری ہوتے ہیں، اخبارات خصوصی ایڈیشن شائع کرتے ہیں، ریڈیو اور ٹی وی پر خصوصی پروگرام نشر کیے جاتے ہیں اور این جی اوز ایک بار پھر محنت کشوں کے حق میں پریس ریلیز جاری کرتی ہیں۔

اس کے بعد یہ کیس ایک سال کے لیے پھر داخل دفتر ہو جاتا ہے۔ اگلا سال آئے گا، اس میں یکم مئی بھی ہو گا اور مزدوروں کو تسلیاں اور دلاسے دینے کے لیے ایک بار پھر ایک دن کے لیے ان کے بہت سے ہمدرد اور بہی خواہ نمودار ہو جائیں گے۔ اس دوران محنت کش کے شب و روز وہی رہیں گے، اس کے لیے دو وقت کی روٹی، تن ڈھانپنے کو کپڑے اور سر چھپانے کو جھونپڑی کا حصول اسی طرح دشوار تر ہوتا چلا جائے گا۔ اس کی محنت پر عیش کرنے والے عیش کرتے رہیں گے اور وہ خون پسینہ ایک کر کے معاشرہ کے چند افراد اور طبقات کو زندگی کی سہولتیں فراہم کرنے کے بعد خود جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے انہی کی بخشیش کا محتاج بنا رہے گا۔

معاشرے کا نظام محنت کش کے دم قدم سے

سوسائٹی کا سارا نظام محنت کش کے دم قدم سے ہے۔ کھیت ہو یا کارخانہ، بازار ہو یا گھر، اس کی محنت و مشقت کے مظاہر ہر طرف دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اگر نہ ہو تو کھیت، کارخانہ اور بازار ہر طرف ہو کا عالم ہو، چاروں طرف سناٹا ہو۔ باقی شعبوں کو چھوڑیں، ایک بظاہر معمولی سے شعبے کو دیکھ لیں۔ گلیوں اور نالیوں کی صفائی کرنے والا مزدور جسے ہر گزرنے والا حقارت سے دیکھ کر منہ دوسری طرف پھیر کر آگے نکل جاتا ہے، اگر وہ کام چھوڑ دے تو دو تین روز میں ہمارا کیا حشر ہو جائے؟ کپڑے دھونے اور استری کرنے والا میسر نہ آئے تو بہت سے بڑے گھروں پر قیامت بیت جائے۔ بوٹ پالش کرنے والا نہ ملے تو ہماری ساری اکڑفوں غائب ہو جائے۔ اور جون کی تپتی دوپہر میں تندور کی آگ میں اپنا چہرہ جھلسا کر روٹیاں پکانے والا منظر سے چند روز کے لیے غائب ہو جائے تو بہت سوں کو جان کے لالے پڑ جائیں۔

زندگی کے دوسرے شعبوں کو اسی پر قیاس کر لیجئے اور دیکھئے زندگی کی اس بھاری بھر کم عمارت کا بوجھ کس قدر اس محنت کش اور مزدور نے اٹھا رکھا ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ ہم اسے دیتے کیا ہیں؟ شب و روز محنت و مشقت کی چکی گھمانے والے ہاتھوں میں ان کی محنت کا کتنا صلہ آتا ہے؟

جناب نبی اکرمؐ کی ہدایت

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دور کے مزدوروں کے بارے میں جو غلام اور باندیاں کہلاتے تھے فرمایا تھا کہ

"جو خود کھاتے ہو ان کو کھلاؤ، جو خود پہنتے ہو ان کو پہناؤ، ان کی ہمت سے زائد کام ان پر نہ ڈالو، اور اگر کوئی کام ان کی ہمت سے بڑھ کر ہے تو خود ساتھ مل کر ان کا ہاتھ بٹاؤ۔"
(مسلم شریف)

ایک صحابیؓ نے حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میری لونڈی ایک پہاڑی پر میری بکریاں چرا رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ بھیڑیا آکر ایک بکری کو لے گیا اور وہ اس سے غافل رہی۔ مجھے غصہ آیا اور میں نے اسے تھپڑ رسید کر دیا۔ اب مجھے افسوس ہو رہا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس زیادتی کی تلافی میں اسے آزاد کر دوں۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم اسے آزاد نہیں کرو گے تو جہنم کی آگ تم سے لپٹ جائے گی۔

آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم نے غلام اور باندی کے لیے کہا کہ انہیں اپنے جیسا کھلاؤ اور اپنے جیسا پہناؤ۔

معاشرتی اور معاشی امتیاز کی چند جھلکیاں

آج دیکھنے کی بات یہ ہے کہ جو لوگ آج کے دور میں ہماری راحت اور سہولت کے لیے دن رات ایک کر دیتے ہیں اور سردی گرمی کی پرواہ کیے بغیر ہمیں زندگی کی سہولتیں فراہم کرنے میں لگے رہتے ہیں، ان کا کھانا پینا اور اوڑھنا پہننا ہم سے کس قدر مختلف ہے۔ ان کی رہائش، لباس، خوراک، رہن سہن اور بود و باش کا معیار کیا ہے؟ زیادہ دور جانے کی ضرورت نہیں، ایک ہی کوٹھی میں اس کے اصل مکینوں اور سرونٹ کوارٹر کے باسیوں کو دیکھ لیجئے، ساری حقیقت سامنے آجائے گی۔ کسی اعلیٰ افسر کے ایئر کنڈیشنڈ دفتر کے اندرونی ماحول اور اسی دفتر کے دروازے کے باہر ایک سادہ سے بنچ پر بیٹھے اردلی یا چوکیدار پر نظر ڈال لیجئے، سب کچھ واضح ہو جائے گا۔

دن رات محنت اور خدمت کرنے والے خادم کو ہم ایک ماہ کے بعد جو معاوضہ دیتے ہیں کیا وہ اس کی خدمت کا صحیح صلہ ہے؟ اور کیا وہ اس سے اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پال سکتا ہے؟ گھر میں کوئی بیمار ہو تو اس کا علاج کرا سکتا ہے؟ خاندان میں شادی بیاہ کے اخراجات پورے کر سکتا ہے؟ اور خوشی غمی میں اپنا حصہ ڈال سکتا ہے؟ وہ ذاتی خادم ہو، گھریلو نوکر ہو، کارخانہ کا مزدور ہو، کھیت کا ملازم ہو، دفتر کا کلرک ہو یا دکان کا خدمتگار ہو سب کا ایک جیسا حال ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ سال کے بعد یا شادی غمی کے موقع پر بونس کے نام سے یا زکوٰۃ کی رقم میں سے چند روپے اس کے ہاتھ میں تھما کر "مالک صاحب" حاتم طائی کی قبر پر لات مارتے ہیں اور اس محنت کار اور خادم کو ہمیشہ کے لیے اپنا ممنون احسان کر لیتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ کسی ملک کا دارالحکومت اس کے اجتماعی کلچر کا نمائندہ اور تصویر ہوتا ہے۔ اس حوالے سے اسلام آباد میں گھوم پھر کر دیکھئے کہ گریڈ سسٹم نے ایک ہی قوم کو کتنے طبقات میں تقسیم کر رکھا ہے؟ اور کوٹھیوں اور کوارٹروں کے فرق نے ایک ہی شہر میں رہنے والوں کے درمیان حجاب اور اجنبیت کی کتنی دیواریں کھڑی کر رکھی ہیں؟ یہ تقسیم کہاں سے آئی ہے؟ یہ تفریق کس نے پیدا کی ہے؟ صحابہ کرامؓ کے دور میں تو یہ تقسیم اور تفریق موجود نہیں تھی، جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بھی نہیں تھی۔ کوئی امیر ہے یا غریب، ایک ہی طرح کے مکان ہوتے تھے، ملتا جلتا لباس ہوتا تھا، ایک دوسرے سے بے تکلفی کے ساتھ ہاتھ ملاتے تھے، اکٹھے بیٹھ کر ایک ہی طرح کا کھانا کھا لیا کرتے تھے، کوئی پروٹوکول نہیں ہوتا تھا، کسی پر سٹیج کا سوال کھڑا نہیں ہوتا تھا، کوئی طبقاتی اونچ نیچ نظر نہیں آتی تھی۔ مگر ہمارا حال یہ ہے کہ گزشتہ دنوں ایک دفتر کے ملازم نے مجھے بتایا کہ دفتر میں کام کرنے والے عام ملازمین کے لیے یہ ہدایت ہوتی ہے کہ وہ اپنے لباس کا معیار افسروں سے مختلف اور فروتر رکھیں، تاکہ افسر اور ماتحت میں فرق نظر آئے۔

برتری کا جذبہ اور استحصال کا جنون

میں نے یوم مئی پر ہونے والی بہت سی تقریبات کی رپورٹ پڑھی ہے، متعدد بیانات اور قراردادیں میری نظر سے گزری ہیں، اخبارات کے خصوصی ایڈیشنوں پر بھی نظر ڈالی ہے، مگر اصل مسئلہ کی طرف توجہ دلاتے کوئی دکھائی نہیں دیا۔ بیماری کے اصل اسباب پر کوئی بات نہیں کر رہا اور اس کینسر کے حقیقی علاج کا تذکرہ کہیں نظر نہیں آ رہا۔ اس بیماری کا اصل سبب معاشرہ کی طبقاتی تقسیم ہے، چند انسانوں کا دوسروں پر بڑائی کا احساس ہے، برتری کا جذبہ ہے اور استحصال کا جنون ہے۔ اس جنون میں ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ جس کی خدمت اور محنت نے ہمارے اس جذبہ اور انا کو تسکین دے رکھی ہے وہ بھی انسان ہے، اس کے بھی بال بچے ہیں، اس کا جی بھی اچھا کھانے کو اور اچھا پہننے کو چاہتا ہے، وہ بھی بیمار ہوتا ہے اور اسے بھی

علاج کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، سردی اور گرمی سے بچنا اس کی بھی ضرورت ہے اور معاشرتی خوشیوں میں شریک ہونا اس کا بھی حق ہے۔

محنت کش کی زندگی جی کر دیکھیں

میں عرض کیا کرتا ہوں کہ ہمارے ہاں عام محنت کش کو اس کی محنت کا جو معاوضہ ملتا ہے، معاوضہ دینے والے یا معاوضہ کی مقدار طے کرنے والے زندگی میں صرف ایک بار تجربہ کے طور پر اتنی رقم میں اپنا ایک ماہ گزار کر دکھائیں۔ اگر جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق اسے اپنے جیسا نہیں کھلا سکتے تو صرف ایک ماہ اس جیسا کھا کر دیکھ لیں، اس جیسا پہن کر دیکھیں اور اس جیسے کوارٹر میں بچوں سمیت ایک ماہ رہ کر دیکھ لیں۔ صرف ایک بار صرف ایک ماہ کے لیے تجربہ کر کے دیکھیں۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو آقا اور غلام، افسر اور ماتحت، مالک اور مزدور اور زمیندار اور مزارع کے لیے یہی ہدایات دی ہیں کہ دونوں کے لباس، خوراک، رہائش و رہن سہن میں زیادہ فرق نہ ہو، مگر ہمارا سسٹم اس ہدایت کو قبول کرنے سے انکاری ہے اور ہمارا طرزِ زندگی اس ہدایت کا متحمل نہیں ہے۔ اس لیے اصل مسئلہ اس ظالمانہ سسٹم کا ہے، استحصالی نظام کا ہے، اور معاشرہ کی طبقاتی تقسیم کا ہے۔ جب تک اس کو جڑ سے نہیں اکھاڑا جائے گا اور جب تک خلافت راشدہ کے دور جیسا غیر طبقاتی معاشرہ وجود میں نہیں آئے گا، خودکشیاں اسی طرح ہوتی رہیں گی اور محنت کشوں کے خون پسینے کی کمائی اسی طرح چند طبقات اور افراد کی عیاشی کا ذریعہ بنتی رہے گی۔

یومِ مئی پر محنت کشوں کے حق میں بیانات دینے والوں اور ان کی حمایت میں اجتماعات کا اہتمام کرنے والوں سے گزارش ہے کہ بیماری کی اصل جڑ کو پکڑیں، اس استحصالی نظام کے خلاف آواز اٹھائیں جس نے محنت کش کو معاشرہ میں کمین اور چھوت بنا رکھا ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یہی ہے اور مسئلہ کا اصل حل بھی یہی ہے۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۶ مئی ۲۰۰۴ء)

ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

یکم مئی کو عام طور پر دنیا بھر میں محنت کشوں کے عالمی دن کے طور پر منایا جاتا ہے جو امریکہ کے شہر شکاگو میں مزدوروں کے حقوق کے لیے جانوں کی قربانی دینے والے مزدوروں کی یاد میں ہوتا ہے، اس میں مزدوروں اور محنت کشوں کے حقوق و مفادات کی بات ہوتی ہے اور محنت کشوں کی تنظیموں کے علاوہ

دیگر طبقات بھی ان کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کرتے ہیں۔

محنت اور مزدوری انسانی معاشرہ کی ضروریات میں سے ہیں اور زندگی کے اسباب مہیا کرنے کا ایک اہم ذریعہ ہے۔ بلکہ انسانی آبادی کی اکثریت کا ذریعۂ معاش یہی ہے کہ وہ معاوضہ پر دوسرے انسانوں کے کام کرتے ہیں اور وہ معاوضہ ان کا ذریعۂ معاش ہوتا ہے۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد کے مطابق حضرات انبیاء کرام علیہم السلام نے بھی محنت مزدوری کا کام کیا، بلکہ خود نبی اکرمؐ نے ایک دور میں مکہ مکرمہ کے بعض خاندانوں کی بکریاں معاوضہ پر چرائی تھیں۔ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی اکثریت کا مشغلہ یہی تھا۔

جمعہ کے لیے غسل کا پس منظر

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نماز جمعہ کی ادائیگی کے لیے غسل کو فرض اور بعد میں سنت قرار دیے جانے کی حکمت یہ بیان فرماتی ہیں کہ لوگ محنت مزدوری کیا کرتے تھے، لباس کے لیے ایک ہی جوڑا بلکہ بعض کے پاس صرف ایک چادر ہوتی تھی، محنت مزدوری میں پسینہ کی وجہ سے لباس اور جسم سے بدبو اٹھتی تھی، کام کرتے کرتے مسجد میں نماز جمعہ کے لیے آجایا کرتے تھے، مسجد چھوٹی اور چھت نیچی تھی، اس میں دوپہر کے وقت ہجوم سے بدبو کا عام ماحول بن جاتا تھا۔ اس پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ نمازِ جمعہ کے لیے غسل کر کے آیا کرو اور اگر میسر ہو تو دھلا ہوا لباس پہن کر آؤ تاکہ بدبو کا ماحول نہ بنے۔ بعد میں کچھ سہولت ہوئی، لباس کی متبادل چادریں میسر ہوئیں اور خود کام کرنے کی بجائے دوسروں سے معاوضہ پر کام لینے کی آسانی ہوئی تو ماحول میں فرق پیدا ہوا تو نماز جمعہ کے لیے غسل فرض کی بجائے سنت کا درجہ اختیار کر گیا۔

صحابہ کرامؓ کی تنگدستی اور خوشحالی کے دور

مدینہ منورہ میں ہجرت کے بعد مہاجر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی عمومی زندگی تنگ دستی اور فقر و فاقہ کی تھی۔ آہستہ آہستہ حالات بہتر ہونا شروع ہوئے اور پھر اللہ تعالیٰ نے وہ وقت بھی دکھایا کہ حضرت ابو مسعود انصاریؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اجتماعی کاموں کے لیے چندہ دینے کی بات فرمایا کرتے تھے تو ہم میں سے بہت سے لوگوں کے پاس کچھ بھی نہیں ہوتا تھا، ہم بازار جا کر لوگوں کی مزدوری کر کے تھوڑی بہت کمائی کرتے تھے، اس میں سے کچھ اپنے خرچہ کے لیے رکھ لیتے تھے اور باقی نبی کریمؐ کی خدمت میں پیش کر دیتے تھے۔ یہ بتا کر حضرت ابو مسعود انصاریؓ فرماتے ہیں کہ اب تو ہمارے پاس لاکھوں درہم موجود رہتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ کا بنیادی ذوق بلکہ مشغلہ بھی جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا، باتیں سننا، یاد رکھنا اور لوگوں تک پہنچانا تھا۔ گزر اوقات کے لیے ہفتہ میں ایک دو روز محنت مزدوری کر کے باقی ہفتہ اسی سے گزارتے تھے۔ جنگل سے لکڑیاں لا کر بازار میں بیچتے تھے۔ جن دنوں حضرت مروان بن الحکمؒ مدینہ منورہ کے گورنر تھے، حضرت ابوہریرہؓ ان کے دوست تھے اور معاون بھی تھے۔ گورنر صاحب جب کہیں باہر دورے پر جاتے تو حضرت ابوہریرہؓ کو قائم مقام گورنر بنا جاتے تھے۔ حضرت ابوہریرہؓ بہت خوش مزاج بزرگ تھے، ہلکی پھلکی دل لگی اور ہنسی مذاق ان کے مزاج کا حصہ تھا۔ قائم مقام گورنر ہوتے ہوئے ایک روز جنگل میں اپنے کام کے لیے گئے، لکڑیاں جمع کر کے ان کا گٹھڑ سر پر اٹھا کر بازار میں آ گئے اور آواز لگانا شروع کر دی "جاء الامیر، جاء الامیر" کہ لوگو! راستہ دو تمہارا امیر آ رہا ہے۔ یعنی خود ہی اپنی پروٹوکول ڈیوٹی دے رہے ہیں جو کہ ان کی خوش مزاجی کا اظہار تھا۔

محنت کشی، انبیاءؑ و اصحابؓ کا مشغلہ

عرض کرنے کا مطلب یہ ہے کہ محنت مزدوری کوئی عیب یا توہین کی بات نہیں، اپنی محنت کو ذریعۂ معاش بنانا حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا مشغلہ رہا ہے بلکہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ کی محنت سے حاصل ہونے والی کمائی کو بہترین کمائی قرار دیا ہے۔ اور حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا رسول اور ملک کا بادشاہ ہونے کے باوجود ہاتھ کی کمائی سے اپنا وقت چلاتے تھے۔

مگر مزدور اور محنت کش اس فضیلت اور عظمت کے باوجود ہمیشہ سے معاشرتی زیادتیوں کا شکار چلے آ رہے ہیں، ان کی حق تلفی ہر دور میں کسی نہ کسی عنوان سے جاری رہتی ہے، انہیں محنت کا معاوضہ کم ملتا ہے اور انہیں وہ معاشرتی عزت و وقار میسر نہیں ہوتا جو ان کا حق ہے۔ آج بھی دنیا کے حالات کافی بدل جانے کے باوجود اس صورتحال میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہے، جبکہ اس ہوشربا مہنگائی کے دور میں اس کا احساس دوچند ہوتا جا رہا ہے۔

اصلاحِ احوال کے لیے دو گزارشات

اس سلسلہ میں دو باتیں گزارش کرنا اس موقع پر ضروری محسوس ہوتی ہیں:

ایک یہ کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کا اپنا کام بازار میں پھیری لگا کر کپڑے بیچنا تھا، جو انہیں خلافت کی ذمہ داریوں میں مسلسل مصروفیت کے باعث ترک کرنا پڑا تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مشورہ سے اصحابِ شوریٰ نے خلیفہ کے لیے بیت المال سے وظیفہ مقرر کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور اس کا معیار یہ مقرر کیا کہ اتنا

وظیفہ دیا جائے جس سے وہ ایک عام شہری کے معیار پر باوقار زندگی بسر کر سکیں اور اپنا اور زیر کفالت افراد کا خرچہ چلا سکیں۔ اس سے فقہاء کرامؒ نے یہ اصول قائم کیا کہ جو شخص دوسروں کے کام کی وجہ سے اپنا کام نہ کر سکے اس کا گھر کا باوقار خرچہ کام لینے والوں کے ذمہ ہے جو اس دور کے ماحول کے مطابق ہونا چاہیے۔

دوسری بات حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ کے اس ارشاد کے حوالہ سے عرض کروں گا کہ "لا رضاء مع الاضطرار" یعنی مجبوری کی رضا کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ اس کا مطلب فقہاء کرامؒ یہ بیان فرماتے ہیں کہ کوئی شخص کسی مجبوری یا لاچاری کی وجہ سے اپنے جائز حق سے کم پر راضی ہو گیا ہے تو اس کی اس رضا کا کوئی اعتبار نہیں ہے، اسے وہی کچھ ملنا چاہیے جو اس کا حق بنتا ہے۔

میری طالبعلمانہ رائے میں آج کے دور میں محنت اور ملازمت دونوں دائروں میں اس اصول کو اختیار کرنا ضروری ہے کہ کسی مزدور، کسان یا ملازم کو اس کے کام کا اتنا معاوضہ ملنا ضروری ہے جو اس کے اپنے اور زیر کفالت افراد کی باوقار گزر بسر کے لیے کافی ہو۔ اور اگر کوئی شخص مجبوری کی وجہ سے اپنے اس حق سے کم پر راضی ہو گیا ہے تو اس کی رضا کو کافی سمجھنے کی بجائے اس کے جائز حق کی ادائیگی معاشرہ اور قانون کی ذمہ داری بنتی ہے جسے ریاست اور نظام کو ادا کرنا چاہیے۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۳۰ اپریل ۲۰۲۳ء)

ہجرت و پناہ گزینی، کل اور آج

اقوامِ متحدہ کی رپورٹ

ہفت روزہ "پاکستان پوسٹ" نیویارک نے جون ۲۰۱۱ء کے آخری شمارے میں پناہ گزینوں کے بارے میں اقوامِ متحدہ کے ہائی کمیشن کی سالانہ رپورٹ کی کچھ تفصیلات شائع کی ہیں جو پناہ گزینوں کے عالمی دن کے موقع پر جاری کی گئی ہیں۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ دنیا میں اس وقت ایک کروڑ پچپن لاکھ افراد اپنا گھر بار چھوڑ کر دوسرے ممالک میں پناہ لینے پر مجبور ہیں اور ان پناہ گزینوں میں سے ۸۰ فیصد کے میزبان غریب ممالک ہیں۔ جبکہ ۲۰۱۰ء کے دوران پونے تین کروڑ افراد اندرونِ ملک نقل مکانی پر مجبور ہوئے اور ساڑھے آٹھ لاکھ سے زائد افراد نے مختلف ممالک میں سیاسی پناہ طلب کی۔ رپورٹ کے مطابق ڈیڑھ کروڑ سے زیادہ پناہ گزینوں میں سے ایک چوتھائی سے زیادہ افراد پاکستان، ایران اور شام میں پناہ لیے ہوئے ہیں اور پاکستان میں دنیا کے کسی بھی ملک سے زیادہ پناہ گزین مقیم ہیں۔

اقوام متحدہ کے ہائی کمشنر برائے پناہ گزیناں انتونیو گزز کا کہنا ہے کہ اگرچہ ترقی یافتہ مغربی ممالک پناہ گزینوں کی ممکنہ آمد کے حوالے سے خدشات کا اظہار کرتے رہتے ہیں لیکن ان کے یہ خدشات درست نہیں کیونکہ دنیا میں پناہ گزینوں کا زیادہ تر بوجھ غریب ممالک ہی اٹھا رہے ہیں۔ ہائی کمشنر کے بقول اگرچہ بڑے پیمانے پر نقل مکانی سے مسائل کھڑے ہوتے ہیں لیکن مغربی ممالک حالات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں کیونکہ وہ خود بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں۔

رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ۱۹۵۰ء میں کمیشن کے قیام کے بعد سے حالات بہت بدل چکے ہیں۔ اس وقت دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے نقل مکانی کرنے والوں کی تعداد اکیس لاکھ تھی مگر اب ڈیڑھ کروڑ سے زیادہ افراد نقل مکانی کر کے دوسرے ملکوں میں پناہ لیے ہوئے ہیں۔ ان میں اگر اندرون ملک نقل مکانی پر مجبور ہونے والوں کو بھی شامل کیا جائے تو یہ تعداد چار کروڑ سینتیس لاکھ تک جا پہنچتی ہے اور سیاسی پناہ طلب کرنے والوں کی تعداد ساڑھے آٹھ لاکھ کے لگ بھگ ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ دنیا بھر میں پناہ گزینوں کی ایک تہائی تعداد فلسطینیوں کی ہے جو پچاس لاکھ کے لگ بھگ کی تعداد میں دنیا کے مختلف حصوں میں قیام پذیر ہیں۔ ان کے بعد بیس فیصد افغانستان کے لوگ ہیں جن کی زیادہ تر تعداد پاکستان اور ایران میں ہے۔ پھر عراق سے سترہ لاکھ، صومالیہ سے سات لاکھ ستر ہزارہ اور کانگو سے پونے پانچ لاکھ پناہ گزین ہمسایہ ممالک میں ہیں۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ہمسایہ ممالک اکثر ان پناہ گزینوں کو اپنے ہاں سیاسی پناہ نہیں دیتے جس سے وہ ان معاشروں میں ضم نہیں ہو پاتے اور ان کی مشکلات میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ہائی کمشنر کا کہنا ہے کہ پناہ دینے والے غریب ممالک کی سخاوت قابل تعریف ہے اس لیے کہ ان میں اکثر وہ ممالک ہیں جن کے وسائل خود ان کی آبادی کے لیے بھی کافی نہیں ہیں۔

اسباب و محرکات، تاریخی حوالے سے

ہجرت اور پناہ گزینی کی تاریخ بہت پرانی ہے اور عام طور پر تین چار باتیں اس کے بڑے اسباب کے طور پر شمار کی جاتی ہیں:

1. اپنے عقیدہ و ایمان کے مطابق زندگی بسر کرنے میں رکاوٹ کی وجہ سے بہت سے لوگ ترکِ وطن پر مجبور ہوتے ہیں، اور ہماری شرعی اصطلاح میں اسے ''ہجرت'' کے عنوان سے تعبیر کیا جاتا ہے۔
2. معاشی تنگی، قحط سالی اور ضروریاتِ زندگی فراہم نہ ہونے کی وجہ سے لوگ ترکِ وطن پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

3. سیاسی مخالفین کے تسلط، ریاستی جبر اور خانہ جنگی کے باعث بھی بہت سے لوگوں کو وطن چھوڑنا پڑتا ہے۔
4. بہتر معاش کی تلاش میں لوگ دوسرے وطن میں جا بستے ہیں، لیکن اس آخری صورت کو پناہ گزینی کے دائرے میں شمار نہیں کیا جاتا کیونکہ یہ اختیاری ہوتی ہے اور جبر یا دباؤ کا عنصر اس میں شامل نہیں ہوتا۔

سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بابل کے حکمران نمرود اور اپنے والد آذر کے جبر سے مجبور ہو کر اپنے عقیدہ اور ایمان کی خاطر فلسطین کی طرف ہجرت کی تھی۔ جس میں ان کی اہلیہ محترمہ حضرت سارہؓ اور بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام ان کے ساتھ تھے، جبکہ راستہ میں مصر کے بادشاہ کی طرف سے ہدیہ کی جانے والی حضرت ہاجرہؓ بھی اس قافلہ کا حصہ بن گئی تھیں۔ قرآن کریم نے اس ہجرت کی وجہ کے طور پر وہ مکالمہ بیان کیا ہے جو باپ اور بیٹے یعنی حضرت ابراہیمؑ اور ان کے والد آذر کے درمیان ہوا تھا اور جس میں توحید کی دعوت دینے پر باپ نے بیٹے کو دھمکی دی تھی کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دے ورنہ میں تجھے سنگسار کر دوں گا۔ چنانچہ حضرت ابراہیمؑ اپنے باپ کو الوداعی سلام کہہ کر گھر سے رخصت ہو گئے تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے خاندان بنی اسرائیل کی حمایت میں حکمران خاندان سے تعلق رکھنے والے ایک قبطی کے بلا ارادہ قتل ہو جانے پر اپنی جان کے تحفظ کے لیے وطن چھوڑنا پڑا تھا۔ اور وہ دس سال تک مدین میں حضرت شعیب علیہ السلام کی خدمت میں رہنے کے بعد ان کی دختر سے شادی کر کے وطن واپس پلٹے تھے اور راستے میں کوہِ طور پر نبوت سے سرفراز ہوئے تھے۔

بابل کے حکمران بخت نصر نے بیت المقدس پر حملہ کر کے اسے تاخت و تاراج کر دیا تھا اور مقدس عبادت گاہ سمیت پورے شہر کو ملیامیٹ کر کے ہزاروں یہودیوں کو قیدی بنا کر بابل لے گیا تھا جو ''جبری ہجرت'' کی ایک شکل تھی۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر جب قرآن کریم اور توحید کی طرف دعوت دینے پر اہلِ مکہ نے ظلم و ستم کا بازار گرم کر دیا اور آنحضرتؐ کے ساتھ آپؐ کے ساتھیوں کو بھی مسلسل ظلم و ستم کا نشانہ بنایا گیا تو صحابہ کرامؓ کی اچھی خاصی تعداد جناب نبی کریمؐ کے حکم پر حبشہ کی طرف ہجرت کر گئی تھی۔ جہاں کے عیسائی بادشاہ اصحمہؓ نے نہ صرف انہیں سیاسی پناہ دی اور انہیں واپس لے جانے کے لیے آنے والے قریش کے وفد کو ناکام واپس کر دیا بلکہ جناب رسول اللہؐ کی تعلیمات اور قرآن کریم سے متاثر ہو کر اسلام بھی قبول کر لیا تھا۔

پھر مدینہ منورہ (یثرب) کی طرف جناب رسول اکرمؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کی ہجرت تو اسلامی تاریخ کا

ایک انتہائی روشن باب ہے جس کے نتیجے میں پہلی باقاعدہ اسلامی ریاست قائم ہوئی اور رفتہ رفتہ یہ بستی پوری دنیائے عرب کا سب سے بڑا سیاسی اور تہذیبی مرکز بن گئی اور قیامت تک کے مسلمانوں کے لیے محبوب شہر قرار پائی۔ اس ہجرت میں مدینہ منورہ کی لوکل مسلم آبادی نے، جو انصارِ مدینہ کے لقب سے متعارف ہوئے، ایثار و قربانی کا وہ مظاہرہ کیا اور اس محبت و اعتماد کے ساتھ اپنے مہاجر بھائیوں کو سنبھالا کہ نسلِ انسانی کی تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

آج کے عالمی تناظر میں دو گزارشات

مگر ماضی کی ان حسین یادوں میں محو ہونے کی بجائے پناہ گزینی کے موجودہ عالمی تناظر میں ایک دو گزارشات پیش کرنا چاہوں گا:

1. ایک یہ کہ آج پناہ گزینوں کی مجموعی تعداد کا ایک تہائی حصہ فلسطینیوں پر مشتمل ہے جو یہودیوں کے ہاتھوں دنیا میں دربدر ہوئے ہیں۔ جبکہ کم و بیش ایک ہزار برس تک دنیا نے یہ منظر کھلی آنکھوں سے دیکھا کہ مسیحی حکومتوں کے ریاستی جبر اور خوفناک عناد کا شکار ہونے والے یہودیوں کے لیے سب سے بڑی پناہ گاہ اندلس کی مسلم حکومت اور ترکی کی خلافتِ عثمانیہ رہی ہے۔ اور خود یہودی مؤرخین کے بقول اس دور میں اندلس اور پھر ترکی ان کی سب سے محفوظ پناہ گاہیں تھیں۔ اسے تاریخ کی ستم ظریفی یا یہودی قوم کی روایتی غدر مزاجی کے علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ آج انہی یہودیوں کے ہاتھوں پچاس لاکھ کے لگ بھگ فلسطینی مسلمان دنیا کے مختلف ملکوں میں پناہ گزین کے ٹائٹل کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہیں۔
2. دوسری گزارش یہ ہے کہ اقوامِ متحدہ کے ہائی کمیشن کے جاری کردہ اعداد و شمار کا ہلکا اور سرسری جائزہ لیا جائے تو ڈیڑھ کروڑ سے زیادہ پناہ گزینوں میں مسلمانوں کی تعداد ایک کروڑ کے لگ بھگ بنتی ہے جو کم و بیش دو تہائی ہے۔ یہ بات آج کی مسلم امہ کے لیے صرف لمحۂ فکریہ نہیں بلکہ ایک عظیم المیہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہمارے خیال میں اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ مسلمان آج عالمی سطح پر سیاسی مرکزیت سے محروم ہیں۔ ہم نے خلافت سے دستبردار ہو کر سیاسی مرکزیت کے جو متبادل راستے تلاش کیے تھے وہ دشمن کا دام ہمرنگ زمین ثابت ہوئے ہیں اور ہم اپنے گرد خود اپنے ہی بنے ہوئے جال میں مسلسل پھڑپھڑائے جا رہے ہیں۔

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۱۷ جولائی ۲۰۱۱ء)

کلہ بہ زئی؟

افغان مہاجرین سے ایک سوال

محترم میجر (ر) سہیل پرویز نے گزشتہ روز اپنے کالم میں افغان مہاجرین کے حوالہ سے ایک خوبصورت سوال اٹھایا ہے کہ "کلہ بہ زئی؟" (یعنی واپس کب جاؤ گے؟)۔ میجر صاحب کا ارشاد ہے کہ افغان مہاجرین جب روسی جارحیت کا شکار ہونے کے بعد ہجرت کر کے پاکستان آئے تو پاکستانی عوام نے ان کا خیر مقدم کیا تھا۔ لیکن ان مہاجرین میں ایسے لوگ بھی بڑی تعداد میں آ گئے جنہوں نے پاکستان میں جائیدادیں خریدنے اور کاروبار بڑھانے کے سوا کوئی کام نہیں کیا، اور اب یہ لوگ پاکستانی قوم کے لیے وبال جان بنتے جا رہے ہیں۔ اس لیے انہوں نے اس مبینہ عوامی پریشانی کا ذکر کرتے ہوئے اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ

> "بائیس سال پہلے سرحد پار سے آنے والے اپنے مہمانوں کی آمد پر اگر ہم خوش ہوئے تھے تو للہ اب ہمیں یہ موقع بھی کوئی فراہم کرے کہ ہم ان کی رخصتی پر بھی مسرور ہوں"۔

ہجرت کی شرعی حیثیت

جہاں تک ہجرت کا تعلق ہے میجر صاحب کو یہ بات یقیناً معلوم ہوگی کہ شرعاً ہجرت کے ساتھ ہی مہاجر کا تعلق اپنے وطن کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ فقہی احکام کی رو سے شرعی ہجرت کی صورت میں اپنے سابقہ مکانوں اور جائیدادوں کے ساتھ ان کا کوئی تعلق باقی نہیں رہ جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنے رفقاء کے ہمراہ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت کی تو اگرچہ صرف آٹھ برس کے بعد مکہ مکرمہ میں ان کا اقتدار قائم ہو گیا تھا اور وہ فاتح کی حیثیت سے دوبارہ مکہ مکرمہ میں داخل ہو گئے تھے لیکن جناب رسول اللہؐ سمیت ان مہاجرین میں سے کسی نے مدینہ منورہ کو چھوڑ کر دوبارہ مکہ مکرمہ کو وطن نہیں بنایا تھا اور اپنی ہجرت پر قائم رہے تھے۔ انہیں فتح مکہ سے پہلے اور اس کے بعد بھی مدینہ منورہ کی آبادی کے ایک حصے کی طرف سے مسلسل یہ طعنے سننے پڑے تھے کہ یہ مہاجرین ہم پر بوجھ بن گئے ہیں اور انہیں اب مدینہ منورہ سے چلے جانا چاہیے۔ حتیٰ کہ مسلمانوں کی صفوں میں شامل ایسے بعض افراد کے طعنوں کا خود قرآن کریم نے بھی تذکرہ کیا ہے۔ مگر اس سب کچھ کے باوجود رسول اکرمؐ اور

ان کے مہاجر ساتھیوں نے مکہ مکرمہ واپس جانا قبول نہیں کیا تھا اور ہجرت کا شرعی مسئلہ بھی یہی ہے۔

مہاجرین اور مفاد پرستوں میں فرق کرنے کی ضرورت

اس لیے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ افغان مہاجرین کی ایک بڑی تعداد جو اپنے وطن کے حالات کچھ بہتر ہونے پر واپس چلی گئی ہے ہمیں ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیے اور انہیں خراجِ تحسین پیش کرنا چاہیے۔ ورنہ اگر وہ اڑ جاتے اور ہجرت کے شرعی احکام کا عذر ہمارے سامنے رکھ دیتے تو ہمارے پاس انہیں زبردستی واپس بھیجنے کا کوئی شرعی جواز نہ تھا۔

ہم اصولاً اس بات سے متفق ہیں کہ افغانستان کے حالات سازگار ہونے پر افغان مہاجرین کو وطن واپس لوٹ جانا چاہیے اور ہمارے خیال میں جن علاقوں کے حالات سازگار ہوئے ہیں وہاں کے مہاجرین کی اکثریت واپس جا چکی ہے۔ اور اب صرف ان صوبوں کے لوگ یہاں رہ گئے ہیں جہاں کے حالات ابھی مہاجرین کی واپسی کے لیے سازگار نہیں ہیں۔ یا ایسے لوگ باقی ہیں جو شروع سے ہی ہجرت کی نیت سے نہیں بلکہ ہجرت کے نام پر مفادات اٹھانے، کاروبار چمکانے، اسلحہ و منشیات کی سمگلنگ کرنے اور گند پھیلانے کے لیے آئے تھے۔ اور ان کے تعلقات یہاں اپنے مزاج اور قماش کے لوگوں سے ہو گئے تھے اس لیے انہیں اپنے مقاصد پورے کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی اور نہ ہی وہ اب وہ یہاں سے واپس جانے کے لیے تیار ہیں کیونکہ ان کے بھائی بند یہاں ہر شعبے میں موجود ہیں اور انہیں پورا تحفظ فراہم کر رہے ہیں۔ اس لیے اگر اس قسم کے مفاد پرست افراد کو یہاں سے نکل جانے کے لیے کہا جائے بلکہ ان کے اخراج کے لیے قانون سازی کا بھی کوئی مرحلہ آئے تو ہم اس کی حمایت کریں گے۔

لیکن ایسا کوئی افغان بھائی جو واقعتاً ہجرت کی نیت سے پاکستان آیا تھا، اس نے یہاں پاکستان کے عوام اور حکومت کے لیے مشکلات پیدا کرنے کی بجائے شریف شہری کے طور پر وقت گزارا ہے اور اس کا ریکارڈ درست ہے تو اگر وہ یہاں رہنا چاہتا ہے تو یہ نہ صرف اس کا شرعی حق ہے بلکہ آج کے مروجہ بین الاقوامی قوانین بھی اسے یہ حق دیتے ہیں کہ اتنا عرصہ پاکستان میں شریف اور قانون کا احترام کرنے والے شہری کے طور پر رہنے کے بعد وہ یہاں کی شہرت حاصل کر سکے۔

پھر یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ افغان مہاجرین ہمارے پاس پاکستان میں آنے والے پہلے مہاجرین نہیں ہیں، اس سے قبل مشرقی پنجاب، یوپی، بہار اور مقبوضہ کشمیر کے لاکھوں مہاجرین یہاں آ چکے ہیں اور پاکستانی معاشرہ میں ضم ہو کر شریف شہریوں کے طور پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ وہ کاروبار بھی کرتے ہیں، انہوں نے جائیدادیں خرید رکھی ہیں، ان میں سے بہت سے لوگ ٹرانسپورٹ کے شعبہ سے

وابستہ ہیں اور ان کے کچھ افراد بھی سمگلنگ، لاقانونیت اور دیگر غیر قانونی و غیر اخلاقی سرگرمیوں میں ملوث پائے جاتے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ کشمیر جلد آزاد ہو اور ہمارے کشمیری بھائی قومی آزادی کی نعمتِ عظمیٰ سے جلد از جلد سرفراز ہوں، لیکن کیا کشمیر کے آزاد ہو جانے کے بعد پاکستان بھر میں پھیلے ہوئے لاکھوں کشمیری بھائیوں کے لیے بھی محترم میجر (ر) سہیل پرویز صاحب انہیں وبالِ جان قرار دیتے ہوئے ان سے سوال کریں گے کہ ''وہ کب واپس جا رہے ہیں؟''

اس لیے اس حوالہ سے ہمارا موقف یہ ہے کہ ہمارے جو بھی مسلمان بھائی خواہ کشمیری ہوں یا افغان، پاکستان آ گئے ہیں اور ہمارے قانون اور اقدار و روایت کی پابندی قبول کرتے ہیں، انہیں یہ حق حاصل ہونا چاہیے کہ وہ اپنے ملک کے حالات درست ہونے کے بعد بھی اگر یہاں رہنا چاہیں تو آزادی کے ساتھ رہ سکیں۔

کلہ بہ زئی کا سوال سامراج سے

البتہ میجر (ر) سہیل پرویز صاحب کا یہ خوبصورت سوال ''کلہ بہ زئی؟'' کچھ اور لوگوں کے سامنے پیش کرنے کو جی چاہتا ہے جو دو صدیاں قبل تجارت کے بہانے یہاں آئے تھے اور مسلسل سازشیں کر کے ہماری آزادی اور خود مختاری غصب کرنے کے بعد ہمارے مالک بن بیٹھے تھے۔ انہوں نے ہمارے قانون اور اقدار و روایات کی پابندی کرنے کی بجائے انہیں جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے اپنا پورا زور صرف کیا اور اپنے نظام و قوانین کو طاقت کے زور سے ہم پر مسلط کر دیا۔ انہوں نے ہماری صنعت و تجارت کے نظام کو تباہ و برباد کر کے اپنی تجارت اور صنعت کا سکہ جمایا، ہمارے وسائل اور دولت کی وحشیانہ لوٹ مار کر کے اپنی تجوریاں بھریں اور ہمیں اپنے ہی ملک میں خود اپنے وسائل اور دولت سے براہ راست اور آزادانہ استفادہ کرنے کے حق سے محروم کر دیا۔ انہوں نے جب یہ سمجھا کہ اب ان کا خود یہاں زیادہ دیر رہنا ممکن نہیں رہا تو اپنی جگہ اپنی ''پونگ'' کو ہماری گردنوں پر سوار کر دیا جو پیر تسمہ پا بن کر ہمارے کندھوں مسلط ہے۔ اور اس کی راہنمائی اور نگرانی و کنٹرول کے لیے بدیشی آقاؤں کی ایک پوری فوج ظفر موج سفار تکاروں، اقتصادی مشیروں، این جی اوز، فنی ماہرین اور دانشوروں کی شکل میں ملک کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی ہے۔ ان کا ہمارے ساتھ اعتقادی، فکری، تہذیبی یا جغرافیائی کسی لحاظ سے کوئی رشتہ نہیں ہے لیکن وہ زبردستی ہمارے مہمان بلکہ وی وی آئی پی مہمان بنے بیٹھے ہیں۔ اس لیے جی چاہتا ہے کہ راقم الحروف اور محترم میجر (ر) سہیل پرویز مل کر ایک مشترکہ کالم لکھیں جس میں زبردستی کے اس ''مہمان وبال جان'' کی چیرہ دستیوں اور ستم ظریفیوں کا حوالہ دیتے ہوئے اس سے یہ سوال کیا جائے کہ ''کلہ بہ زئی؟''

واپس کب جاؤ گے ؟

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد- یکم فروری ۲۰۰۰ء)

افغان مہاجرین کی وطن واپسی

روس اور امریکہ کے خلاف ۱۹۸۰ء کی دہائی سے جاری افغان مجاہدین کی مسلسل جنگ اور جہاد کے دوران بے شمار افغان کنبے اور عوام نے پاکستان کی طرف ہجرت کی اور گزشتہ کم و بیش چار عشروں سے ملک کے مختلف حصوں میں رہتے چلے آرہے ہیں۔ افغانستان سے روسی فوجوں کی واپسی کے بعد ان سے تقاضہ کیا گیا کہ وہ حالات بہتر ہونے کے باعث اپنے ملک واپس چلے جائیں، جس پر لاکھوں مہاجرین واپس چلے گئے۔ مگر اس کے بعد ایک عرصہ تک باہمی خانہ جنگی اور پھر امریکی فوجوں کی یلغار کے باعث سب مہاجرین کے لیے واپس جانا ممکن نہ رہا اور ابھی تک افغان مہاجرین کا بڑا حصہ پاکستان کے مختلف علاقوں میں قیام پذیر ہے۔ اس دوران غیر قانونی طور پر رہنے والوں اور جرائم پیشہ افراد نے، جو ہر قوم اور ہر طبقہ میں ہمیشہ پائے جاتے ہیں، ہمارے ہاں کے اس مزاج کے لوگوں کے تعاون سے اسمگلنگ، دہشت گردی اور قانون شکنی کا ماحول بنا لیا، جو بہر حال وطنِ عزیز کے لیے بہت سے حوالوں سے نقصانات کا باعث بنا ہوا ہے۔ اس پر حکومتِ پاکستان نے گزشتہ دنوں غیر قانونی طور پر رہنے والے افغان باشندوں کو پاکستان سے نکل جانے کے لیے وقت دیا اور پھر ان کی یہاں سے ریاستی طور پر رخصتی کا عمل شروع کر دیا جو اَب تک جاری ہے۔

راقم الحروف نے اس سلسلہ میں اسلام آباد میں وفاقی وزیر مذہبی امور جناب انیق احمد سے پاکستان شریعت کونسل کے ایک وفد کے ہمراہ ملاقات کر کے ان سے عرض کیا کہ غیر قانونی اور جرائم پیشہ افراد کے خلاف کاروائی کو ہم بھی قومی ضرورت سمجھتے ہیں اور دہشت گردی، قانون شکنی اور اسمگلنگ کے جرائم کے مرتکب افراد کے خلاف اقدامات کی مکمل حمایت کرتے ہیں، مگر اسے افغانوں کے خلاف عمومی کاروائی کا تاثر دینا اور اس کا ماحول قائم ہونا ہمارے نزدیک قومی مفاد میں نہیں ہے، کیونکہ اس خطہ کے بارے میں مختلف عالمی اور علاقائی ایجنڈوں کے تناظر میں اس کے نتائج و ثمرات ہم سب کے لیے بہر حال نقصان دہ ہوں گے۔ ہمیں امید ہے کہ حکومتِ پاکستان اور متعلقہ ادارے اس اہم معاملہ میں حساس پہلوؤں کو سامنے رکھتے ہوئے ہماری اس گزارش پر سنجیدگی سے توجہ دیں گے۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔ دسمبر ۲۰۲۳ء)

انسانی اسمگلنگ کا معاملہ

اقوامِ متحدہ کی رپورٹ

روزنامہ جنگ راولپنڈی کے ۱۶ جون ۲۰۱۰ء کے شمارے میں شائع ہونے والی ایک خبر کے مطابق اقوامِ متحدہ نے کہا ہے کہ انسانوں کی تجارت جدید دور میں غلامی کی ایک شکل ہے اور یہ لعنت دنیا کے ہر علاقے میں موجود ہے۔ جنیوا میں اقوام متحدہ کی ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ محنت، مشقت اور جنسی استحصال کے لیے مردوں، عورتوں اور بچوں کی اسمگلنگ اور ان کی خرید و فروخت مجرموں کے منظم گروہوں کے لیے پیسہ بنانے کا سب سے بڑا ذریعہ بن گیا ہے، انسانی تجارت کا شکار ہونے والی اکثر لڑکیوں کو مکروہ دھندے میں ڈال دیا جاتا ہے، انسانوں کی تجارت جتنی عام ہے اتنی ہی اس کے بارے میں معلومات کم ہیں، یہ گھناؤنا کاروبار اتنا چوری چھپے کیا جاتا ہے کہ کوئی نہیں جانتا کہ کتنے لوگ اس کا شکار ہوتے ہیں، لیکن انٹرنیشنل لیبر آرگنائزیشن نے اندازہ لگایا ہے کہ سات سے چالیس لاکھ تک انسان ہر سال بین الاقوامی سرحدوں کے آر پار پہنچائے جاتے ہیں۔

مسئلہ غلامی، اسلامی نقطۂ نظر سے

انسانوں کی خرید و فروخت کا یہ مکروہ کاروبار بہت پرانا ہے اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بھی تھا، حضرت سلمان فارسیؓ اور حضرت زید بن حارثہؓ جیسے بزرگ اسی کے نتیجے میں غلامی کے مراحل سے گزرے تھے۔ مگر جناب نبی اکرمؐ نے "بیع الحر حرام" کے اعلان کے ساتھ آزاد انسانوں کی تجارت کو ممنوع قرار دے دیا اور یہ قیامت تک حرام ہے۔ البتہ جنگی قیدیوں کے حوالہ سے (۱) انہیں آزاد کر دینے (۲) فدیہ وصول کرنے یا (۳) غلام بنا لینے کی مختلف صورتوں میں، حکم کے طور پر نہیں، بلکہ ایک آپشن کے طور پر باقی رکھا۔ اور اس کے لیے بھی غلاموں کے حقوق اور ان کے آزادی کے حق سے متعلقہ ایسے قوانین و احکام اسلامی شریعت کا باضابطہ حصہ ہیں جن کے ذریعے غلامی کی مضرت کو کم سے کم کرنے کی مربوط حکمتِ عملی اختیار کی گئی ہے اور اس کے خاتمہ کی بتدریج راہ ہموار کی گئی ہے۔

مغرب کو غلامی کی اس محدود اور اختیاری شکل پر ہمیشہ اعتراض رہا ہے اور اسے اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کے طور پر ہر دور میں استعمال کیا گیا ہے، لیکن آزاد انسانوں کی تجارت خود مغرب میں ایک صدی قبل تک کھلم کھلا ہوتی رہی ہے اور اس بردہ فروشی کو ختم کرنے کے لیے امریکہ کو ایک طویل خانہ جنگی سے گزرنا پڑا ہے۔ امریکہ میں سیاہ فام انسانوں کی ایک بڑی تعداد ہر علاقہ میں موجود ہے جن کے باپ دادا

غلام تھے، انہیں افریقہ سے پکڑ کر غلام بنایا گیا تھا، انہیں جانوروں سے زیادہ بدتر ماحول میں زندگی گزرنے پر مجبور کیا جاتا تھا، جانوروں کی طرح ان کی باقاعدہ منڈیاں لگتی تھیں، اور اب سے پون صدی قبل تک انہیں رائے اور ووٹ تک کا حق حاصل نہیں تھا۔ امریکہ اور دیگر مغربی ممالک کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے دنیا کو غلامی سے نجات دلائی اور آزاد انسانوں کی تجارت کا خاتمہ کیا۔ حالانکہ آزاد انسانوں کی تجارت کا خاتمہ چودہ سو سال قبل جناب نبی اکرمؐ نے فرمایا تھا اور اسلامی معاشرے میں اس کے بعد غلامی کی یہ شکل معدوم ہو گئی تھی۔

اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے چارٹر میں غلامی کی ہر شکل کو ممنوع قرار دیا گیا ہے مگر اس کے باوجود انسانوں کی تجارت کا یہ مکروہ دھندہ جاری ہے اور اقوام متحدہ کے اداروں کو اس کے سدِباب بلکہ اس کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرنے میں بھی دشواری پیش آرہی ہے۔ اقوام متحدہ کے مختلف اداروں کی رپورٹوں کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ انسانی حقوق کے چارٹر میں جن حقوق کا اعلان کیا گیا ہے ان میں سے ہر ایک کے بارے میں صورتحال اسی طرح کی ہے اور اس چارٹر کے داعی مغرب ممالک اور معاشروں میں بھی ان حقوق کی خلاف ورزی اور پامالی کی شکایات کثرت سے پائی جاتی ہیں۔

انسانی حقوق کے معاملہ میں عقیدہ و اخلاقیات کی ضرورت

ہمارے نزدیک اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ آج کے عالمی قوانین، مغربی ممالک کے نظاموں اور انسانی حقوق کے بین الاقوامی چارٹر کی بنیاد مادہ پرستانہ فلسفہ حیات پر ہے جسے عقیدہ و ایمان، اخلاقیات اور روحانیات کی پشت پناہی حاصل نہیں ہے۔ جبکہ مغرب نظام و قانون کو عقیدہ، اخلاقیات اور روحانیت کی اساس فراہم کرنے سے نہ صرف خود انکاری ہے بلکہ مسلم ممالک اور اسلامی معاشروں میں بھی قانون و نظام کو اس فطری اساس سے محروم کر دینے پر تلا ہوا ہے، اور بنیاد پرستی اور دہشت گردی کے خلاف جنگ کے نام پر اپنی تمام تر توانائیاں اور وسائل اس کے خلاف صَرف کر رہا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ماحولیات کے حوالہ سے قرآن کریم کے قوانین سے استفادہ کے بارے میں برطانوی ولی عہد شہزادہ چارلس کی سوچ کو انسانی سوسائٹی کے دیگر شعبوں کے قوانین و نظام میں بھی راہنما بنایا جا سکتا ہے اور یہی اس مسئلہ کا واحد حل ہے۔ اقوام متحدہ کے ارباب حل و عقد سے ہم یہ گزارش کرنا چاہیں گے کہ وہ سالانہ رپورٹوں کے ذریعے اپنے قوانین کی ناکامی کا رونا روتے چلے جانے کی بجائے اس ناکامی کے حقیقی اسباب کا جائزہ لیں اور نسلِ انسانی کو وجدانیات و اخلاقیات کی بنیادوں پر فطری نظام کی فراہمی میں رکاوٹ بننے کی بجائے اس کی حمایت کا راستہ اختیار کریں کہ انسانی سوسائٹی کا بھلا بہر حال اسی میں ہے۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔ جولائی ۲۰۱۰ء)

عالمی قرضے: ایک کے بدلے گیارہ ڈالر کی ادائیگی

روزنامہ جنگ کراچی ۲۰ نومبر ۲۰۰۰ء کی رپورٹ کے مطابق آسٹریلیا کی ڈیموکریٹک سوشلسٹ پارٹی کی راہنما مس سوبل اور مزدور راہنما ٹم گڈن نے لاہور پریس کلب کے پروگرام "میٹ دی پریس" میں صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے کہ

"پاکستان کو آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک سے جو قرضے ملتے ہیں ان کے ایک ڈالر کے گیارہ ڈالر واپس کرنا پڑے ہیں۔ تمام غریب ممالک میں آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کو قرضے واپس نہ کرنے کے بارے میں بحث زور و شور سے جاری ہے اور عنقریب یہ تحریک کی شکل اختیار کر لے گی۔ انہوں نے کہا کہ قرضوں سے فرسٹ ورلڈ کے ممالک میں امیری اور تھرڈ ورلڈ کے ممالک میں غربت روز بروز بڑھ رہی ہے۔ انہوں نے کہا کہ دنیا سے غربت کے خاتمے کا حل کیپٹل ازم کا خاتمہ ہے۔ آسٹریلوی راہنماؤں نے کہا کہ ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن اور آئی ایم ایف امیر ممالک کو مزید امیر بنانے کے ادارے ہیں۔ غریب ممالک کے عوام میں ان اداروں کی بالادستی کے بارے میں شعور بڑھ رہا ہے، امیر ممالک اس نئی تحریک سے لرزاں ہیں، یہی وجہ ہے کہ ڈبلیو ٹی او کو اپنے اجلاس کے لیے جگہ نہیں مل رہی۔ مس سوبل اور ٹم گڈن نے کہا کہ پاکستان کے ذمے ۳۳ ارب ڈالر کا قرضہ ہے اور اسے ایک ڈالر کے بدلے میں گیارہ ڈالر ادا کرنا پڑتے ہیں، اس کے باوجود آئی ایم ایف دباؤ ڈال رہا ہے کہ منافع بخش سرکاری ادارے تیل، گیس، ایئرپورٹس، ٹیلی کمیونی کیشن وغیرہ فروخت کیے جائیں، جس سے بے روزگاری پھیلے گی۔"

آسٹریلیا کی سوشلسٹ پارٹی کے راہنماؤں نے لاہور پریس کلب میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ نئے نہیں ہیں، اور نہ ہی ان میں کوئی چونکا دینے والی بات ہے، کیونکہ یہ حقائق دنیا پر بہت پہلے آشکارا ہو چکے ہیں کہ انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ (آئی ایم ایف)، ورلڈ بینک، ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن (ڈبلیو ٹی او) اور دیگر عالمی مالیاتی اداروں کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ غریب اور ترقی پذیر ممالک کی دولت اور وسائل کا استحصال کر کے پوری دنیا کی دولت اور وسائل و ذرائع پر چند امیر ممالک کی اجارہ داری قائم کر دی جائے۔ تاکہ دنیا بھر کے ممالک کو معاشی مجبوریوں اور بے بسی کی زنجیروں میں جکڑ کر اس "عالمی حکومت" کے

خواب کو تعبیر کا جامہ پہنایا جا سکے جو یہودی ذہن صدیوں سے دیکھ رہا ہے۔ اور جس کی تکمیل کے پہلے مرحلہ میں مغربی ممالک کی معیشت، سیاست اور ذرائع ابلاغ پر مکمل کنٹرول حاصل کرنے کے بعد اب دوسرے مرحلہ میں اسی کے ذریعے دنیا بھر کے ممالک و اقوام کو عالمی اجارہ داری کے شکنجے میں جکڑنے کی مہم جاری ہے۔

البتہ پاکستان اس وقت جس بری طرح سے ان عالمی مالیاتی اداروں کے دباؤ کا شکار ہے اس کے پس منظر میں آسٹریلوی راہنماؤں کی یہ باتیں ہمارے لیے یاددہانی کا درجہ ضرور رکھتی ہیں، اور ہمیں امید ہے کہ متعلقہ ادارے، مراکز اور افراد اس کا سنجیدگی کے ساتھ جائزہ لیتے ہوئے وطنِ عزیز کو عالمی مالیاتی اداروں اور ان کے ذریعے عالمی یہودی اجارہ داری کے چنگل سے نجات دلانے کے لیے ٹھوس حکمتِ عملی اور طریق کار اختیار کرنے کی کوشش کریں گے۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ - دسمبر ۲۰۰۰ء)

غریب ممالک کیلئے عالمی قرضوں سے نکلنے کا راستہ

روزنامہ اوصاف اسلام آباد ۱۳ اپریل ۲۰۰۰ء کے مطابق امریکہ کے دارالحکومت واشنگٹن ڈی سی میں ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کے خلاف گزشتہ روز ہزاروں افراد نے مظاہرہ کیا ہے۔ مظاہرین نے زنجیریں پکڑ رکھی تھیں جو اس بات کو ظاہر کر رہے تھے کہ چھوٹے ممالک آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے قرضوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ان مظاہرین کا مطالبہ تھا کہ ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف غریب ملکوں کے قرضے معاف کرنے کا اعلان کریں۔

جبکہ روزنامہ نوائے وقت لاہور ۱۵ اپریل ۲۰۰۰ء کے مطابق ورلڈ بینک کے صدر جیمز ڈولفنس نے ترقی پذیر اور غریب ملکوں کے قرضے معاف کرنے سے انکار کرتے ہوئے کہا ہے کہ اگر چالیس ملکوں کے قرضے معاف کر دیے جائیں تو اکتالیسواں ملک بھی قرض معافی کی درخواست کرے گا اور اس طرح قرضوں کی مکمل معافی کا دروازہ کھل جائے گا۔

ورلڈ بینک کے صدر کی طرف سے غریب اور ترقی پذیر ملکوں کے قرضے معاف کرنے سے یہ انکار خلافِ توقع نہیں ہے، اس لیے کہ قرضوں کا یہ جال خود ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف نے بڑی محنت کے ساتھ دنیا بھر میں پھیلایا ہے جس کے ذریعے ترقی پذیر اور غریب ممالک کو قرضوں کی زنجیروں میں جکڑ کر انہیں مغرب کی پالیسیوں کے مطابق چلنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اور ان قرضوں کے دام ہمرنگ زمین کا

شکار ہونے والے ممالک اور اقوام بے بس اور لاچار قیدیوں کی طرح مغربی طاقتوں کی دھن پر ناچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس لیے ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کے یہ قرضے ''کاروبار'' نہیں بلکہ ''جال'' ہیں اور کوئی شکاری اپنے جال سے آسانی کے ساتھ دستبردار نہیں ہوا کرتا۔

ترقی پذیر اور غریب ممالک اگر فی الواقع اس جال سے نکلنا چاہتے ہیں تو انہیں روایتی کہانی کی ان چڑیوں کی طرح جال سمیت اڑنا ہوگا جو یکبارگی اجتماعی قوت کے ساتھ پورے جال کو لے اڑی تھیں اور شکاری کی دسترس سے دور نکل گئی تھیں۔ اور اس کا طریقہ صرف یہ ہے کہ غریب اور ترقی پذیر ممالک متحد ہو کر ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کے قرضے واپس کرنے سے یکبارگی انکار کر کے ان اداروں کے کارندوں کو اپنے ملکوں سے باہر نکال دیں۔ اور یہ کوئی ناانصافی کی بات نہیں ہوگی اس لیے کہ غریب اور ترقی پذیر ممالک نے ان اداروں سے جو قرضے لیے تھے ان میں سے اکثر کی اصل رقم واپس ہو چکی ہے، اور اب وہ سود در سود ہے جس نے ان غریبوں کی گردنوں کو دبوچ رکھا ہے۔ اور سود کی واپسی سے انکار کوئی ناانصافی نہیں ہے کیونکہ استحصال اور لوٹ مار کی سب سے بری علامت سود دنیا سے جب بھی ختم ہوگا اسی طرح کی جرأتِ رندانہ سے ختم ہوگا۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔ مئی ۲۰۰۰ء)

سعودی عرب کا خسارے کا بجٹ اور مسلم ممالک

روزنامہ پاکستان لاہور ۱۰ دسمبر ۲۰۰۱ء کی خبر کے مطابق سعودی عرب کی حکومت نے آئندہ مالی سال کے لیے ۴۵ ارب ریال کے خسارے کے بجٹ کا اعلان کیا ہے۔ اور خسارے کی وجہ یہ بتائی ہے کہ ۱۱ ستمبر کے واقعات کے بعد عالمی سطح پر تیل کی قیمتوں میں کمی آئی ہے، جس کی وجہ سے ''اریبک'' نے تیل کی پیداوار کم کر دی ہے اور اس مد میں سعودی عرب کو جس آمدنی کی توقع تھی وہ پوری نہیں ہوئی۔ خبر میں بتایا گیا ہے کہ آئندہ سال سعودی عرب کی معیشت انتہائی مشکلات کا شکار ہوتی نظر آتی ہے کیونکہ ایک طرف سرکاری محاصل میں کمی ہو رہی ہے اور دوسری طرف اخراجات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ جبکہ بجٹ کا ۷۵ فیصد حصہ تنخواہوں میں چلا جائے گا۔

سعودی عرب دنیائے اسلام کا وہ ملک ہے جو تیل اور سونے کے ذخائر سے مالا مال ہے اور امیر ترین ملکوں میں شمار ہوتا ہے۔ لیکن امریکہ کے ساتھ وابستگی اور عالمی مالیاتی نظام کی غیر مشروط تابعداری نے اسے اس مقام پر پہنچایا ہے کہ اس کے بجٹ کے خسارے اور معاشی مشکلات میں دن بدن اضافہ ہوتا جا

رہا ہے۔ اس سے ہمارے پاکستانی حکمرانوں کی ان توقعات اور امیدوں کے انجام کا بھی بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے جو اس امید پر امریکہ کی خوشنودی کے لیے ہر قربانی دیتے چلے جا رہے ہیں کہ اس سے پاکستان کی معاشی حالت سدھر جائے گی۔

اللہ تعالیٰ نے عالمِ اسلام کو تیل، گیس، معدنیات اور دیگر قیمتی ذخائر کی جس عظیم دولت سے نوازا ہے اگر مسلم حکمران اس کی قدر کرتے اور مغربی تہذیب کے سراب کے پیچھے بھاگتے چلے جانے کی بجائے اپنے ملی تشخص کو باقی رکھتے ہوئے اپنے وسائل سے خود استفادہ کرنے کی صلاحیت اور استعداد پیدا کر کے اسے استعمال میں لاتے تو آج عالمِ اسلام کو یہ روزِ بد نہ دیکھنا پڑتا۔ آج بھی وقت ہے کہ عالمِ اسلام کے حکمران عبرت حاصل کریں، مغرب کی نقالی اور دریوزہ گری کرنے کی بجائے اپنی اجتماعی قوت کو اجاگر کریں، اور دینی و نظریاتی اساس پر ملی مرکزیت کا آحیا کریں۔ ورنہ وہ استحصالی قوتوں کی لوٹ مار کا اس طرح شکار ہوتے رہیں گے، اور عالمِ اسلام کے وسائل یونہی عالمی لٹیروں کی قہر سامانیوں کا ذریعہ بنے رہیں گے۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔ جنوری ۲۰۰۲ء)

مسلم ممالک کی باہمی تجارت کیلئے الگ کرنسی کا منصوبہ

روزنامہ جنگ لاہور ۲۲ اگست ۲۰۰۲ء کی ایک خبر کے مطابق ”اسلامی ممالک نے باہمی تجارت ڈالر یا دیگر عالمی کرنسیوں میں کرنے کی بجائے گولڈ میں کرنے کے پلان پر کام شروع کر دیا ہے۔ یہ پلان ملائیشیا کی تجویز پر پیش کیا گیا ہے اور اس پر عملدرآمد سال ۲۰۰۳ء میں ہوگا۔ یہ تجارت ایک نئے سسٹم پر ہوگی جو کہ الیکٹرک یونٹ آف ویلیو پر ہوگا، اسے گولڈ دینار کہا جائے گا، اور یہ دنیا کے ایک ارب تیس کروڑ مسلمان باہمی تجارت کے لیے استعمال کریں گے۔ جس سے دیگر غیر مستحکم کرنسیوں میں کاروبار کرنے سے نجات مل جائے گی اور ان کرنسیوں کی قیمتوں میں آنے والے اتار چڑھاؤ کا بھی کوئی اثر اس تجارت پر نہیں پڑے گا۔ اس سے قبل دنیا بھر کے مسلمان آپس میں زیادہ تر تجارت یورو اور ڈالر میں کر رہے ہیں جس پر مختلف اطراف سے تنقید ہو رہی ہے، جس کی وجہ عالمی سطح پر ان کرنسیوں کی سٹہ بازی تھی۔ جبکہ نئے سسٹم سے تمام سودے گولڈ دینار ہی میں ہوں گے۔۔۔ خبر کے مطابق اسلامی ممالک کے درمیان باہمی تجارت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے اور گزشتہ پانچ سالوں کے دوران یہ تین گنا بڑھی ہے۔“

یہ خبر اگر درست ہے اور مسلم ممالک اس پلان پر عملدرآمد میں سنجیدہ ہیں تو ہمارے نزدیک یہ انتہائی خوش کن خبر ہے، جسے موجودہ عالمی اقتصادی جبر اور بین الاقوامی ساہوکاروں کے وحشیانہ معاشی استحصال

سے پیدا ہونے والے شدید گھٹن اور حبس کے ماحول میں ٹھنڈی ہوا کا ایک خوشگوار جھونکا قرار دیا جاسکتا ہے۔

سونا و چاندی بطور زرِ حقیقی اور کاغذی نوٹوں کی حیثیت

دنیا بھر میں کچھ عرصہ پہلے تک تجارت اور لین دین سونے اور چاندی کے حوالے سے ہوتا رہا ہے، اور اسلام میں بھی شرعی احکام کے حوالے سے سونا اور چاندی کو ''نقدین'' قرار دیا گیا ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ اس ''زرِ حقیقی'' کی جگہ کاغذ کے کرنسی نوٹ آگئے جو اپنی تکنیکی نوعیت کے لحاظ سے آج بھی زرِ حقیقی کی رسید کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن بتدریج انہیں ''زرِ حکمی'' کا درجہ حاصل ہو گیا اور سونے اور چاندی کی نقدین اور زرِ حقیقی کی حیثیت پس منظر میں چلی گئی۔

ابتدا میں ان کرنسی نوٹوں کا اجرا سونے اور چاندی کے ذخائر کی بنیاد پر ہوتا تھا، اور متعلقہ بینک کو کرنسی نوٹ کے عوض اتنی مقدار کا زرِ حقیقی دینے کا پابند تصور کیا جاتا تھا۔ بعد میں چاندی کو اس کے دائرہ سے نکال دیا گیا اور صرف سونا زرِ حقیقی قرار پاکر کچھ عرصہ تک کرنسی نوٹوں کی بنیاد بنا رہا۔

مگر اس سے اگلے مرحلہ میں سونے کی یہ حیثیت کمزور ہوگئی اور کسی کرنسی کی ساکھ کے تعین میں متعلقہ ملک کی بین الاقوامی تجارت کا سائز، لین دین اور ساکھ جیسے عوامل بھی شامل ہوگئے۔ جس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ کاغذ کا نوٹ کسی بھی ملک کی کرنسی کی صورت میں دنیا کے کسی بھی شخص کی جیب میں ہو مگر اس کی قدر اور قیمت کا تعین بین الاقوامی مالیاتی اداروں اور عالمی بینکوں کے کنٹرول میں رہتا ہے کہ وہ جب چاہیں اور جیسے چاہیں اس کی قیمت میں کمی بیشی کرتے رہیں۔

اس طرح پوری دنیا کے مالی معاملات ان بین الاقوامی مالیاتی اداروں کی گرفت میں آگئے جن کا اصل کنٹرول یہودیوں کے ہاتھ میں ہے اور وہ اس کے ذریعے پوری دنیا کے معاشی وسائل پر قبضہ کرنے اور اپنے مخالفین بالخصوص مسلمانوں کو معاشی طور پر مفلوج کر دینے کے لیے مکمل منصوبہ بندی کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔ ہمارے نزدیک سونے اور چاندی کی صورت میں حقیقی، ٹھوس اور موجود زرِ نقد کی بجائے کاغذی نوٹ اور کرنسی کی صورت میں زرِ حکمی کو رواج دینے اور پھر اس کی مالیت اور قدر و قیمت کے تعین کو اعداد و شمار کے چکر میں ڈالنے کا اصل مقصد ہی یہ تھا کہ اعداد و شمار کے ہیر پھیر میں عالم اسلام کے وسائل اور دولت کو ہڑپ کیا جائے اور پوری دنیا کے معاشی وسائل پر یہودی مالیاتی اداروں کا کنٹرول قائم ہو جائے، جو اس وقت عملاً قائم ہو چکا ہے، اور دنیا کا کوئی ملک ورلڈ بینک، آئی ایم ایف اور ورلڈ ٹریڈ آرگنائزیشن کے چکروں اور ہیر پھیر سے آزاد نہیں ہے۔

اعداد و شمار کے ہیر پھیر کا عالمی نظام

اس پس منظر میں اگر مسلم ممالک نے اس دھوکہ اور فراڈ کو سمجھ لیا ہے اور اس سے کم از کم اپنے باہمی لین دین کے دائرہ میں بچنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو یہ فی الواقع بڑی خوشی کی خبر ہے جس سے ان لوگوں کو حوصلہ ملا ہے جو عالمِ اسلام کو اقتصادی اور معاشی طور پر ورلڈ بینک، آئی ایم ایف اور ڈبلیو ٹی او کے چنگل سے آزاد دیکھنا چاہتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر مسلم ممالک سنجیدگی کے ساتھ زرِ حکمی کے چکر سے نکل کر سونے کی صورت میں زرِ حقیقی کی طرف واپس آجائیں تو وہ نہ صرف باہمی تجارت کو بین الاقوامی اداروں کی سٹہ بازی سے محفوظ رکھ سکیں گے بلکہ مسلم ممالک کے معاشی استحکام اور عالمِ اسلام کے معاشی وسائل کے بچاؤ کی بھی کوئی صورت نکل آئے گی۔

اس مسئلہ کو پاکستان کی داخلی صورتحال کے حوالے سے بھی اس طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ اب سے تیس پینتیس برس قبل سونے کی قیمت ڈیڑھ سو روپیہ فی تولہ تھی اور جو ملازم اس وقت ڈیڑھ سو روپے ماہانہ تنخواہ پاتا تھا اس کی قوتِ خرید ایک تولہ سونے کے برابر تھی۔ جبکہ آج سونے کی قیمت فی تولہ پانچ اور چھ ہزار روپے کے درمیان ہے۔ اور اگر اس ملازم کی تنخواہ اس دوران ڈیڑھ سو روپے سے بڑھ کر چار ہزار روپے بھی ہو گئی ہے تو اعداد و شمار کے لحاظ سے اس کی تنخواہ میں چھبیس گنا اضافہ ہو جانے کے باوجود اس کی قوت خرید کم از کم بیس فیصد کم ہو گئی ہے۔ اور اس عمل نے غربت اور ناداری کے اضافہ میں بہت بڑا کردار ادا کیا ہے۔ اس کی بجائے اگر کرنسی کا تعلق حقیقی زر سے ہو اور اعداد و شمار کے ہیر پھیر کی بجائے کاغذ کے نوٹوں کو سونے کے ساتھ منسلک رکھا جائے، یا سونے کے سکے ہی کو زرِ نقد کی صورت میں دوبارہ بحال کر دیا جائے تو باہمی لین دین کے ساتھ عام آدمی کی قوتِ خرید میں بھی توازن قائم رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ محنت کشوں اور مزدوروں کی بعض تنظیمیں ایک عرصہ سے مطالبہ کرتی آرہی ہیں کہ انہیں ان کی محنت کا معاوضہ کاغذ کے نوٹوں کی بجائے سونے اور متعیّنہ مقدار کی صورت میں دیا جائے تاکہ کرنسی کی قیمت اور قدر میں اتار چڑھاؤ سے ان کی قوتِ خرید متاثر نہ ہو۔

بہر حال مسلم ممالک کے اس فیصلہ سے ہمیں خوشی ہوئی ہے اور ہم انہیں اس پر مبارکباد پیش کرتے ہوئے دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ مسلم حکومتوں کو سنجیدگی کے ساتھ اس فیصلہ پر عمل کی توفیق دیں اور عالمِ اسلام کو بین الاقوامی صہیونی مالیاتی اداروں کے استحصالی چنگل سے نجات دلائیں، آمین یارب العالمین۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔ ستمبر ۲۰۰۲ء)

مغرب کو تیسرے نظام کی تلاش

روزنامہ جنگ لندن ۲۲ اگست ۱۹۹۸ء کی اشاعت میں جناب آصف جیلانی نے ''مغرب تیسری راہ کی کھوج میں'' کے عنوان سے اپنے مضمون میں بتایا ہے کہ

''مغرب طویل سرد جنگ کے ذریعے مارکسی سوشلزم کا نظام ناکام ثابت کرنے، اور پھر مارگریٹ تھیچر کی آزاد معیشت کے نتائج میں سخت مایوسی کے سامنے کے بعد اب ایک تیسری راہ کا متلاشی ہے۔ یہ خبریں ہیں کہ برطانیہ کے وزیراعظم ٹونی بلیئر اور امریکی صدر بل کلنٹن ۲۱ ستمبر کو نیویارک میں ایک بین الاقوامی کانفرنس میں تیسری راہ کا نظریہ پیش کریں گے۔ اس کانفرنس میں اٹلی کے وزیراعظم رومانو پروڈی اور سویڈن کے وزیراعظم گوران پرسن بھی شرکت کریں گے۔ البتہ جرمن کے سوشل ڈیموکریٹک راہنما گیرہارڈ سروڈر اپنے ملک میں عام انتخابات کے پیش نظر اس کانفرنس میں شرکت نہ کرسکیں گے۔ یہ معنی خیز بات ہے کہ فرانس کے سوشلسٹ وزیراعظم لانیل جوسپان کو اس کانفرنس میں شرکت کی دعوت نہیں دی گئی۔''

امریکہ کے صدر بل کلنٹن ان دنوں جس بحران کا شکار ہیں، اس کے پیش نظر ۲۱ ستمبر کی مذکورہ کانفرنس کے بارے میں قبل از وقت کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس کا انعقاد بھی عمل میں آتا ہے یا نہیں۔ البتہ اس خبر سے اتنی بات واضح ہوگئی ہے کہ مغرب نے صنعتی انقلاب کے نتیجے میں قائم ہونے والے سرمایہ دارانہ نظام اور اس کے ردعمل میں ابھرنے والے سوشلسٹ نظام کی ناکامی کو واضح طور پر محسوس کرلیا ہے، اور اب کسی ایسے متبادل نظام کی تلاش میں ہے جو اسے ان دونوں نظاموں کی تباہ کاریوں سے نجات دلاسکے۔

سرمایہ دارانہ و جاگیردارانہ نظام اور سوشلسٹ معیشت دونوں کی بنیاد مادی اخلاقیات پر ہے، جو آسمانی تعلیمات کی نفی کر کے سوسائٹی کے داخلی رجحانات کے حوالے سے ترتیب پاتی ہیں۔ اس لیے اپنے سرچشمہ اور بنیاد کے لحاظ سے ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ البتہ ایک نے آزادی اور انسانی حقوق کا لیبل لگا کر اپنا تعارف کرایا، اور دوسرے نے ریاستی جبر کے سہارے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ لیکن چونکہ دونوں نظام غیر فطری تھے اس لیے بالآخر ناکامی ہی ان کا مقدر تھی جو روشن صبح کی طرح پوری دنیا پر آشکارا ہو چکی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ آزادی اور جبر دونوں انسانی معاشرہ کو صحیح رخ پر چلانے کے لیے ضروری ہیں، لیکن

سوال ہے کہ ان کی حدود کا تعین کون کرے گا؟ ایک گروہ نے آزادی کو اصل قرار دیا اور اس کی حدود کے تعین کا اختیار سوسائٹی کو دے دیا کہ انسانی معاشرہ کا مجموعی رجحان جس امر کو چاہے آزادی کے نام سے اپنا حق قرار دے لے، اس کا نتیجہ انارکی کی صورت میں نکلا جو سب کے سامنے ہے۔ جبکہ دوسرے گروہ نے اپنے نظام کی بنیاد جبر پر رکھی اور اس جبر کی حدود کا تعین سوسائٹی کے غالب طبقے کے ہاتھ میں دے دیا، لیکن یہ فلسفہ بھی زیادہ دیر نہ چل سکا۔

اب مغرب "تیسری راہ" کی تلاش میں ہے، لیکن اس حقیقت کا ادراک کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ آزادی اور جبر میں توازن اور تناسب کے تعین کا اختیار بھی اگر انسانی سوسائٹی کے اپنے اختیار میں ہی رہا تو اس کا نتیجہ بھی سابقہ نظاموں سے مختلف نہیں ہوگا۔ اس لیے مغرب کو یہ بات سمجھانے کی ضرورت ہے کہ اس نے آسمانی تعلیمات سے انحراف کر کے جو "جھک ماری" تھی اس پر نظر ثانی ضروری ہوگئی ہے۔ کیونکہ آسمانی تعلیمات ہی انسانی سوسائٹی کو باہمی حقوق کے منصفانہ توازن، اور آزادی اور جبر میں عادلانہ تناسب سے بہرہ ور کر سکتی ہے۔ اس کے سوا انسانی سوسائٹی کو سرمایہ داری اور سوشلزم کی تباہ کاریوں سے نجات دلانے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔ اکتوبر ۱۹۹۸ء)

"عالمی یومِ خوراک" کے حوالے سے چند گزارشات

۱۶/اکتوبر کو دنیا بھر میں "عالمی یومِ خوراک" منایا گیا اور اس سال اقوام متحدہ کے زیر اہتمام "غربت کی کمی کے لیے بھوک سے لڑیں" کے عنوان سے اس موضوع پر مختلف تقریبات، مقالات، رپورٹوں اور خبروں کا اہتمام کیا گیا۔

خوراک اور غربت کے حوالے سے ایک رپورٹ

عالمی سطح پر خوراک اور غربت کی صورتحال کے بارے میں ایک رپورٹ بھی سامنے آئی ہے جس میں دنیا کی غریب اقوام اور غربت و ناداری کی زندگی گزارنے والے کروڑوں انسانوں کی حالتِ زار کے بارے میں اعداد و شمار پیش کیے گئے ہیں۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ صومالیہ، افغانستان اور برونڈی اس وقت دنیا کے سب سے زیادہ نیم فاقہ کش ملک شمار ہوتے ہیں اور دنیا میں کم و بیش نوے کروڑ انسان ایسے ہیں جنہیں صرف اس قدر خوراک میسر آتی ہے کہ وہ جسم اور روح کا رشتہ برقرار رکھ سکیں۔ ان میں سے ۸۰ کروڑ کے لگ بھگ لوگوں کا تعلق ترقی پذیر ممالک سے ہے۔ عالمی ادارہ خوراک و زراعت کی اس رپورٹ میں جسے

"سٹیٹ آف فوڈ اَن سکیورٹی اِن دی ورلڈ ۲۰۰۰ء" کا عنوان دیا گیا ہے، بتایا گیا ہے کہ سخت قسم کی غذائی مشکلات کے حامل ممالک میں افغانستان، بنگلہ دیش، ہیٹی، عوامی جمہوریہ کوریا، صومالیہ اور برونڈی سمیت صحارا اور افریقہ کے ۱۶ دوسرے ممالک شامل ہیں جبکہ کم نوعیت کی غذائی محرومی کے شکار ممالک میں پاکستان اور بھارت بھی شمار ہوتے ہیں۔ رپورٹ میں خشک سالی اور جنگوں سے پیدا شدہ صورتِ حال کا بھی جائزہ لیا گیا ہے اور غربت، خوراک کی کمی اور ناداری کو دور کرنے کے لیے عالمی سطح کی کوششوں پر زور دیا گیا ہے۔

کیا غربت اور بھوک کا سبب بڑھتی ہوئی آبادی ہے؟

رپورٹ کی تفصیلات و جزئیات کا احاطہ اس موقع پر ضروری نہیں ہے، البتہ اس حوالے سے غربت، ناداری اور بھوک کے عالمی تناظر میں اصولی طور پر اس بات کا جائزہ لینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس غربت و ناداری اور بھوک و افلاس کے اسباب کیا ہیں اور ان اسباب کو دور کرنے کے لیے عالمی سطح پر آج کے دور میں کیا کیا جا سکتا ہے؟

اس کے بارے میں ایک نقطۂ نظر یہ ہے اور آج کی بین الاقوامی قوتوں اور اداروں کی پالیسیوں کی بنیاد اسی نقطۂ نظر پر ہے کہ آبادی بے تحاشا بڑھ رہی ہے اور دنیا کے موجود اور میسر وسائل آبادی میں اس تیز رفتار اضافے کا ساتھ نہیں دے رہے، جس سے عدمِ توازن پیدا ہو گیا ہے اور بھوک اور غربت بڑھتی جا رہی ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ آبادی میں اضافے کو روکا جائے اور انسانی آبادی میں شرحِ پیدائش کو خوراک اور دیگر وسائل میں اضافہ کی رفتار کے ساتھ منسلک کر کے کنٹرول میں لایا جائے۔

آبادی میں اضافے پر کنٹرول کی اس عالمی پالیسی سے جو معاشرتی خرابیاں جنم لے رہی ہیں اور پریشان کن مسائل پیدا ہو رہے ہیں، وہ اپنی جگہ پر مگر ان سے قطع نظر اسلامی نقطۂ نظر سے اور معروضی حقائق کے حوالے سے سرے سے یہ بنیاد ہی غلط ہے اور محض ایک مفروضہ ہے جسے بہت سے جائز اور ناجائز مقاصد حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا جا رہا ہے۔ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ پوری کائنات کا خالق و مالک اور اسے چلانے والا اللہ تعالیٰ ہے جو اپنی حکمت اور مصلحت کے ساتھ اس پورے نظام کو کنٹرول کر رہا ہے۔ سب انسان اسی نے پیدا کیے ہیں اور زمین میں ان کے لیے خوراک بھی اسی نے مہیا کی ہے۔ اسے انسانوں کی ضروریات اور زمین میں خوراک کے خزانوں کی مقدار کا علم ہے۔ وہ انسانوں کی ضروریات سے غافل نہیں ہے اور نہ آبادی اور خوراک کے ذخائر میں توازن قائم رکھنا اس کے بس سے باہر ہے۔ اس نے ہر جاندار کی خوراک کا وعدہ کر رکھا ہے اور اس وعدہ کے مطابق وہ صرف انسانی آبادی نہیں بلکہ ہر جاندار مخلوق کو اس کی

ضرورت کے مطابق خوراک اور دیگر ضروریات مہیا کر رہا ہے۔ اور ایسا ہرگز نہیں ہے کہ اس نے کسی کو پیدا کیا اس میں روح ڈالی اور دنیا میں اس کے لیے اس کی ضرورت کے مطابق خوراک مہیا نہیں کی، کیونکہ یہ ظلم ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذاتِ گرامی سے ظلم کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن کریم میں متعدّد مقامات پر اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے۔ ان میں سے دو تین کا تذکرہ مناسب خیال کرتا ہوں:

سورہ ہود کی آیت ۶ میں اللہ رب العزت کا ارشاد گرامی ہے:

"زمین میں رینگنے والا کوئی جانور ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمے نہ لے رکھا ہو۔ وہ ہر جاندار کے عارضی اور مستقل ٹھکانے کو جانتا ہے اور یہ سب کچھ ریکارڈ میں موجود ہے۔"

سورہ ابراہیم کی آیت ۳۴ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"اللہ تعالیٰ نے تمہیں ہر وہ چیز دی جس کا تم نے اس سے سوال کیا"

یہاں یہ اشکال سامنے آیا کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں انسانوں نے ان نعمتوں کا کوئی سوال تو نہیں کیا اور نہ اپنی ضروریات کی کوئی فہرست پیش کی تو مفسرینِ کرام نے کہا کہ یہاں سوال سے مراد زبانِ حال کا سوال ہے۔ اور مشہور مفسر قاضی بیضاویؒ نے اس کا ترجمہ یوں کیا کہ "اللہ تعالیٰ نے تمہیں ہر وہ چیز دی جو سوال کے قابل تھی"، یعنی ہر وہ چیز جس کے سوال کی ضرورت پیش آسکتی تھی، وہ بغیر سوال کے مہیا فرمادی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں انسانی ضروریات کی تمام چیزیں اللہ تعالیٰ نے مہیا کر دی ہیں اور کسی ضرورت کو ادھورا نہیں چھوڑا۔ البتہ ان تک رسائی اور ان کے حصول کے لیے اسباب کا واسطہ بنا دیا اور حکم دیا کہ اسباب کے درجے میں محنت کر کے اپنی ضروریات کی چیزیں حاصل کر لو۔

سورہ حٰم السجدہ آیت ۱۰ میں اللہ تعالیٰ نے زمین کی تخلیق کا ذکر کیا ہے اور فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو دو دن میں بنایا اور پھر دو دن میں اس میں خوراک کے ذخیرے ودیعت کیے۔ اس سے آگے ایک جملہ ہے " سواء للسائلین"۔ حضرت حسن بصریؒ، امام ابن جریر طبریؒ اور بعض دیگر مفسرینِ کرام اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ زمین میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رکھے گئے خوراک کے ذخیرے "ضرورتمندوں کی ضرورت کے مطابق ہیں"۔ یعنی زمین کی پشت پر جتنی آبادی ہوگی، زمین کے پیٹ میں اس کی ضرورت کے مطابق خوراک موجود رہے گی۔ اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے نہ صرف جانداروں کی خوراک کی ذمہ داری اٹھائی ہے بلکہ خوراک کے ضرورتمندوں کی تعداد اور خوراک کے ذخائر کی مقدار کے درمیان توازن قائم رکھنے کا وعدہ بھی فرمایا ہے۔ اور یہ بات ممکن نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک بات کا وعدہ کریں اور اسے اپنی ذمہ داری ٹھہرالیں اور پھر نعوذ باللہ اس سے غافل ہو جائیں۔

وسائل و اسباب کا حصول اور ان کی تقسیم کا مسئلہ

اس لیے مسئلہ انسانی آبادی میں اضافے کی رفتار اور زمین میں خوراک کے ذخائر کی مقدار میں توازن کا نہیں ہے کیونکہ اس توازن کو قائم رکھنے اور ہر ضرور تمند کی ضرورت کے مطابق خوراک اور دیگر ضروریات مہیا کرنے کا اس نے وعدہ کر رکھا ہے۔ مسئلہ اس سے آگے ہے جو اسباب سے تعلق رکھتا ہے اور اس میں دو پہلو قابلِ توجہ ہیں:

1. ایک یہ کہ زمین میں موجود خوراک کے ذخائر تک رسائی کس طرح ہو؟
2. اور دوسرا یہ کہ ان کی تقسیم کا کیا نظام ہو؟

کیونکہ یہ دو باتیں اللہ تعالیٰ نے انسان کے ذمے کی ہیں اور انہیں انسان کی عقل اور دیانت کی آزمائش ٹھہرایا ہے۔ گڑبڑ اسی مقام پر ہے اور ہمیں اس گڑبڑ کا ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ جائزہ لینا چاہیے تاکہ خرابی کے اصل مقام کا تعیّن ہو اور اسے دور کرنے کے لیے صحیح سمت میں کوشش کی جا سکے۔

اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کسی فلاحی مملکت میں ہر کنبے کو اس کی ضرورت کے مطابق وظیفہ دیا جاتا ہو، اور پندرہ بیس افراد کے ایک کنبے کے سربراہ کو اتھارٹی دی جائے کہ وہ اپنے کنبے کے افراد کی ضروریات کے لیے اتنی رقم سرکاری خزانے سے لے سکتا ہے۔ مگر وہ اپنے کنبے کی ضرورت کی رقم سرکاری خزانے سے وصول کرنے میں بے پروائی کرتا ہے، یا وہاں سے وصول کر لیتا ہے اور متعلقہ لوگوں پر خرچ کرنے کے بجائے ذاتی عیش و عشرت پر ضائع کر دیتا ہے، تو اس کنبے کے افراد کو خوراک و لباس اور دیگر ضروریات نہ ملنے کی ذمہ داری اس فلاحی ریاست پر نہیں ہوگی بلکہ کنبے کا سربراہ اس بات کا مجرم ہوگا کہ اس نے رقم وصول نہ کر کے یا وصولی کی صورت میں بے جا تعیش پر صرف کر کے اپنے کنبے کے افراد کو بھوک، ناداری اور غربت سے دوچار کر دیا ہے۔

اسی طرح آج اگر دنیا میں کروڑوں انسان بھوک اور فاقہ کا شکار ہیں اور بہت سے ممالک اپنے عوام کو بنیادی ضروریات مہیا کرنے سے قاصر ہیں تو اس کا قصوروار وہ نظام اور سسٹم ہے جس نے انسانی برادری کی عالمی سطح پر چودھراہٹ سنبھال رکھی ہے، اور جس نے خوراک کے ذخائر اور دنیا کے مالی وسائل پر اجارہ داری قائم کر کے ان کی تقسیم کے تمام اختیارات پر قبضہ کر رکھا ہے۔ یہ دنیا کے مالی وسائل اور خوراک کے ذخائر پر چند ممالک کی اجارہ داری اور ان کی تقسیم کے ترجیحی نظام کا کرشمہ ہے کہ ایک طرف امریکہ اپنی پیدا کردہ گندم کا ایک بہت بڑا حصہ زائد از ضرورت قرار دے کر سمندر میں پھینک دیتا ہے اور برطانیہ میں مارکیٹ کی قیمتوں میں توازن رکھنے کے لیے کچھ زمینداروں کو گندم کاشت کرنے سے سرکاری طور پر روکا

جاتا ہے، اور دوسری طرف غریب ممالک میں لاکھوں انسان بھوک سے مر جاتے ہیں۔ ایک طرف امیروں کی دولت میں بے تحاشا اضافہ ہو رہا ہے اور دوسری طرف غریبوں کی غربت اس سے دگنی رفتار سے بڑھ رہی ہے۔ خود ہمارے ملک میں ایک طرف چند افراد اور خاندان ہیں جن کے کتے مکھن اور پنیر کھاتے ہیں اور دوسری طرف کروڑوں غریب عوام ہیں جن کے بچوں کو دو وقت سادہ روٹی بھی میسر نہیں ہوتی۔

غربت کا مسئلہ قومی سطح پر ہو یا عالمی سطح پر، دونوں جگہ خرابی کا باعث تقسیم کا نظام ہے اور وہ خود غرض طبقات و اقوام اس کے ذمہ دار ہیں جو اپنی عیاشی اور لگژری کے لیے غریب عوام و طبقات کا استحصال کر رہی ہیں اور کروڑوں بھوکے اور فاقہ کش انسانوں کے منہ سے نوالے چھین کر اپنی تجوریاں بھر رہی ہیں۔ تقسیم کے اس نظام کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ زمین کے وسائل پر تمام انسانوں کا یکساں حق تسلیم کرنے کی ضرورت ہے۔ تعیش و لگژری اور غربت و فاقہ کی دونوں انتہاؤں کی نفی کرتے ہوئے ضروریات کی باوقار فراہمی کے معتدل اور متوازن اصول کو اپنانے کی ضرورت ہے۔ اور ایک عدد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ضرورت ہے جو خلیفہ کی حیثیت سے وظائف تقسیم کرتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے ازواجِ مطہرات اور اصحابِ بدر کو زیادہ وظیفہ دینے اور باقیوں کو کم دینے کی درخواست کو یہ کہہ کر مسترد کر دیں کہ ”یہ معیشت کا شعبہ ہے، اس میں برابری کا اصول ترجیح کے اصول سے بہتر ہے“۔

غربت و ناداری پر قابو پانے اور فاقہ و افلاس کو ختم کر کے تمام انسانوں کو ضروریاتِ زندگی سے بہرہ ور کرنے کے لیے دنیا کو اسی اصول پر واپس آنا ہوگا۔ اس کے بغیر دنیا میں معاشی توازن قائم کرنے کا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔

(ماہنامہ الشریعہ، گوجرانوالہ—نومبر ۲۰۰۱ء)

ملکی وسائل پر انحصار

بھارت میں چھ روزہ قیام کے دوران جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ بھارتی باشندوں کا ملکی وسائل پر انحصار کا اجتماعی رجحان ہے۔ وہاں میں نے سہل پسندی، نمائش اور بیرونی اشیاء کے فخر کے ساتھ استعمال کی وہ کیفیت نہیں دیکھی جو ہمارے ہاں پورے عروج پر ہے۔ چھ روز کے سفر میں دو غیر ملکی موٹریں نظر سے گزریں، ایک دیوبند میں جو لاہور کے ایک بزرگ لے کر گئے تھے، ایک لدھیانہ میں جس کے بارے میں تحقیق نہ کی جا سکی۔ وہاں خود انڈیا کی تیار کردہ گاڑیاں استعمال ہوتی ہیں اور وہ بھی بہت کم،

سڑکوں پر کاروں کا ہجوم نظر نہیں آتا، شہروں میں سائیکل رکشا زیادہ چلتا ہے۔ تھوڑا بہت آٹو رکشا بھی دکھائی دیتا ہے اور وہ بھی انڈیا کا بنا ہوا۔ جن بسوں پر سفر کیا وہ انجن اور باڈی کے لحاظ سے مضبوط تھیں، ہماری طرح کے سجے سجائے کاغذی بادام سڑکوں پر دوڑتے نہیں دیکھے۔ لباس اور وضع قطع میں بھی یورپ کی نقالی کا رجحان ہماری بہ نسبت کم ہے بالخصوص سکھوں میں اپنی مذہبی وضع قطع پر سختی کے ساتھ کاربند رہنے کا رجحان نمایاں ہے۔ ہماری بھارت میں موجودگی کے دوران ایک سکھ لیڈر کا اکالی دل سے یہ مطالبہ اخبارات میں شائع ہوا کہ آئندہ انتخابات میں کسی ایسے سکھ کو اکالی دل کا ٹکٹ نہ دیا جائے جو داڑھی کتروا تا ہو یا رنگتا ہو۔

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور – ۱۸ مارچ ۱۹۸۰ء)

پاکستان کے حالات و مسائل اور تقاضے

افکارِ مفتی محمودؒ اور عصرِ حاضر

مولانا ڈاکٹر عبد الحکیم اکبری ہمارے پرانے دوستوں میں سے ہیں، جمعیت طلبہ اسلام پاکستان کے مرکزی صدر رہے ہیں، گومل یونیورسٹی ڈیرہ اسماعیل خان کے شعبہ عربی وعلومِ اسلامیہ سے وابستہ ہیں، اور یونیورسٹی کی جامع مسجد کے خطیب بھی ہیں۔ انہوں نے حال ہی میں مفکر اسلام حضرت مولانا مفتی محمودؒ کی شخصیت اور دینی وعلمی خدمات پر ڈاکٹریٹ کی ہے اور ان کا مبسوط مقالہ چند اضافہ جات کے ساتھ "مولانا مفتی محمودؒ کی علمی، دینی و سیاسی خدمات" کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔ ۱۴ اکتوبر جمعرات کو پشاور میں اس کی رونمائی کی تقریب ہو رہی ہے جس کے لیے محترم مولانا فضل الرحمان نے مجھے فون پر بطور خاص دعوت دی ہے مگر پہلے سے طے شدہ مصروفیات کے باعث اس تقریب میں شرکت سے معذرت کرنا پڑی ہے۔ اس لیے اس کتاب میں سے حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے کچھ افکار و خیالات کو اس کالم کی میں نذرِ قارئین کر کے حاضری لگوانے کی کوشش کر رہا ہوں۔

سوا چھ سو کے لگ بھگ صفحات پر مشتمل یہ مجلد اور خوبصورت کتاب مکتبہ الحمید بالمقابل گرڈ اسٹیشن ڈیرہ اسماعیل خان نے شائع کی ہے۔ اس میں مختلف حوالوں سے اہم دینی، قومی اور معاشرتی مسائل کے بارے میں حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے ارشادات و افکار کو پیش کیا گیا ہے، انہی میں سے اپنے ذوق کے مطابق ایک انتخاب اس کالم میں شامل کر رہا ہوں۔ آج کے حالات کو سامنے رکھتے ہوئے اس مرد درویش کے خیالات و ارشادات ملاحظہ فرمائیے اور اس کی فراست و بصیرت پر اسے خراجِ عقیدت پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان فاصلوں کو بھی دیکھنے کی کوشش فرمائیے جو ان کی وفات کو صرف دو عشرے گزرنے کے ساتھ ہی ہمارے اور ان کے درمیان نہ صرف دکھائی دے رہے ہیں بلکہ دن بدن بڑھتے ہوئے بھی نظر آ رہے ہیں۔

مولانا مفتی محمود فرماتے ہیں کہ:

> "اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت ملک میں سب سے اہم مسئلہ ملک کی ۹۰ فیصد آبادی کے بڑے طبقے اور غریب عوام کے مسائل ہیں جو ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں جنہیں اپنے وطن میں نہ مکان میسر ہے نہ خوراک نہ لباس اور نہ زندگی کی دوسری سہولتیں میسر ہیں اور وہ یقیناً حیوانات سے بھی بدتر زندگی گزار رہے ہیں۔ جب تک ان کا مسئلہ حل نہیں ہوتا، اس وقت تک پاکستان میں کسی کو امن و سکون حاصل نہیں ہوگا۔

اسلام اس کی قطعًا اجازت نہیں دیتا کہ ایک عام مسلمان تو پاکستان میں محنت کرنے کے باوجود اپنے بچوں کا پیٹ نہ پال سکے اور بھوک اور فاقہ کشی کی زندگی گزار تا رہے جبکہ چند انسان یہاں خرمستیاں کرتے پھریں۔ خلیفۂ دوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ اگر ایک کتا بھی فرات کے کنارے بھوک سے مرتا ہے تو قیامت کے دن عمر (رضی اللہ عنہ) سے اس کا سوال کیا جائے گا۔"

"اس کے لیے بنیادی طور پر زمینداروں اور کارخانوں کے مسائل کا حل کرنا ضروری ہے۔ اسلام میں یہ متفقہ مسئلہ ہے کہ غیر آباد زمین کو آباد کرنے والا شرعًا اس کا مالک ہوتا ہے۔ اس اصول کے مطابق وہ تمام زمینیں جو قریب کے زمانے میں آباد ہوئی ہیں، ان کے آباد کار مزارعین ان زمینوں کے مالک قرار دیے جائیں۔ اور قدیم آباد زمینوں سے متعلق یہ تحقیق کی جائے کہ آیا یہ اراضی کسی جائز طریقے سے حاصل کی گئی تھیں یا انگریزوں نے "حق الخدمت" میں بطور جاگیر کے کسی کو عطا کی تھیں؟ اگر ایسا ہے تو ایسی تمام اراضی کو لازماً واپس لے کر بے زمین لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اگر مزارعین کو اس کے باوجود مظلومیت محسوس ہو تو کوئی بھی اسلامی حکومت ضرورت کے تحت مزارعت کے سسٹم کو ناجائز قرار دے سکتی ہے۔ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ تینوں امام اس بات پر متفق ہیں کہ مزارعت کا معاملہ جائز نہیں۔ چونکہ مسئلہ مجتہد فیہ ہے، اس لیے ضرورت کے تحت اس کو ممنوع قرار دینا کسی طرح بھی قابلِ اعتراض نہیں ہو سکتا"۔

"رہا بڑے بڑے صنعت کاروں کا مسئلہ تو اس سے متعلق سب سے اچھی صورت یہ ہے کہ حکومت لازمی طور پر مزدوروں کی تنخواہوں کو اس حد تک بڑھا دے کہ مزدور کو اپنی محنت کا پورا صلہ مل سکے جس سے اس کی زندگی کی بنیادی ضروریات، بچوں کی تعلیم اور علاج وغیرہ کی حسن و خوبی کے ساتھ کفالت ہو سکے۔"

"زراعت کو عام کیا جائے، غیر آباد زمینوں کو آباد کیا جائے، زمینوں کو ناجائز طور پر سیاسی رشوتوں کے لیے الاٹ نہ کیا جائے، زمین بے زمین لوگوں میں الاٹ ہو، آب پاشی کے ذرائع میں توسیع ہو، مشینی آلات کے ذریعے سے بھی ملکی زراعت کو ترقی دی جا سکتی ہے بشرطیکہ مشینی آلات کے تمام ذرائع اجتماعی طور پر استعمال ہوں، صرف ایک شخص کو یہ اختیارات حاصل نہ ہوں، اس طرح مزدور کسان بے کار ہو جائیں گے۔"

"بڑے شہروں میں کارخانوں کے قیام نے دیہات کی ترقی تو کیا ان کے وجود ہی کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ غریب لوگ دیہات سے بھاگ رہے ہیں، شہروں میں کارخانوں (اور دیگر سرکاری و غیر سرکاری اداروں) میں ملازمت کرتے ہیں، شہروں کے مسائل بھی اس طرح بڑھ جاتے ہیں۔ اس مسئلہ کا حل صرف یہ ہے کہ دیہی ترقیاتی اسکیموں پر زور دیا دیا جائے، اس لیے کہ ہمارے ملک کی غالب اکثریت دیہی آبادی پر مشتمل ہے، اس کے بغیر ہمارا ملک ترقی نہیں کر سکتا اور اس روش سے ملک کی زرعی معیشت بھی بہت متاثر ہوئی ہے۔"

"غریبوں سے ہمدردی رکھنے کی بنا پر بعض لوگ ہم پر "سوشلسٹ مولوی" ہونے کا الزام لگاتے ہیں حالانکہ اسلام غریبوں کا حامی اور مددگار بن کر آیا ہے۔ ہم اسلامی تعلیمات کے مطابق غریبوں کی مشکلات دور کرنے کا مطالبہ کرتے ہیں، ہم پاکستان میں سرمایہ داری کی حفاظت کے لیے اسلام کا نام استعمال نہیں ہونے دیں گے، سرمایہ داری کے ظالمانہ نظام کی حفاظت کے خواہاں اور امریکی سامراج کی مدد سے پاکستان کو ترقی دینے کے دعویدار پاکستان اور اس کے عوام کے دشمن ہیں۔"

"موجودہ سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت جس میں غریب غریب تر اور امیر امیر تر بنتے جا رہے ہیں، اسے بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا چاہیے۔ مغربی استعماری نظام، مغرب زدہ ظالمانہ نظام ہمارے تمام مسائل کی بنیاد ہے، جب تک اس کا خاتمہ نہیں کیا جاتا اس وقت تک معاشرے میں فلاح کا کوئی تصور بے سود ہے، بے کار ہے، خام خیالی ہے۔"

"سادگی اختیار کی جائے، وزیر اپنا نمونہ پیش کریں، اپنے گھروں کی تزیین و آرائش پر ہزاروں روپے خرچ نہ کریں، ڈرائنگ روم میں قیمتی صوفوں کی بجائے چٹائی کیوں نہیں بچھائی جا سکتی؟ اور بیڈ روم میں نفیس پلنگوں کی بجائے عام چارپائی کیوں کام نہیں دے سکتی؟ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ شہری علاقوں میں بڑے مکانوں کی تعمیر پر پابندی لگائی جائے۔ تین سو گز سے زیادہ مکان کسی صورت میں نہ بننے دیا جائے۔ ہمارے اکثر ملکی قوانین ایسے ہیں جو رشوت کا دروازہ کھولتے ہیں اور لوگوں کے مصائب میں اضافہ کرتے ہیں، ان کا جائزہ لے کر ہر قانون میں چور دروازے بند کیے جائیں۔ رشوت بدعنوانی پر کڑی سزائیں دی جائیں اور ان کا قلع قمع کیا جائے۔ شلوار قمیص کی حوصلہ افزائی ہو، سرکاری

ملازم دفتر میں قومی لباس پہن کر آئیں۔ اس طرح غیر ملکی لباس جو نفسیاتی رعب داب عطا کرتا ہے، اس سے نجات مل جائے گا۔ ایسے ضوابط بنائے جائیں کہ جھوٹ چھاپا یا لکھا نہ جا سکے۔ جھوٹ ایک زہر ہے جو معاشرہ کی اچھائیوں کو ڈس لیتا ہے۔ بے حیائی اور فحاشی کی روک تھام ہو اور ذرائع ابلاغ کی فوری اصلاح کی ضرورت ہے۔"

"ہم پاکستان کے غریب عوام، کسانوں، مزدوروں، طالب علموں اور تمام آدمیوں کو اس سطح پر لانا چاہتے ہیں جہاں پاکستان کے تمام مسلمان عملاً بھائی بھائی نظر آسکیں۔ اور یہ اس وقت ممکن ہوگا جبکہ بے لاگ طور پر ملک میں قرآن و سنت کے احکام نافذ کر دیے جائیں، خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے عہد کا عملی نمونہ اختیار کر لیا جائے اور ملک سے سیاسی، اقتصادی اور معاشی ظلم و جبر کا خاتمہ کر دیا جائے۔"

مولانا مفتی محمودؒ کے حالات زندگی، دینی و علمی جدوجہد، ملک کے استحکام اور نفاذِ اسلام کے لیے ان کی مساعی، اور عالمی استعمار کے مقابلہ میں اپنے عظیم اسلاف کی روایات کے تسلسل کو قائم رکھنے کے بارے میں مولانا عبد الحکیم اکبری نے نئی نسل کے لیے ایک اچھا ذخیرہ جمع کر دیا ہے، جس میں بعض مقامات پر اگرچہ تشنگی اور خلا کا احساس ہوتا ہے مگر مجموعی طور پر یہ کوشش مستحسن ہے جس پر مولانا اکبری ہم سب کی طرف سے مبارکباد اور شکریہ کے مستحق ہیں۔

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۱۴ اکتوبر ۲۰۱۰ء)

چائلڈ لیبر اور بنیادی انسانی حقوق

چیف جسٹس جناب اجمل میاں کی صدارت میں منعقدہ پاکستان لاء کمیشن کے ایک اجلاس نے گزشتہ دنوں کچھ سفارشات پیش کی ہیں جن میں سے ایک سفارش کے بارے میں کچھ معروضات پیش کرنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ سفارش چائلڈ لیبر کے بارے میں ہے جس میں کہا گیا ہے کہ بچوں سے محنت مزدوری کا کام لینے کی قانونی عمر میں ایک سال کا اضافہ کر دیا جائے اور اس کی کم از کم عمر پندرہ سال مقرر کر دی جائے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پندرہ سال سے کم عمر بچے سے محنت مزدوری کا کام لینا قانوناً جرم تصور ہوگا۔ اس سے قبل یہ عمر ہمارے ہاں چودہ سال ہے۔

بچوں سے محنت مزدوری کا کام لینا دو لحاظ سے زیادتی اور ظلم تصور ہوتا ہے:

1. ایک اس لیے کہ یہ عمر تعلیم حاصل کرنے یا کوئی ہنر سیکھنے کی ہوتی ہے اور بچے اس سے محروم ہو

جاتے ہیں۔

2. دوسرا اس وجہ سے کہ اس عمر میں ان پر محنت و مشقت کا بوجھ ڈالنا اور انہیں مسلسل جسمانی مشقت میں مصروف رکھنا سراسر زیادتی ہے۔ انہیں جائز تفریح کے مواقع نہیں ملتے جو اُن کی ذہنی نشوونما کے لیے ضروری ہے، اس طرح تعلیم و تربیت سے محرومی کے ساتھ ساتھ ان پر ذہنی اور جسمانی نشوونما کے دروازے بھی بند ہو جاتے ہیں۔

ہمارے ہاں بچوں سے کام لینے کا رواج عام ہے:

خدمت گزاری اور تربیت

اس میں ایک تو وہ رضا کارانہ کام اور خدمت ہے جو ماں باپ اپنی اولاد سے اور اساتذہ اپنے شاگردوں سے لیتے ہیں۔ یہ کام تربیت ہی کا حصہ ہوتا ہے اور اسلام ماں باپ اور اساتذہ کے اس حق کو تسلیم کرتا ہے بشرطیکہ وہ تربیت اور شفقت کے دائرہ میں ہو۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو انصارِ مدینہ کے ہر خاندان نے اپنی بساط کے مطابق آپؐ کی خدمت و معاونت کی ہر ممکن کوشش کی۔ ایک انصاریہ خاتون آنحضرتؐ کی خدمت میں اپنے دس سالہ بچے کو لے کر آگئیں کہ میرے پاس اور کچھ نہیں ہے اس لیے اپنے اس بچے کو آپ کی خدمت کے لیے وقف کرتی ہوں۔ یہ حضرت انس بن مالکؓ تھے جنہوں نے دس سال تک رسول اللہؐ کے ذاتی خادم کے طور پر ان کے ساتھ وقت گزارا۔ اور ان کا شمار حدیثِ رسولؐ کے تین چار بڑے راویوں میں ہوتا ہے۔

روزگار کی مشقت

دوسرا کام جبری ہے جو بچوں سے محنت مزدوری کرا کے ان کی کمائی حاصل کرنے کے لیے لیا جاتا ہے، یہ بہرحال مذکورہ بالا وجوہات کی بنا پر محلِ نظر ہے۔ اسلام کا اصول یہ ہے کہ جو کام کسی جائز حق کے حصول میں رکاوٹ بنتا ہو وہ ممانعت کے زمرے میں شامل ہو جاتا ہے۔ ہمارے ہاں بچوں سے جبری مشقت لینے کا رجحان موجود ہے اور کارخانوں، دکانوں، ہوٹلوں اور کام کاج کے دیگر مراکز میں آپ کو بچوں کی ایک بڑی تعداد دکھائی دے گی۔ یہ بچے معصوم ہاتھوں سے محنت مزدوری کر کے اپنی کمائی ماں باپ اور دیگر اہلِ خاندان کو کھلاتے ہیں۔

کچھ عرصہ پہلے قالین کی صنعت کے حوالہ سے چائلڈ لیبر کا مسئلہ بین الاقوامی سطح پر موضوع بحث بن گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ بعض بین الاقوامی اداروں اور خاص طور پر بھارتی لابیوں نے ہماری قالین بانی کی صنعت کو نقصان پہنچانے کے لیے یہ سوال کھڑا کر دیا تھا کہ پاکستان میں قالین بانی کا کام نوعمر بچوں سے لیا

جاتا ہے۔ اس کے بعد سے چائلڈ لیبر کے قوانین میں ترمیم اور انہیں بین الاقوامی معیار کے مطابق بنانے کے لیے مختلف حلقوں کی طرف سے مطالبات سامنے آرہے ہیں اور غالباً پاکستان لاء کمیشن کی مذکورہ سفارش کا پس منظر بھی یہی ہے۔

اصولی طور پر یہ سفارش بہت مناسب معلوم ہوتی ہے لیکن تصویر کے دوسرے رخ کے طور پر اس مسئلہ کا یہ پہلو بھی سامنے رکھنا ضروری ہے کہ جبری مشقت اور محنت مزدوری کرنے والے بچوں میں غالب اکثریت ایسے بچوں کی ہوتی ہے جن کے ماں باپ معاشی مجبوریوں کے ہاتھوں بے بس ہو کر انہیں اس رخ پر ڈالتے ہیں۔ ورنہ کوئی ماں باپ بالخصوص ماں اپنے معصوم بچوں کو محنت و مشقت اور تکلیف و اذیت میں ڈالنا پسند نہیں کرتی۔ آپ کو معاشرہ میں معذور اور مجبور ماں باپ کی ایک بڑی تعداد ایسی ملے گی جن کے روز مرہ ضروری اخراجات کی کفالت محنت مزدوری کرنے والے نوعمر بچے کرتے ہیں۔ اور اگر ان سے یہ روزگار چھین لیا جائے تو چوبیس گھنٹے میں ایک وقت کے لیے دال روٹی کا انتظام بھی ان کے لیے مشکل ہو جائے گا۔

بنیادی ضروریات کی کفالت کی ذمہ داری

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم ہمیشہ تصویر کا ایک رخ دیکھتے ہیں اور دوسرا رخ دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ ہمیں یہ تو نظر آتا ہے کہ مغربی ممالک میں بچوں سے محنت مزدوری کا کام لینا ممنوع ہے۔ لیکن یہ دکھائی نہیں دیتا کہ مغرب کی ویلفیئر ریاستیں اپنے شہریوں کی بنیادی ضروریاتِ زندگی کی کفالت کی ذمہ داری بھی اٹھاتی ہیں۔ یہ اصل میں اسلام کا اصول ہے اور خلافتِ راشدہ کے دور میں بیت المال یعنی قومی خزانے سے ہر شہری کی ضروریات زندگی کی لازمی کفالت کا عملی نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ امیر المومنین حضرت عمرؓ کا یہ ارشاد گرامی ہماری ملی تاریخ کا ایک روشن باب ہے کہ:

> ”اگر دریائے فرات کے کنارے ایک کتا بھی بھوک سے مر گیا تو قیامت کے روز عمرؓ سے اس کے بارے میں باز پرس ہوگی۔“

پانی، روٹی، کپڑا اور مکان ایک انسان کی کم از کم بنیادی ضروریات ہیں جن کے بغیر وہ روح اور جسم کا تعلق باقی نہیں رکھ سکتا۔ اور ایک اسلامی ریاست اپنے شہریوں کی ان ضروریات کی کفالت کی ذمہ دار ہے۔ اس سلسلہ میں ایک عرب دانشور کا استدلال مجھے بہت اچھا لگا جو انہوں نے انسان کی بنیادی ضروریات کے حوالہ سے قرآن کریم سے کیا ہے۔ انہوں نے سورۃ طٰہٰ کی آیت ۱۱۸ اور ۱۱۹ کا حوالہ دیا ہے جس کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام کو جنت میں خطاب کر کے ابلیس کے بارے میں

خبردار کرتے ہوئے اللہ رب العزت نے فرمایا کہ یہ تم دونوں کا دشمن ہے۔ اس لیے ہوشیار رہنا کہ یہ کہیں جنت سے تم دونوں کو نکال نہ دے۔ اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے جنت کی زندگی کی خصوصیت بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"بے شک اس جنت میں نہ تم بھوکے ہوگے اور نہ ننگے ہوگے۔ نہ پیاسے ہوگے اور نہ ہی بے سایہ ہوگے۔"

اس عرب عالم کا کہنا ہے کہ یہ ایک انسان کی کامیاب زندگی کا تصور ہے کہ اسے خوراک، لباس، پانی اور مکان میسر ہو۔ اور یہی انسان کی کم از کم بنیادی ضروریات ہیں۔

دستور ۱۹۷۳ء کے لیے مفتی محمودؒ کی تجویز

اسلامی جمہوریہ پاکستان کا مروّجہ دستور جو ۱۹۷۳ء کا دستور کہلاتا ہے، جب ترتیب پا رہا تھا تو شہریوں کی بنیادی ضروریات کی کفالت کا سوال اٹھایا گیا تھا۔ دستور ساز اسمبلی میں اس وقت حضرت مولانا مفتی محمودؒ اپوزیشن لیڈر تھے، انہوں نے ہمیں جمعیت علماء اسلام کے ایک اجلاس میں اس کی تفصیل سنائی۔ مولانا مفتی محمودؒ نے بتایا کہ جب شہری اور انسانی حقوق کی بات چلی تو انہوں نے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو مرحوم سے کہا کہ کم از کم بنیادی حقوق کا تعیّن کیا جائے اور دستور میں ان کی کفالت کی ریاست کی طرف سے ضمانت مہیا کی جائے۔ مفتی صاحبؒ کا کہنا تھا کہ انہوں نے بھٹو مرحوم کو ان کے انتخابی نعرے "روٹی، کپڑا اور مکان" کی طرف بھی توجہ دلائی کہ وہ تو لوگوں سے اس کا وعدہ کر چکے ہیں، اس لیے دستور میں شہریوں کا یہ حق تسلیم کیا جائے کہ وہ ریاست سے اپنے بنیادی حقوق حاصل کرنے کے لیے عدالت سے رجوع کر سکیں۔

مفتی صاحبؒ کے بقول بھٹو مرحوم نے کہا کہ ہمارے پاس اس وقت اتنے وسائل نہیں کہ ہم سب شہریوں کو یہ حقوق فراہم کر سکیں اور ان کی دستوری ضمانت دے سکیں۔ اس پر مولانا مفتی محمودؒ نے کہا کہ قومی سطح پر مطلوب وسائل کے حصول اور ان میں توازن پیدا کرنے کے لیے ایک وقت مقرر کیا جائے اور دستور میں صراحت کر دی جائے کہ شہریوں کو اپنے بنیادی حقوق اور ضروریات کے حصول کے لیے اتنے برسوں کے بعد عدالت سے رجوع کا حق حاصل ہو جائے گا، لیکن بنیادی حقوق کی ریاست کی طرف سے ضمانت کا تذکرہ کسی نہ کسی طرح دستور میں ضرور کر دیا جائے۔ مفتی صاحب کا کہنا تھا کہ وہ تفصیلی بحث و مباحثہ کے باوجود بھٹو مرحوم کو اس طرف لانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

مسئلہ وسائل کا نہیں، اُن کی تقسیم کا ہے

ہمارے ہاں شہریوں کو بنیادی حقوق کی فراہمی کے بارے میں عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ ملکی وسائل اس کے متحمل نہیں ہیں لیکن ہمیں اس موقف سے اتفاق نہیں ہے کیونکہ پاکستان کو اللہ تعالیٰ نے بہت وسائل سے مالامال کیا ہے۔ ہمارے پاس وسائل کی کمی نہیں ہے بلکہ اصل مسئلہ قومی دولت اور وسائل کی تقسیم میں عدمِ توازن کا ہے، اور قومی وسائل کے صحیح استعمال اور اس کی ترجیحات کا ہے۔ اور ہمارا المیہ یہ ہے کہ اس وقت ہماری قومی لیڈر شپ ایک جاگیر دارنی اور ایک صنعتکار کے درمیان شٹل کاک بن کر رہ گئی ہے۔ ان میں سے کوئی بھی قومی دولت اور وسائل کی تقسیم میں عدمِ توازن کو دور کرنے کا روادار نہیں ہے۔ اس حوالہ سے ان کے درمیان اختلاف صرف طبقاتی ترجیحات کا ہے اور پوری قوم اس طبقاتی کشمکش میں سینڈوچ بنی ہوئی ہے۔

چنانچہ اس وقت ہماری اصل ضرورت ایک ایسی قومی لیڈر شپ کی ہے جس کے گرد کسی مراعات یافتہ طبقہ کے مفادات و ترجیحات کا حصار نہ ہو اور وہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے موجودہ استحصالی اور ظالمانہ معاشی ڈھانچے کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے۔

ان گزارشات کے ساتھ ہم پاکستان لاء کمیشن کے معزز ارکان سے یہ عرض کرنا چاہیں گے کہ وہ قوم کے معصوم بچوں کو جبری مشقت سے بچانے کے لیے قانون سازی کی سفارش ضرور کریں، ہم ان کی تائید کرتے ہیں، لیکن اس کے ساتھ وہ مجبور والدین، بے سہارا خاندانوں اور دو وقت کی روٹی کے محتاج کنبوں کی روز مرّہ ضروریات کی کفالت کے لیے بھی کوئی سفارش لائیں۔ اور موجودہ طبقاتی، استحصالی اور ظالمانہ اقتصادی نظام سے نجات حاصل کرنے کے لیے بھی کوئی تجویز پیش کریں۔ اور اگر اس سلسلہ میں اسلامی تعلیمات، خلافتِ راشدہ اور حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کا حوالہ دیتے ہوئے انہیں کوئی حجاب محسوس ہوتا ہے تو اپنے فکری اور تہذیبی امام برطانیہ کا نام ہی لے لیں جہاں چائلڈ لیبر پر پابندی ہے لیکن اس کے ساتھ اسٹیٹ ہر شہری کی بنیادی ضروریات کی کفالت بھی کرتی ہے، اور جہاں کسی شہری کو بھوک اور بیماری کے ہاتھوں بے بس ہو کر اپنے معصوم بچوں کو آگ اگلتی بھٹیوں کے سامنے جھلسنے اور میلے کچیلے کپڑوں کے ساتھ ہوٹلوں کے برتن دھونے کے لیے نہیں بھیجنا پڑتا۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۱۴ جون ۱۹۹۹ء)

بچوں کی لازمی تعلیم اور چائلڈ لیبر کا مسئلہ

روزنامہ نوائے وقت لاہور ۲۳ دسمبر ۱۹۹۹ء کی ایک خبر کے مطابق حکومتِ پاکستان نے سکولوں میں بچوں کی تعلیم کو لازمی بنانے کے لیے قانونی اقدامات کا فیصلہ کیا ہے۔ جن کے تحت دکانوں، ہوٹلوں اور دیگر اداروں میں بچوں سے مزدوری لینے پر پابندی عائد کی جائے گی، اور بچوں کو سکول نہ بھیجنے والے والدین اور بچوں سے مزدوری کا کام کرانے والے دکانداروں اور مالکوں کے لیے سزائیں تجویز کی جائیں گی۔

پاکستان کی شرح خواندگی

جہاں تک بچوں کو سکول میں لازمی بھیجنے اور ان کی تعلیم کو یقین بنانے کا تعلق ہے ہمارے نزدیک اس سلسلہ میں سرکاری پالیسی بہت پہلے طے ہونی چاہیے تھی اور اس میں تاخیر سے قومی سطح پر بہت زیادہ نقصان ہو رہا ہے۔ ہمارے ہاں شرح خواندگی کا تناسب بہت کم ہے، جسے اپنے معاصر ممالک اور اقوام کے تناظر میں ذکر کرتے ہوئے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔ اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ پاکستان بننے کے بعد سے اب تک قومی سطح پر ایسی کوئی پالیسی سرے سے طے ہی نہیں کی گئی جس کا مقصد بچوں کے لیے لازمی تعلیم کو یقینی بنانا ہو۔ اب اگر حکومت کو اس کا خیال آگیا ہے تو اچھی بات ہے، لیکن یہ پالیسی زبانی جمع خرچ پر مبنی نہیں ہونی چاہیے، اور اس حوالے سے کاغذات میں ایجنڈا پورا کر کے عالمی اداروں کو دکھا دینے کی بجائے ٹھوس عملی اقدامات کی ضرورت ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس تعلیمی پالیسی کا مقصد محض عالمی اداروں کو خوش کرنا نہ ہو، بلکہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کی حیثیت سے ایک اسلامی نظریاتی ریاست کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر اس کے لیے تعلیمی نصاب اور نظام کی تشکیلِ نو کی جائے۔

یہ ہم اس لیے عرض کر رہے ہیں کہ جنرل ضیاء الحق مرحوم کے دور میں ''مسجد مکتب اسکیم'' کے تحت اس سلسلہ میں قدم اٹھایا گیا تھا مگر بعد میں عالمی اداروں کی مداخلت کی وجہ سے اسے روک دینا پڑا تھا۔ کیونکہ ان عالمی اداروں کا خیال تھا کہ مسجد کے ماحول میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے والے بچے یقیناً بنیاد پرست بنیں گے اور اس سے ملک میں بنیاد پرستوں کا تناسب خاصا بڑھ جائے گا۔ اس لیے ملک کے تمام بچوں کے لیے لازمی تعلیم کے انتظامات کے ساتھ ساتھ اس طرف بھی توجہ ضروری ہے کہ اس تعلیمی سسٹم کو عالمی اداروں کے فکری اور ثقافتی مقاصد کا آلۂ کار بننے سے روکا جائے، اور تعلیم کے نصاب و نظام کو قومی مقاصد کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے۔

بچوں کی جبری مزدوری کا معاملہ

اس کے ساتھ بچوں سے مزدوری لینے کی ممانعت اور اس پر سزا تجویز کرنے کا اقدام بھی خوش آئند ہے، مگر اس کے دوسرے پہلو کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ ان بچوں کو کام پر بھیجنے والے ماں باپ کی غالب اکثریت ایسے لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جو انتہائی لاچاری اور بے بسی کے عالم میں اپنے ننھے منے جگر پاروں کو مزدوری کے لیے بھیجنے پر مجبور ہوتے ہیں، ورنہ کوئی بھی ماں باپ ہنسی خوشی اپنے لاڈلوں کو مشقت میں ڈالنا گوارا نہیں کرتے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہمیں ترقی یافتہ ملکوں کے قوانین کا ایک پہلو تو نظر آتا ہے کہ وہاں چائلڈ لیبر پر پابندی ہے اس لیے ہمیں بھی اپنے ملکوں میں بچوں کو مزدوری پر پابندی لگانی چاہیے، لیکن یہ بات ہمیں نظر نہیں آتی کہ ان ترقی یافتہ ملکوں میں لوگوں کو روزگار کا تحفظ حاصل ہے، اور حکومتیں عام آدمی کی بنیادی ضروریات کی کفالت کی ذمہ داری قبول کرتی ہیں۔ اس لیے وہاں ایسے ماں باپ کی تعداد بہت کم ہوتی ہے جو دو وقت کی روٹی سے لاچار ہو کر اپنے بچوں کو مزدوری کے لیے بھیجنے پر مجبور ہوں۔

ہم چائلڈ لیبر پر پابندی کے حق میں ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ بچے کی اصل جگہ دکان، کارخانہ یا ہوٹل نہیں بلکہ سکول ہے، اور حکومت کو اس سلسلہ میں ضروری اقدامات کرنے چاہئیں۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ معاشرے کے بے بس اور لاچار خاندانوں کی کفالت کے سلسلہ میں بھی حکومت اپنی ذمہ داری کا احساس کرے، اور ہوشربا معاشی عدمِ تفاوت کو کم سے کم کر کے عام آدمی کی ضروریات کی کفالت کا سسٹم اختیار کیا جائے، تاکہ کسی خاندان کو مزدوری کے لیے اپنے بچوں کو دکانوں، کارخانوں اور ہوٹلوں میں بھیجنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔ جنوری ۲۰۰۰ء)

رفاہِ عامہ کا محاذ اور ہماری غفلت

دنیا بھر کے مسلم ممالک کے عوامی ماحول پر نظر ڈالی جائے تو ایک بات واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ مسلم معاشروں میں ایمان و عقیدہ اور تہذیب و ثقافت کی گرفت کو کمزور کرنے کے لیے سب سے زیادہ مؤثر طور پر جو ہتھیار استعمال ہو رہا ہے وہ این جی اوز کا ہے جو رفاہی اداروں کے عنوان سے قائم ہوتی ہیں۔ یہ این جی اوز تعلیم، صحت اور رفاہِ عامہ کے دیگر شعبوں میں سرگرم ہوتی ہیں اور اس کی آڑ میں اپنے فکری و تہذیبی ایجنڈے کو آگے بڑھاتی ہیں۔ یہ اس وقت مسلم معاشروں میں شکوک و شبہات پھیلانے، ایمان و

یقین کو کمزور کرنے، اور اسلامی احکام و قوانین کے حوالہ سے تذبذب کی فضا قائم کرنے کے لیے مغرب کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔

اگر میری اس گزارش کو گستاخی پر محمول نہ کیا جائے تو میں یہ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس میں ہماری کوتاہی اور غفلت کا زیادہ دخل ہے کیونکہ ہم رفاہِ عامہ کے محاذ پر، عوام کی تعلیم و صحت کی بہتری کے محاذ پر، اور ان کے حقوق و مفادات کے محاذ پر سرگرم نہیں ہیں۔ ہم نے ان کاموں کو اپنی ذمہ داریوں کے دائرے سے باہر نکال رکھا ہے اور اسی خلا سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مسیحی مشنریاں اور این جی اوز ہمارے ہاں اربوں روپے صرف کر کے کسی حد تک رفاہی کام بھی کر رہی ہیں لیکن اس سے کہیں زیادہ فکری انتشار اور تہذیبی خلفشار پھیلانے میں مصروف ہیں۔

ہمارے ہاں رفاہی کاموں کی کوئی اہمیت نہیں ہے حالانکہ یہ سنتِ رسولؐ ہے۔ علماء کرام کو اس سلسلہ میں دو واقعات یاد دلانا چاہوں گا۔

ایک یہ کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب پہلی وحی کے نزول کے بعد غارِ حرا سے گھر تشریف لائے اور آپؐ پر گھبراہٹ کی کیفیت تھی تو ام المومنین حضرت خدیجۃ الکبری رضی اللہ عنہا نے آنحضرتؐ کو کن الفاظ کے ساتھ تسلی دی تھی؟ اس پر ہم سب کو غور کرنا چاہیے۔ ام المومنینؓ نے کہا کہ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، غریبوں کے کام آتے ہیں، مہمانوں کی خدمت کرتے ہیں، ضرورتمندوں کا سہارا بنتے ہیں، اور بوجھ تلے دبے ہوئے لوگوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ اس لیے آپ کو اللہ تعالیٰ ہرگز ضائع نہیں ہونے دیں گے۔ دوسرے لفظوں میں ام المومنین حضرت خدیجہؓ نے آنحضرتؐ سے کہا کہ آپ سوشل ورکر ہیں اس لیے آپ بالکل اطمینان رکھیں آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ وہ اپنی مخلوق کی خدمت کرنے والوں کو ضائع نہیں ہونے دیتا۔

اسی طرح بخاری شریف کی روایت کے مطابق حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جب ایک موقع پر جناب نبی اکرمؐ سے اجازت لے کر مکہ مکرمہ سے ہجرت کا فیصلہ کر لیا اور اپنا سامان اٹھا کر مکہ مکرمہ سے نکل کھڑے ہوئے تو راستہ میں بنو قارہ قبیلہ کا کافر سردار ابن الدغنہ ملا۔ وہ یہ معلوم کر کے پریشان ہو گیا کہ حضرت ابوبکرؓ نے مکہ مکرمہ چھوڑ کر ہجرت کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ابن الدغنہ نے اس موقع پر حضرت ابوبکرؓ سے وہی الفاظ کہے جو ام المومنین حضرت خدیجہؓ نے غارِ حرا سے واپسی پر جناب نبی اکرمؐ سے کہے تھے۔ اس کافر سردار نے کہا کہ آپ سوشل ورکر ہیں اور کسی سوشل ورکر سے سوسائٹی کا محروم ہو جانا بہت بڑی محرومی ہوتا ہے، اس لیے میں آپ کو مکہ نہیں چھوڑنے دوں گا۔ چنانچہ وہ حضرت ابوبکرؓ کو اپنے ساتھ مکہ مکرمہ واپس لایا اور اعلان کیا کہ آج سے ابوبکرؓ ان کی امان میں ہیں اس لیے کوئی شخص ان سے تعرض نہ کرے۔

ان دو واقعات سے یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام میں سوشل ورک کی اہمیت کیا ہے۔ اس لیے میں علماء کرام اور اساتذہ سے عرض کرنا چاہوں گا کہ وہ

- عقیدہ کے محاذ پر خصوصی توجہ دیں جس کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ نئی نسل کو قرآن کریم کے فہم و شعور سے آراستہ کیا جائے اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت و سیرت سے انہیں واقف کرایا جائے۔
- اور اس کے بعد سماجی خدمت کے محاذ پر کام کو منظم کیا جائے کیونکہ اس میدان کو کلیتاً دشمن کے حوالے کر دینا دانشمندی نہیں ہے۔

مجھے یقین ہے کہ اگر ہم ان دو محاذوں پر سنجیدگی اور دل جمعی کے ساتھ کام شروع کر دیں اور اسے اپنا مشن سمجھ کر جدوجہد منظم کریں تو فکر و فلسفہ اور تہذیب و ثقافت کے میدان میں مغرب کی یلغار کا راستہ روکا جا سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس کی توفیق سے نوازیں، آمین یارب العالمین۔

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۲ جولائی ۲۰۰۲ء)

بھیک اور بھکاریوں کے حوالے سے چند گزارشات

وزیر اعظم میر ظفر اللہ خان جمالی ان دنوں لاؤس کے دورے پر ہیں، لاہور کے ایک قومی اخبار کی مختصر خبر کے مطابق انہوں نے لاؤس کے دارالحکومت میں ایک اخبار نویس سے گفتگو کرتے ہوئے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا ہے کہ لاؤس میں انہیں کوئی بھکاری نظر نہیں آیا، اس کے ساتھ ہی انہوں نے کہا ہے کہ پاکستان میں بھکاری بنتے نہیں بلکہ بنائے جاتے ہیں۔ بظاہر یہ ایک مختصر سا تاثر یا تبصرہ ہے جو جمالی صاحب نے بھکاریوں کے حوالہ سے پاکستان اور لاؤس کی صورتحال میں نظر آنے والے فرق پر کیا ہے لیکن اس کے پیچھے معانی اور حقائق کی ایک پوری دنیا پوشیدہ ہے۔

جہاں تک بھکاریوں کا تعلق ہے وہ دنیا کے ہر حصے میں پائے جاتے ہیں۔ ہم نے بھکاری افغانستان میں بھی دیکھے ہیں جو دنیا کے غریب ترین ممالک میں شمار ہوتا ہے، اور برطانیہ میں بھی انہیں بھیک مانگتے دیکھا ہے جسے ترقی یافتہ اور ویلفیئر اسٹیٹ کہا جاتا ہے اور جس ملک کو اپنے شہریوں کو زندگی کی ضروری سہولتیں ریاستی سطح پر مہیا کرنے کا امتیاز حاصل ہے۔ لندن کے انڈر گراؤنڈ ریلوے اسٹیشنوں پر آپ کو متعدد جگہ ایسے بھکاری نظر آئیں گے جو راستے میں کپڑا بچھائے بیٹھے ہیں، گٹار بجا رہے ہیں یا گا رہے ہیں اور گزرنے والے اس کے کپڑے یا کشکول نما برتن میں سکے پھینکتے چلے جاتے ہیں۔ انڈر گراؤنڈ ریل میں

ہم نے ہاتھ پھیلا کر مانگنے والے بھی دیکھے ہیں۔

کاہلی اور کام چوری کی بھیک

بھیک مانگنا بسا اوقات مجبوری کے باعث ہوتا ہے لیکن اکثر اوقات اس کا باعث کاہلی اور شوق ہوتا ہے کہ ایک انسان محنت مزدوری اور کام کاج سے جی چراتے ہوئے مشقت کی بجائے ہاتھ پھیلانے کی ذلت برداشت کرلیتا ہے، اور اس میں عافیت محسوس کرتا ہے کہ اسے کوئی کام نہ کرنا پڑے اور مانگ تانگ کر زندگی کے اخراجات پورے ہوتے رہیں۔ ایسی بھیک مانگنے سے اسلام نے منع کیا ہے اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص پر سخت ناراضی کا اظہار فرمایا ہے جو محنت مزدوری کی طاقت اور مواقع مہیا ہونے کے باوجود کام کاج سے گریز کرتا ہے اور بھیک مانگنے کو مشغلہ کے طور پر اختیار کرتا ہے۔

ضرورت اور مجبوری کی بھیک

البتہ معذوری اور مجبوری کی وجہ سے بوقت ضرورت بھیک مانگنے کی اجازت بھی دی گئی ہے اور روایات میں آتا ہے کہ جہاں آنحضرتؐ بلاوجہ بھیک مانگنے والوں کی حوصلہ شکنی کرتے تھے اور بسا اوقات انہیں ڈانٹ بھی دیا کرتے تھے وہاں کوئی ضرور تمند سوالی آپؐ کے دروازے سے خالی نہیں جایا کرتا تھا۔

فقہ حنفی کے معروف امام حضرت امام محمدؒ نے "کتاب الکسب" میں بھیک مانگنے کی شرعی حیثیت کی وضاحت کرتے ہوئے اس کے مختلف درجات بیان فرمائے ہیں کہ

- بسا اوقات بھیک مانگنا فرض ہو جاتا ہے جب جان کو خطرہ ہو، اور کسی اور ذریعے سے جان بچانے کے لیے خوراک ملنے کی بظاہر کوئی صورت نہ ہو تو ضرور تمند پر فرض ہے کہ وہ بھیک مانگ کر اتنی خوراک حاصل کرلے جس سے جان بچ جائے۔
- اور ایک درجہ حرام ہونے کا ہے کہ ضرورت نہیں ہے اور متبادل ذرائع موجود ہیں مگر ایک شخص محض شوق پورا کرنے کے لیے یا لالچ کے لیے بھی مانگتا ہے، ایسی بھیک مانگنا حرام ہے اور بھیک مانگنے والا کبیرہ گناہ کا مرتکب ہے۔
- ان دونوں درجوں کے درمیان مباح اور مکروہ کے درجات بھی ہیں۔

اسلام نے معاشرے سے بھیک کے خاتمہ کے لیے بیت المال کو شہریوں کی ضروریات کا کفیل قرار دیا ہے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ "السلطان ولی من لا ولی له" جس کا کوئی ولی نہیں سلطان (امیر المؤمنین) اس کا ولی ہے۔ اسی اصول پر امیر المؤمنین حضرت عمرؓ نے ویلفیئر اسٹیٹ کے اس آئیڈیل سسٹم کی بنیاد رکھی تھی جس میں معاشرہ کے نادار، معذور، بے روزگار، بے سہارا

اور ضرور تمند افراد کی فہرستیں مرتب کر کے بیت المال کی طرف سے ان کے وظائف مقرر فرمائے تھے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ جو شخص خود اپنے اخراجات پورے نہیں کر سکتا اور کوئی شخص بھی اس کے اخراجات کی کفالت کا شرعًا یا عُرفًا ذمہ دار نہیں ہے تو اس کے اخراجات کی کفالت کی ذمہ داری ریاست پر ہے اور اسے بیت المال سے اتنا وظیفہ دیا جائے گا جس سے وہ اپنے روز مرّہ کے ضروری اخراجات پورے کر سکے۔

حضرت عمرؓ کے بعض سوانح نگاروں نے لکھا ہے کہ انہوں نے ایک بوڑھے یہودی کو بازار میں لوگوں سے بھیک مانگتے دیکھا تو یہ کہہ کر تعجب کا اظہار کیا کہ جب ہم بیت المال سے ہر ضرور تمند کو اس کی ضرورت کے مطابق وظیفہ دیتے ہیں تو یہ بوڑھا لوگوں سے کیوں مانگ رہا ہے؟ گویا حضرت عمرؓ کے نزدیک ویلفیئر اسٹیٹ کا تصور یہ تھا کہ ریاست اپنے شہریوں کی ضروریات کی اس درجہ میں کفالت کی ذمہ داری اٹھائے کہ کسی شخص کو دوسرے شخص کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

ہمارے معاشرے کی صورتحال

ہمارے معاشرے میں بھیک مانگنے والے تین سطح کے لوگ ہیں:

1. بہت سے افراد ضرورت اور مجبوری کے تحت بھیک مانگتے ہیں اور ان کی پوزیشن فی الواقع ایسی ہوتی ہے کہ جسمانی معذوری یا روزگار کے مواقع میسر نہ آنے کی وجہ سے ان کے پاس اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہوتا کہ وہ بھیک مانگ کر اور ہاتھ پھیلا کر زندگی کا رشتہ قائم رکھیں۔
2. دوسری سطح کے لوگ وہ ہیں جو عادت، شوق، یا کام چوری کی وجہ سے بھیک مانگنے کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ اور ایسے لوگوں میں مبینہ طور پر بہت سے افراد اس قسم کے بھی ہوتے ہیں جن کی تجوریوں اور بینک بیلنس میں لاکھوں روپے موجود ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود وہ سڑکوں پر بھیک مانگتے نظر آتے ہیں۔
3. جبکہ تیسری سطح پر وہ لوگ ہیں جنہیں باقاعدہ بھکاری بنایا جاتا ہے۔ بچوں کو اغوا کر کے اور بہت سے لوگوں کو مختلف طریقوں سے معذور کر کے ان سے بھکاریوں کا کام لیا جاتا ہے۔ ایسے منظم گروہ ہر علاقے میں موجود ہیں جو بچوں سے، عورتوں سے اور معذوروں سے بھیک منگواتے ہیں اور ان سے اپنا حصہ وصول کرتے ہیں۔ ان میں سے بعض گروہ شخصی مجبوریوں کے ساتھ ساتھ اجتماعی رفاہی کاموں مثلاً یتیم خانوں، دینی مدارس اور رفاہی اداروں کا سہارا لیتے ہیں جس سے ان شعبوں میں صحیح کام کرنے والے اداروں کی بھی بدنامی ہوتی ہے، لیکن یہ سب کچھ ہوتا ہے۔

ہمارا خیال ہے کہ وزیر اعظم میر ظفر اللہ خان جمالی نے یہ کہہ کر اس نوع کے بھکاری گروہوں کی طرف اشارہ کیا ہے کہ پاکستان میں بھکاری بنتے نہیں بلکہ بنائے جاتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ بہت سے افراد کی مجبوریوں سے ناجائز فائدہ اٹھا کر انہیں پیشہ ور بھکاری اور گداگر بننے پر مجبور کر دیا جاتا ہے۔

جبکہ مجبوریوں کی وجہ سے خود بھکاری بننے والوں کی بھی کمی نہیں ہے اور معاشرہ میں ایسے افراد آپ کو ہر طرف نظر آئیں گے جو اپنی ضروریات پوری کرنے سے معذور ہیں، اخراجات مہیا کرنے سے لاچار ہیں اور جسم و جان کا رشتہ قائم رکھنے کے لیے ضروری اسباب کا فراہم کرنا ان کی دسترس میں نہیں۔ ان میں سے بہت سے لوگ وہ ہیں جو عزت اور سفید پوشی کا بھرم قائم رکھتے ہوئے اندر ہی اندر گھل گھل کر مرتے رہتے ہیں، بعض افراد خودکشی پر مجبور ہو جاتے ہیں اور بہت سے لوگ دامن اور ہاتھ پھیلا کر لوگوں کے سامنے اپنا پیٹ ننگا کر دیتے ہیں۔ جمالی صاحب اگر سنجیدگی سے اس صورتحال کا جائزہ لیں تو انہیں دکھائی دے گا کہ ایسے لوگوں کی تعداد دن بدن بڑھتی جا رہی ہے اور جہاں سوسائٹی کے محدود طبقات اور افراد کی دولت اور امارت میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے وہاں ضرورتمند، مجبور اور بے بس شہریوں کی تعداد اس سے کہیں زیادہ تناسب کے ساتھ بڑھتی جا رہی ہے۔

یہ لوگ اگرچہ بظاہر اپنی مجبوریوں کے تحت خود بھکاری بنتے ہیں لیکن ہمارے نزدیک انہیں بھکاری بنایا جاتا ہے اور انہیں بھکاری بنانے کا کام ہمارا سسٹم سرانجام دیتا ہے۔ مروّجہ نوآبادیاتی معاشی ڈھانچہ اسی مقصد کے لیے کام کر رہا ہے کہ ملک کی دولت اور اسباب و وسائل چند افراد اور طبقات کی مٹھیوں میں سمٹتے چلے جائیں اور ملک کی آبادی کی اکثریت ان کی محتاج اور دست نگر بن کر رہے تاکہ ان کا اقتدار اور بالادستی قائم رہے اور وہ عوام کے خون پر اپنی عیاشی کی زندگی جاری رکھ سکیں۔

حکومت کی ذمہ داری

ان سطور کی اشاعت تک وزیر اعظم میر ظفر اللہ خان جمالی واپس وطن تشریف لا چکے ہوں گے، ہماری ان سے گزارش ہے کہ لاؤس میں کسی بھکاری کو مانگتے نہ دیکھ کر ان کے دل و دماغ میں جو احساس و تاثر ابھرا ہے وہ مبارک اور خوش آئند ہے، اسے وقتی بات سمجھ کر نظر انداز نہ کر دیں۔ بلکہ انہوں نے بھکاریوں کے حوالہ سے لاؤس اور پاکستان کی صورتحال میں جو فرق دیکھا ہے اسے دیکھ کر پاکستان میں بھکاریوں کی دن بدن بڑھتی ہوئی رفتار کے اسباب کا جائزہ لیں تاکہ جس خوشی کا اظہار انہوں نے لاؤس میں کیا ہے اس قسم کی خوشی وہ پاکستان میں بھی دیکھ سکیں۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ عوام کی ایک بڑی تعداد کو معاشی بدحالی کے شکنجے میں جکڑ کر خودکشی کرنے یا بھکاری بننے پر مجبور کرنے والے غیر منصفانہ معاشی نظام پر ہاتھ

ڈالا جائے اور خلفائے راشدینؓ کے اسوۂ حسنہ کو سامنے رکھتے ہوئے ملک کو ایسا فطری اور منصفانہ نظام دیا جائے جو چند افراد اور طبقات کی تجوریاں بھرتے چلے جانے کی بجائے عام شہریوں کو زندگی کی ضروریات فراہم کرنے کی ذمہ داری قبول کرے۔

گزشتہ دنوں صدر جنرل پرویز مشرف نے بھی لاہور میں اجتماعی شادیوں کی ایک تقریب سے خطاب کرتے ہوئے اس بات پر دکھ کا اظہار کیا تھا کہ بعض لوگ بہت اچھی زندگی گزار رہے ہیں مگر عوام کی اکثریت انتہائی غربت اور بے بسی کی حالت میں زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ وعدہ نہیں کرتے لیکن کوشش کر رہے ہیں کہ عام شہریوں کو روٹی، کپڑا اور مکان کی سہولت فراہم کریں۔ ہمیں اس سے اتفاق ہے کہ صدر پرویز مشرف موجودہ حالات میں یہ وعدہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں لیکن اس کی وجہ وسائل کی کمی نہیں بلکہ ملکی وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم کا نوآبادیاتی نظام ہے جس کی موجودگی میں کوئی بھی حکمران عوام کو زندگی کی ضروریات فراہم کرنے کا وعدہ نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہم صدر پرویز مشرف اور وزیر اعظم ظفر اللہ جمالی کو یقین دلاتے ہیں کہ اگر وہ اس منحوس اور بوسیدہ نظام سے قوم کی جان چھڑا کر حضرت عمرؓ والا نظام اس ملک میں لا سکیں تو جمالی صاحب کو لاؤس کی طرح پاکستان میں بھی کوئی بھکاری نظر نہیں آئے گا اور جنرل پرویز مشرف بھی یہ وعدہ کرنے بلکہ گارنٹی دینے کی پوزیشن میں ہوں گے کہ ملک کے ہر شہری کو روٹی، کپڑا اور مکان جیسی بنیادی سہولتیں ریاست کی طرف سے فراہم کی جائیں گی۔ اس لیے کہ اس ویلفیئر سسٹم کے بانی حضرت عمرؓ کا سلوگن یہ تھا کہ ''اگر دریائے فرات پر کوئی کتا بھی بھوک سے مر جائے تو اس کے بارے میں عمر مسئول اور ذمہ دار ہوگا۔''

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۲۵ اپریل ۲۰۰۴ء)

مہنگائی، قوتِ خرید اور طبقاتی کلچر

تین خبریں بظاہر ایک دوسرے سے الگ نظر آتی ہیں مگر خدا جانے کیوں مجھے ایک سی لگتی ہیں:

1. ایک یہ کہ وزیر اعظم نے بجٹ کے موقع پر عوام کو خوشخبری دی ہے کہ دالیں کچھ سستی ہو گئی ہیں۔
2. دوسری یہ کہ قومی اسمبلی کے اسپیکر نے اس شکایت کی تحقیقات کا حکم دے دیا ہے کہ ارکانِ اسمبلی کو ایک روز ناشتہ میں جو حلوہ دیا گیا اس میں ریت پائی گئی تھی۔
3. اور تیسری خبر یہ کہ خیر سے ایک رکن قومی اسمبلی کے دل میں غریب عوام کی ہمدردی جاگی ہے اور انہوں نے درویشی اختیار کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے، اس طور پر کہ آئندہ وہ کھانے پینے کے لیے

مٹی کے برتن استعمال کریں گے، زمین پر سوئیں گے، اور بسوں پر سفر کیا کریں گے۔

دالوں کے سستا ہونے کی بات بھی خوب ہے، اگر واقعی دال اس حد تک سستی ہو جائے کہ ایک عام آدمی کی قوتِ خرید کے دائرے میں رہے تو واقعتاً غریب آدمی کے لیے یہ خوشخبری کی بات ہے کہ کوئی چیز تو ایسی ہے کہ وہ آسانی سے خرید کر اپنے بچوں کو دو وقت روٹی کھلا سکتا ہے، مگر غریب آدمی کی ایسی قسمت کہاں!

بچپن کے نرخ

میرے بچپن کے دور میں یعنی اب سے کوئی چالیس پینتالیس سال قبل اشیائے خورد و نوش کی جو قیمتیں تھیں، آج کے بچوں کو جب وہ بتاتے ہیں تو انہیں یا تو خواب کی باتیں لگتی ہیں یا وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ بتانے والے کا دماغ چل گیا ہے۔ ہمارے گھر میں بھائیوں میں بڑا ہونے کی وجہ سے بازار سے سودا سلف لانے کی ذمہ داری زیادہ تر میری ہوتی تھی۔ والدہ صاحبہ محترمہ کی علالت کی وجہ سے گھر میں دو ہنڈیاں پکتی تھیں۔ ان کے لیے بکرے کی گردن کا ایک پاؤ گوشت لایا جاتا تھا اور باقی گھر والوں کے لیے بڑا گوشت پکتا تھا۔ میں نے ایک مدت تک بڑا گوشت چودہ آنے سیر اور بکرے کا گوشت دو روپے سیر خریدا ہے۔ جی ٹی روڈ گکھڑ میں جامع مسجد بوہڑ والی کے نیچے اللہ رکھا صاحب مرحوم کی گوشت کی دکان تھی، ان سے چھوٹا گوشت لایا جاتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک روز میں نے پاؤ گوشت تلوا کر ایک روپیہ انہیں دیا تو انہوں نے مجھے سات آنے واپس کیے، گویا ایک پاؤ گوشت کے نو آنے وصول کیے۔ میں نے غصے سے گوشت کا پیکٹ ان کی طرف پھینکا اور گھر کی طرف بھاگ نکلا۔ وہ دکان چھوڑ کر میرے پیچھے پیچھے جی ٹی روڈ تک آئے اور مجھے پکڑ کر کہا حافظ جی! آپ ٹوٹے ہوئے آٹھ آنے لے آیا کریں اور چپکے سے مجھے پکڑا دیا کریں، میرا بھاؤ خراب نہ کریں۔ اس کے بعد میں ایسے ہی کرتا رہا۔

اللہ رکھا صاحب مرحوم کا ذکر ہوا ہے تو ایک واقعہ اور یاد آ گیا ہے۔ میرے والد محترم حضرت مولانا محمد سرفراز خان صفدر نے عید الاضحیٰ سے ایک روز قبل مجھے ان کے پاس بھیجا کہ وہ قربانی کے لیے کوئی مناسب سا جانور دے دیں، عید کے بعد ان سے حساب کر لیں گے۔ میں گیا تو انہوں نے جانوروں میں سے ایک "لیلے" کا انتخاب کیا اور اس کی رسی مجھے پکڑا دی، میں اسے گھر لے آیا۔ عید پر اسے ذبح کرنے کے لیے بھی وہی اللہ رکھا صاحب آئے۔ اور دو تین روز بعد والد صاحب نے مجھے ایک سو روپے کا نوٹ دے کر بھیجا کہ جا کر ان کا حساب دے آؤ۔ انہوں نے نوٹ رکھ لیا اور باقی کچھ نہ دیا۔ میں نے واپس آ کر والد صاحب کو بتایا تو تعجب بلکہ قدرے غصے کے ساتھ کہا کہ "عجیب آدمی ہے، سارے ہی رکھ لیے ہیں"۔

گوجرانوالہ سے لاہور کا سفر میں نے جس زمانے میں شروع کیا بس کا کرایہ ایک روپیہ چھ آنے تھا۔ لاہور سے ملتان کا پہلا سفر میں نے بس میں سوا پانچ روپے میں کیا ہے۔ اور گوجرانوالہ سے راولپنڈی کا سفر مجھے سوا چار روپے میں یاد ہے۔ مجھے یہ واقعہ کبھی نہیں بھول سکتا کہ میرے طالب علمی کے ابتدائی دور میں چند طلبہ نے مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ میں ایک یونین بنائی جس کا سیکرٹری میں تھا۔ ہم نے طلبہ کے زیر انتظام ایک جلسہ کیا جس میں ملتان سے حضرت مولانا محمد علی جالندھریؒ کو رخصت کرتے وقت گوجرانوالہ سے ملتان تک بس کے کرائے کا حساب کر کے پندرہ روپے پیش کیے تو بڑی شفقت سے فرمانے لگے کہ بیٹا اس تکلیف کی ضرورت نہیں تھی مگر تبرک سمجھ کر رکھ لیتا ہوں۔

اب وہ دور یاد آتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ یا تو وہ کوئی حسین خواب تھا، یا اب کسی بھیانک خواب کے حصار میں ہیں۔ بچوں کو اس دور کے حالات بتاتے رہیں تو انہیں ہماری دماغی حالت پر شک ہونے لگتا ہے۔ عام ضرورت کی اس زمانے کی قیمتوں میں اور آج کی قیمتوں میں کوئی نسبت ہی نہیں، کوئی جوڑ ہی نہیں، مگر جب ماہرین معیشت کے سامنے ذکر کرتے ہیں تو وہ آسان سا جواب دے دیتے ہیں کہ قیمتیں بڑھی ہیں تو آمدنی میں بھی تو اضافہ ہوا ہے۔ لیکن یہ جواب درست نہیں ہے، بلکہ تنخواہ دار طبقہ اور محدود آمدنی رکھنے والے حضرات کے حوالے سے تو بالکل ہی غلط ہے۔ مزدور طبقہ اور تنخواہ دار لوگوں کی مزدوری اور تنخواہوں میں اس دوران جو اضافہ ہوا ہے وہ اس اضافے کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہے جو قیمتوں میں اضافے کے حوالے سے ہمارے سامنے ہے۔

۱۹۷۰ء کی تنخواہ

میں ایک دوست کو جانتا ہوں جن کی تقرری ایک ادارے میں ۱۹۷۰ء میں ڈیڑھ سو روپے ماہوار پر ہوئی۔ اس دور میں سونے کی قیمت ایک سو ستر روپے فی تولہ کے لگ بھگ تھی۔ اب وہ صاحب اسی ادارے میں اس تنخواہ کی ترقی یافتہ شکل ساڑھے پانچ ہزار روپے ماہوار کی صورت میں وصول کر رہے ہیں۔ آپ بازار سے سونے کا بھاؤ معلوم کر لیں اور فیصلہ کریں کہ ان صاحب کی تنخواہ میں ویلیو کے اعتبار سے اضافہ ہوا ہے یا کمی ہوئی ہے۔ اصل صورتحال یہ ہے کہ تنخواہوں یا مزدوری میں گنتی کے حساب سے اضافے کے باوجود ویلیو اور قدر کے لحاظ سے مسلسل کمی ہوتی جا رہی ہے، مگر اشیائے ضرورت کی قیمتوں میں اس سے کئی گنا زیادہ اضافہ ہو رہا ہے۔ جس نے عام آدمی اور خاص طور پر تنخواہ دار طبقہ کے لیے اس کے سوا کوئی راستہ باقی نہیں چھوڑا کہ یا تو وہ زندگی سے دستبرداری اختیار کر کے خودکشی اور بچوں کو ذبح کرنے کی راہ اختیار کریں، اور یا پھر کرپشن، رشوت اور بددیانتی کے خوگر ہو کر اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کی کوئی

صورت نکالیں۔

یہ سطور لکھتے ہوئے ۱۹۷۰ء کی ایک روایت یاد آگئی ہے۔ میں اس دور میں مرکزی جامع مسجد گوجرانوالہ میں بطور نائب خطیب خدمات سرانجام دے رہا تھا، جبکہ خطیب ہمارے مرحوم بزرگ حضرت مولانا مفتی عبدالواحدؒ تھے۔ ان کے پاس ایک گاڑی تھی، متعدّد بار ایسا ہوا کہ میں نے جیب میں دس روپے کی گنجائش محسوس کی تو مفتی صاحب سے گاڑی مانگ لی، دو گیلن پٹرول ڈلوایا اور لاہور آکر دوستوں سے مل کر اور ایک دو کام نمٹا کر دس روپے میں گوجرانوالہ واپس پہنچ گیا۔ آج صورتحال یہ ہے کہ ڈائیو نے لاہور سے گوجرانوالہ تک جو لوکل بس سروس چلائی ہے اس کا کرایہ ساٹھ روپے فی سواری ہے۔

۱۹۷۰ء کا ذکر بار بار اس لیے کر رہا ہوں کہ اس کے بعد پھر اشیائے صرف کی قیمتوں نے ایسی پرواز شروع کی کہ ان کی رفتار میں اب تک کوئی کمی واقع نہیں ہو سکی۔ اور قارئین کو یاد ہو گا کہ ۱۹۷۷ء میں "پاکستان قومی اتحاد" کی تشکیل کے بعد اس کے پہلے سیکرٹری جنرل جناب رفیق احمد باجوہ مرحوم نے ۱۹۷۰ء کی قیمتوں کی واپسی کا نعرہ لگایا تھا جو ناقابلِ عمل ہونے کے باوجود اس نے اس وقت کے سب سے بڑے انتخابی نعرے کی حیثیت اختیار کر لی تھی، اور اس نعرے نے باجوہ صاحب مرحوم کا نام ایک عوامی مقرر کے طور پر عروج تک پہنچا دیا تھا۔

قوتِ خرید کو سہارا دینے کی ضرورت

میں ۱۹۷۰ء کی قیمتوں کی واپسی کی بات نہیں کر رہا اور نہ ہی یہ قابلِ عمل بات ہے، کیونکہ اس کا تعلق بین الاقوامی حالات اور عالمی مارکیٹ سے ہے، جس میں ہم یا ہماری حکومت کچھ نہیں کر سکتے۔ لیکن عام آدمی کی قوتِ خرید کو سہارا دینے کی بات تو ہو سکتی ہے، اور عوام دوست حکومتیں یہی کرتی ہیں۔ مہنگائی ترقی یافتہ میں بھی ہے لیکن وہاں کی حکومتیں اپنے شہریوں کی قوتِ خرید کو استحکام کے دائرے میں رکھنے کی سر توڑ کوشش کرتی ہیں، اور ان کی معاشی پالیسیاں اسی نکتہ کے گرد گھومتی ہیں۔ لیکن یہ بات اس ماحول اور فضا میں نہیں ہو سکتی کہ ملک کا وزیراعظم اپنے عوام کو تو دال سستی ہونے کی خوشخبری دے، مگر قومی اسمبلی اپنے ارکان کے ناشتے کے حلوے میں ریت کے چند ذرے شامل ہو جانے پر بحث کر رہی ہو، اور کوئی جاگیردار ایم این اے مٹی کے برتن میں پانی پی کر خوش ہو جائے کہ اس نے غریب عوام کا مسئلہ حل کر دیا ہے۔ اس کے لیے

- طبقاتی کلچر بدلنا ہو گا،
- دولت اور وسائلِ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم پر نظر ثانی کرنا ہو گی،

- عام آدمی کی قوتِ خرید میں استحکام لانے کے لیے خوشحال اور مراعات یافتہ طبقے کے حوالے سے خلفائے راشدینؓ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو آئیڈیل بنانا ہوگا، اور اس وقت صرف انہی کا اسوہ ہمیں معاشی ناہمواری، غربت اور مہنگائی کی اس خوفناک دلدل سے نکال سکتا ہے۔

(روزنامہ پاکستان، لاہور۔ ۲۷ جون ۲۰۰۶ء)

معاشی بدحالی سے نکلنے کا صحیح راستہ

روزنامہ جنگ لاہور ۲۶ مارچ میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ پچیس ہزار روپے ماہانہ میں ایک فیملی کا گزارہ موجودہ حالات میں ممکن نہیں ہے، اس لیے محنت کش کی اجرت کم از کم پینتیس ہزار روپے ماہوار مقرر کی جانی چاہیے۔

ناہموار معاشی نظام اور قائداعظمؒ کا فرمان

وطنِ عزیز میں اجرتوں کا مسئلہ قیامِ پاکستان کے بعد سے ہی بحث و مباحثہ کا موضوع چلا آرہا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ جو ناہموار معاشی سسٹم ہمیں نوآبادیاتی حکمرانوں سے ورثہ میں ملا تھا ہم نے اس میں کوئی ردوبدل کیے بغیر نہ صرف جاری رکھا بلکہ اس کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے بیرونی قرضوں کے جال میں خود کو جکڑتے چلے گئے۔ جس کے نتیجے میں پوری قوم بیرونی قرضوں کے شکنجے میں ہے اور ایڈہاک ازم پر مبنی معاشی پالیسیوں نے ملک کو معاشی بدحالی کی انتہا پر لا کھڑا کیا ہے۔ حالانکہ بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح مرحوم نے اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے افتتاح کے موقع پر ہی کہہ دیا تھا کہ وہ ملک کے نظامِ معیشت کو مغربی اصولوں پر نہیں بلکہ اسلامی اصولوں پر استوار دیکھنا چاہتے ہیں اور اقتصادی ماہرین سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اسلامی اصولوں کی روشنی میں ملک کے معاشی نظام کو استوار کرنے کی طرف قوم کی راہنمائی کریں گے۔ مگر قائداعظمؒ کے وفات پاتے ہی ان کے سب ارشادات کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے نوآبادیاتی نظام کے تسلسل کو جاری رکھنے اور اس کے لیے مغربی قوتوں کی پشت پناہی ہر صورت میں قائم رکھنے کی پالیسی اختیار کرلی گئی، جس کا خمیازہ آج پوری قوم بھگت رہی ہے۔

مگر سوال یہ ہے کہ اس سارے معاملہ کا حل کیا ہے؟ ہمارا خیال ہے کہ جزوی اور وقتی نوعیت کے اقدامات مسائل کو مزید الجھاتے جارہے ہیں اور ہمارے گرد قرضوں اور بیرونی دباؤ کا شکنجہ مزید سخت ہوتا جارہا ہے، اس کے لیے قائداعظم مرحوم کے اس ارشاد کی طرف واپس جائے بغیر ہمارے لیے اور کوئی راستہ باقی نہیں رہ گیا کہ ہم اپنی معیشت کی اساس مغربی اصولوں کی بجائے اسلامی تعلیمات اور اصولوں کو

بنائیں اور ان کی روشنی میں معاشی ڈھانچہ کی از سرِ نو تشکیل کر کے اس کی بنیاد پر اصلاحات کا آغاز کریں۔ یہ کام آسان نہیں ہے، اس سے مشکلات وقتی طور پر ضرور بڑھیں گی اور بین الاقوامی دباؤ اور مداخلت بھی اپنا آخری حربہ اختیار کرنے میں کسی ہچکچاہٹ سے کام نہیں لے گی، مگر جب اس کے سوا ہمارے پاس اور کوئی آپشن موجود ہی نہیں ہے اور کسی نہ کسی وقت ہم نے اسے بہرحال اختیار کرنا ہی ہے تو اسے ٹالتے چلے جانے کی بجائے جتنی جلد ہو سکے اسے اختیار کر لینا چاہیے۔

کم از کم اجرت کا معیار

جہاں تک کم از کم اجرت اور تنخواہ کا تعلق ہے، ہمیں نصف صدی قبل کا وہ ماحول یاد ہے جب جمعیت علماء اسلام پاکستان نے ۱۹۷۰ء کے انتخابی منشور میں یہ حل پیش کیا تھا کہ تنخواہوں کے تناسب کو ایک اور دس پر لا کر بتدریج ایک اور پانچ کے تناسب تک لایا جائے تاکہ باہمی تفاوت کو کم سے کم کیا جا سکے۔

اسی طرح اس وقت کی محنت کشوں کی ایک جماعت ”پاکستان لیبر پارٹی“ نے یہ تجویز دی تھی کہ کم از کم تنخواہ ایک تولہ سونا طے کی جائے تاکہ کرنسی کا اتار چڑھاؤ عام آدمی کی معاشی ضروریات اور مشکلات پر اثر انداز نہ ہو سکے۔

اسی تناظر میں راقم الحروف نے گذشتہ دنوں ”رفاہی ریاست: قرآن و سنت کی روشنی میں“ کے عنوان پر ایک لیکچر کے دوران گزارش کی کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کے قبیلہ کے اس طرز عمل کی تحسین فرمائی تھی کہ وہ جب کسی معاشی بحران کا شکار ہوتے ہیں تو سب لوگ اپنے اثاثے ایک جگہ جمع کر کے آپس میں برابر تقسیم کر لیتے ہیں۔

معاشی نظام کی تشکیلِ نو کی ضرورت

اس کا مطلب یہ تھا کہ پورے معاشی نظام کی از سرِ نو تشکیل اور وسائل کی نئے سرے سے باہمی تقسیم بھی معاشی بدحالی کا ایک ایسا حل ہے جس کی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تحسین فرمائی ہے اور بوقت ضرورت اسے اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اس سے ہماری اس گزارش کی تائید ہوتی ہے کہ قومی معیشت کو سنگین ترین بحران اور قوم کو معاشی تباہ حالی کی دلدل سے نکالنے کے لیے جزوی اور وقتی اقدامات کی بجائے قومی معیشت کی مکمل تشکیل نو کا راستہ اختیار کرنا چاہیے اور بانی پاکستان کے ارشاد کے مطابق اسلامی تعلیمات کی روشنی میں انقلابی اور ہمہ گیر اقدامات کا آغاز کرنا چاہیے۔

اس سلسلہ میں دینی و معاشی ماہرین اور مفکرین کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ قوم کی راہنمائی کریں اور مکالمہ و مباحثہ کے ذریعے مسائل کے حقیقی اور باوقار حل کا راستہ نکالیں، بالخصوص بڑے دینی مدارس اور

یونیورسٹیوں کو یہ ذمہ داری قبول کرتے ہوئے اس وسیع تر مباحثہ و مکالمہ کا اہتمام کرنا چاہیے جو اس حوالے سے کسی حتمی نتیجہ تک پہنچنے کے لیے انتہائی ضروری ہے، خدا کرے ہم اس ذمہ داری سے صحیح طور پر عہدہ برآ ہو سکیں، آمین یارب العالمین۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ - اپریل ۲۰۲۳ء)

سرکاری ملازمین کی گردن اور آئی ایم ایف کی چھری

صدر مملکت نے ایک آرڈیننس کے ذریعے سرکاری محکموں کے بالاتر افسران کو یہ اختیار دے دیا ہے کہ وہ جس سرکاری ملازم کو بدعنوان سمجھیں، جسے منصبی ذمہ داریوں میں کوتاہی کرنے والا قرار دیں، اور جس کے بارے میں ان کی رائے قائم ہو جائے کہ محکمہ کو اس کی ضرورت نہیں رہی، وہ اسے ملازمت سے فارغ کر سکتے ہیں۔ اور اس برطرفی کے خلاف کسی کورٹ کے پاس دادرسی کے لیے جانے کا کوئی حق اب سرکاری ملازمین کے پاس اس آرڈیننس کی رو سے باقی نہیں رہا۔

ملک کے عام قانونی حلقوں میں اس آرڈیننس کو بنیادی شہری حقوق کے منافی قرار دیا جا رہا ہے اور اس کے خلاف مختلف اطراف سے احتجاج کا سلسلہ جاری ہے۔ عام تاثر یہ ہے کہ ورلڈ بینک، آئی ایم ایف اور دیگر عالمی اداروں کی طرف سے حکومت پر ایک عرصہ سے دباؤ تھا کہ وہ سرکاری محکموں کی ''ڈاؤن سائزنگ'' کر کے عملہ کی تعداد میں کمی کرے، فوج کی تعداد کو محدود کر کے دفاعی اخراجات کم کرے، اور اس طرح اپنے اخراجات کو گھٹائے تاکہ وہ بجٹ کو متوازن بنانے کے ساتھ ساتھ ملک کے ذمے بین الاقوامی قرضوں کی قسطیں بروقت ادا کر سکے۔ کہا جاتا ہے کہ آئی ایم ایف کا یہ سارا منصوبہ اپنے قرضوں کی قسطوں کی بروقت وصولی کو یقینی بنانے کے لیے ہے اور پاکستان میں قائم ہونے والی ہر حکومت اس قسم کی شرائط کو پورا کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔

اگر بات صرف اس حد تک ہو تو ساری خرابیوں کے باوجود اس حد تک یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ آئی ایم ایف سے ہم نے قرضے لے رکھے ہیں اور اسے معاہدوں کے مطابق قرضوں کی قسطیں واپس نہیں مل رہیں، اس لیے وہ اپنے قرضوں کی واپسی کو یقینی بنانے کے لیے حکومت پاکستان پر سرکاری اخراجات کو کم کرنے کے لیے دباؤ ڈال رہا ہے تاکہ حکومتِ پاکستان اس کے قرضوں کی قسطیں بروقت ادا کر سکے، لیکن بدقسمتی سے اصل صورتحال یہ نہیں ہے اور اس کے پس پردہ عوامل کی نوعیت قطعی طور پر اس ظاہری منظر سے مختلف ہے۔ کیونکہ اگر صرف اتنا قصہ ہوتا تو اخراجات کم کرنے کے لیے ملازمین کی تعداد میں کمی اور

سرکاری محکموں کے غریب اہلِ کاروں کو قربانی کا بکرا بنانے کے بجائے کوئی متبادل بلکہ اس سے بہتر تجاویز بھی پیش کی جاسکتی تھیں۔ مثلاً:

- سرکاری اخراجات میں کمی کا فطری طریقہ یہ ہے کہ اعلیٰ سطح پر پروٹوکول، پرسٹیج اور بالاتری کے اظہار، عشرت و تعیش اور نمود و نمائش پر جو بے بنیاد اور فضول اخراجات ہوتے ہیں، انہیں ختم کیا جائے۔
- اعلیٰ حلقوں کے معیارِ زندگی کو درمیانی سطح پر لانے کی کوشش کی جائے، سادگی اور قناعت کو عملاً اختیار کیا جائے۔
- معیارِ زندگی میں مسابقت کے رجحان کو کنٹرول کرنے کے لیے قانون سازی کی جائے،
- بیرونی ممالک سے غیر ضروری عشرت اور تعیش کے سامان کی درآمد پر پابندی لگائی جائے،
- اور خلافتِ راشدہ کے دور کو سامنے رکھتے ہوئے قوم کے مختلف طبقات کے درمیان پائے جانے والے معیارِ زندگی کے ہوشربا تفاوت کو ایک معقول سطح پر کم کرنے کی مہم چلائی جائے۔

مگر آئی ایم ایف اور دیگر عالمی ادارے اس قسم کی کوئی تجویز دینے کے بجائے غریب ملازمین کی گردنوں پر چھری پھیرنے کے منصوبے پیش کر رہے ہیں جس سے صورتحال میں کوئی بہتری نہیں ہوگی بلکہ بے روزگاری میں اضافہ ہوگا اور نچلی سطح پر معاشی بحران کم ہونے کے بجائے مزید بڑھتا چلا جائے گا۔ پھر ملازمین کی ایک بڑی تعداد کو فارغ کرنے سے جو رقم بچے گی، اسے قرضوں میں ادا کرنے کی کوئی گارنٹی موجود نہیں ہے، بلکہ انہی محکموں اور اداروں میں آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے کہنے پر بھاری مشاہروں اور مراعات پر مشیر رکھے جا رہے ہیں جو مجموعی طور پر ان ملازمین کی تنخواہوں سے زیادہ رقوم وصول کر لیں گے جنہیں اخراجات میں کمی کے بہانے برطرف کرنا مقصود ہے۔

اس لیے ہمارے نزدیک یہ سارا چکر اخراجات میں کمی اور قرضوں کی قسطوں کی بروقت ادائیگی کے لیے نہیں بلکہ ملک کے معاشی بحران میں اضافے اور سرکاری محکموں اور اداروں پر ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف کا قبضہ مزید مستحکم کرنے کے لیے چلایا جا رہا ہے، اور اس کو مکمل کرنے کے لیے وفاقی حکومت میں موجود بین الاقوامی مالیاتی اداروں کے ملازمین کی کھیپ اور ملک بھر میں بیرونی امداد سے چلنے والی این جی اوز کا ایک مربوط نیٹ ورک مسلسل مصروفِ عمل ہے۔ اس لیے ملک کے دینی اور سیاسی حلقوں کو اس کے خلاف مؤثر طور پر آواز اٹھانی چاہیے اور اس کا راستہ روکنے کے لیے مضبوط حکمت عملی وضع کرنے کی ضرورت ہے۔

جہاں تک اس صدارتی آرڈیننس کے ذریعے برطرف کیے جانے والے ملازمین سے اپیل کا حق چھیننے

کا تعلق ہے، وہ سراسر ناانصافی اور حق تلفی ہے اور ہمیں ایک قانون دان کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ یہ طرزِ عمل تو اللہ تعالیٰ نے شیطان کے بارے میں بھی اختیار نہیں کیا تھا جس نے کھلم کھلا حکم عدولی کرتے ہوئے حضرت آدمؑ کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا، بلکہ اسے راندۂ درگاہ قرار دینے سے قبل اس سے اس حکم عدولی کی وجہ دریافت کرتے ہوئے اسے صفائی کا موقع دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہم اس بات کا اضافہ کرنا چاہیں گے کہ قیامت کے دن جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں مجرم کی حیثیت سے پیش ہوں گے، ان کے جرم کے بارے میں مکمل اور یقینی علم رکھنے کے باوجود اللہ تعالیٰ صرف اپنے علم کی بنیاد پر ان میں سے کسی کے مقدمہ کا فیصلہ نہیں کریں گے، بلکہ باقاعدہ عدالتی کارروائی ہوگی، فرد جرم عائد ہوگی، وضاحت کا موقع دیا جائے گا، جرم سے انکار پر شہادتیں پیش کی جائیں گی، شہادتوں پر جرح ہوگی، ان کی صفائی اور توثیق کا مرحلہ آئے گا اور یہ سارا عدالتی پراسس مکمل ہونے کے بعد کسی مجرم کو دوزخ میں بھیجنے کا فیصلہ کیا جائے گا۔ حالانکہ خود اللہ تعالیٰ کو اپنے ذاتی علم اور اطمینان کے لیے اس سارے عمل کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی، وہ تو ہر بات کو یقینی طور پر اور سب سے بہتر جانتا ہے مگر اس سارے عدالتی عمل کو صرف اس لیے پورا کیا جائے گا تاکہ انصاف کے تقاضے پورے ہوں اور مجرم اور اس کے ساتھ دیگر سب لوگوں کو انصاف ہوتا ہوا نظر آئے۔

اس لیے صدر مملکت جناب محمد رفیق تارڑ اور چیف ایگزیکٹو جنرل پرویز مشرف سے گزارش ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کا یقینی اور حتمی علم کسی مقدمے کے فیصلے کی بنیاد نہیں بن سکتا تو کسی بالا افسر اور مجاز اتھارٹی کے ذاتی علم اور اطمینان کو کسی سرکاری ملازم کے خلاف فیصلہ کی بنیاد بنانا بھی درست نہیں ہے۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد - ۲۰ فروری ۲۰۰۱ء)

ملٹی نیشنل کمپنیوں کو لیز پر اراضی دینے کا معاملہ

روزنامہ خبریں لاہور ۲۰ جون ۲۰۰۲ء کی خبر کے مطابق وفاقی کابینہ نے صدر جنرل پرویز مشرف کی زیر صدارت اجلاس میں ملک میں کارپوریٹ فارمنگ کے لیے زرعی زمین غیر ملکی کمپنیوں کو لیز پر دینے کے پروگرام کی منظوری دے دی ہے۔ جس کے بعد غیر ملکی ادارے پاکستان میں کارپوریٹ فارمنگ کے لیے زرعی زمین لیز پر حاصل کر سکیں گے، اور انہیں ان فارموں کی تیاری اور چلانے کے لیے دیگر تمام ضروری سہولتیں بھی فراہم ہوں گی۔

کچھ عرصہ قبل یہ خبر آئی تھی کہ حکومت ملٹی نیشنل کمپنیوں کو پاکستان میں زرعی اراضی خریدنے کی اجازت

دینے پر غور کر رہی ہے۔ جس پر مختلف حلقوں کی طرف سے یہ اعتراض کیا گیا تھا کہ اس طرح ملٹی نیشنل کمپنیاں کارپوریٹ فارمنگ کے نام پر ملک کی بیشتر اراضی خرید لیں گی، اور کم و بیش وہی صورتحال پیدا ہو جائے گی جو فلسطین میں بیرون ملک سے آنے والے یہودیوں کو فلسطین کی زمین بلا روک ٹوک خریدنے کی اجازت مل جانے کے نتیجے میں سامنے آچکی ہے، اور جس فلسطین میں آج سے ایک صدی قبل تک کوئی یہودی خاندان آباد نہیں تھا، اس کا بیشتر حصہ آج یہودیوں کے قبضے میں ہے۔

خلافتِ عثمانیہ نے فلسطین میں یہودیوں کو زمین بیچنے پر پابندی عائد کر رکھی تھی، مگر خلافتِ عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد فلسطین پر برطانوی اقتدار قائم ہوا تو یہودیوں کو فلسطین کی زمین خریدنے کی اجازت دے دی گئی۔ جس پر اس وقت کے عالمِ اسلام کے بڑے بڑے علماء نے فتویٰ دیا کہ یہودیوں پر فلسطین کی زمین کو فروخت کرنا شرعاً جائز نہیں ہے کیونکہ وہ اس طرح فلسطین پر قابض ہونا چاہتے ہیں۔ ان میں سے ایک فتویٰ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی کتاب ''بوادر النوادر'' میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ مگر علماء کرام کے اس فتویٰ کی پروانہ کرتے ہوئے فلسطینیوں نے دگنی تگنی قیمت کے لالچ میں یہودیوں پر زمین بیچنے کا سلسلہ جاری رکھا اور اس کے نتیجے میں آج فلسطین پر یہودی قابض ہیں اور خود فلسطینی دربدر دھکے کھاتے پھر رہے ہیں۔

ہم اس بات کا شدید خطرہ محسوس کر رہے ہیں کہ پاکستان میں بھی اس قسم کا کھیل کھیلا جانے والا ہے، اور ملٹی نیشنل کمپنیاں جن کی اکثریت پر یہودیوں کا کنٹرول ہے، پاکستان میں بے بہا دولت خرچ کر کے کارپوریٹ فارمنگ اور زرعی ترقی کے نام پر پاکستان کی اکثر و بیشتر اراضی کا کنٹرول حاصل کر لیں گی، اور پاکستانی فلسطینیوں کی طرح اپنے ہی ملک میں خدانخواستہ بے وطن ہو کر رہ جائیں گے۔ اگرچہ وفاقی کابینہ نے ملٹی نیشنل کمپنیوں کو پاکستان میں زرعی اراضی خریدنے کا حق دینے کی بجائے لیز پر حاصل کرنے کی سہولت دینے کا فیصلہ کیا ہے، لیکن مذکورہ فیصلے کی رو سے لیز کی میعاد اور حاصل کی جانے والی زمین کی حد کا کوئی تعین نہیں کیا گیا، اور ان دونوں کے غیر محدود ہونے سے ملکیت اور لیز میں عملی طور پر کوئی فرق باقی نہیں رہے گا۔ اس لیے ہم حکومت کے سنجیدہ عناصر اور ملک بھر کے محبِ وطن حلقوں کو اس خطرناک فیصلہ کی سنگینی کی طرف توجہ دلانا اپنا فرض سمجھتے ہیں، اور ہماری گزارش ہے کہ اس کا فوری طور پر نوٹس لے کر پاکستان میں فلسطین جیسی صورتحال پیدا ہو جانے کے خطرات کی بروقت روک تھام کی جائے۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔ جولائی ۲۰۰۲ء)

قومی معیشت کی بحالی کے تقاضے

قومی حلقوں میں معیشت کی زبوں حالی کا موضوع ہر سطح پر زیر بحث ہے اور اس کے مختلف پہلوؤں پر اظہارِ خیال کا سلسلہ جاری ہے۔ اس بات پر کم و بیش سبھی حلقے متفق ہیں کہ بیرونی قرضے، سودی نظام اور عالمی مالیاتی اداروں بالخصوص آئی ایم ایف کی مسلسل مداخلت اس صورتحال کے بنیادی اسباب ہیں جس کا سدباب کیے بغیر قومی معیشت کی بحالی کا کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا۔

ملی مجلس شرعی پاکستان کا موقف

اس سلسلہ میں دینی حلقوں کا موقف مختلف مکاتبِ فکر کے سرکردہ علماء کرام کے علمی و فکری فورم ''ملی مجلس شرعی پاکستان'' نے ۲۰ مئی ۲۰۲۳ء کو منصورہ لاہور میں راقم الحروف کی زیر صدارت منعقدہ اپنے اجلاس میں درج ذیل صورت میں واضح کیا ہے۔

''۱۔ سٹیٹ بینک آف پاکستان کو پارلیمنٹ کے وضع کردہ قانون

SBP Act, 1956(as amended up to 28-01,2022)

کی رو سے خود مختار ادارہ بنا دیا گیا ہے۔ وفاقی شرعی عدالت نے سود کے خلاف حال ہی میں جو فیصلہ دیا ہے، اس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ حکومت اس سلسلے میں ضروری قانون سازی کرے اور سود سے متعلق قوانین کا خاتمہ کرے۔ اس سلسلے میں حکومت کی طرف سے ایک عذر یہ پیش کیا جاتا ہے کہ اسٹیٹ بینک ایک خود مختار ادارہ ہے اور حکومت اسے کوئی حکم نہیں دے سکتی۔ نیز یہ کہ اسٹیٹ بینک کی خود مختاری کا یہ فیصلہ درحقیقت آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک کے دباؤ پر کیا گیا تھا۔ مقصد اس سے یہ تھا کہ پاکستان کا مرکزی بینک براہ راست ان کے کنٹرول میں چلا جائے اور اس پر حکومت پاکستان کا کنٹرول نہ رہے۔ اس لیے ملکی سلامتی اور خود مختاری کے لیے بھی ضروری ہے کہ مذکورہ قانون کو کالعدم قرار دیا جائے۔ اسٹیٹ بینک کی خود مختاری کا یہ غلط فیصلہ چونکہ تحریک انصاف کی حکومت نے کیا تھا لہٰذا موجودہ حکومت اس قانون کو ختم کرنے کا احسن اقدام کر کے اس کا کریڈٹ بھی لے سکتی ہے۔

۲۔ وفاقی شرعی عدالت اور اس کے طریقہ کار کے بارے میں آئین پاکستان کی دفعہ 203D(2)(B) کہتی ہے کہ اگر وفاقی شرعی عدالت کے کسی فیصلے کے خلاف اپیل کر دی

جائے تو اس پر عمل نہیں ہوگا جب تک سپریم کورٹ اپیلیٹ بینچ اس اپیل کا فیصلہ نہ کر دے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جونہی وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کے خلاف اپیل کی جائے تو اپیل کنندگان کو فوراً اسٹے (stay) مل جاتا ہے۔ مقصد اس بات کا یہ ہے کہ وفاقی شرعی عدالت نے سود کے خلاف جو فیصلہ دیا تھا، چونکہ اس کے خلاف اپیلیں آگئی ہیں لہٰذا اب اس پر عملدرآمد رک گیا ہے۔ ظاہر ہے یہ بے انصافی کی بات ہے اور اس بے انصافی کا خاتمہ ہونا ضروری ہے۔ اچھنبے کی بات یہ ہے کہ یہ خصوصی معاملہ صرف وفاقی شرعی عدالت کے فیصلوں کے بارے میں ہے جب کہ اس کا اطلاق ضلعی عدالتوں اور ہائی کورٹس کے فیصلوں پر نہیں ہوتا۔"

طالب حسین ایڈووکیٹ کا آئی ایم ایف کے نام مکتوب

جب کہ قانونی حلقوں کا نقطۂ نظر ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن کورٹ بہاولنگر کے معزز وکیل جناب طالب حسین میکن ایڈووکیٹ کے اس مکتوب میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے جو انہوں نے حال ہی میں آئی ایم ایف کے ڈائریکٹر کے ارسال کیا ہے، موصوف لکھتے ہیں کہ

"ہم معزز اور شریف پاکستانی شہری ہیں، آپ سے آج تک ہمارے خاندان کے کسی بھی فرد نے قرض حاصل نہ کیا ہے اور نہ ہی اس کی نسبت کوئی درخواست گزاری ہے۔ مورخہ 08-06-2023 کو بذریعہ ٹی وی پروگرام علم میں آیا کہ پاکستان کی عوام کے خلاف آپ کا بہت زیادہ قرضہ واجب الادا ہے جس کی وجہ سے مملکت کی معیشت خطرے میں ہے اور عوام غربت کی لکیر کے نیچے جا رہے ہیں اور مزید قرضہ مانگا جا رہا ہے۔ درحقیقت ہم نے آج تک کسی بھی قرض کے لیے کوئی تحریری درخواست یا زبانی التجا نہ کی ہے اور نہ آئندہ ایسا کرنے کی نیت ہے۔ اگر کسی شخص نے اپنی ذاتی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے کوئی بھی غیر قانونی قدم اٹھایا ہے وہ خود ذمہ دار ہے، اور جو بھی بینک کے ساتھ کسی قسم کا معاہدہ جتنی بار بھی ہوا ہے ہم اس کے ذمہ دار نہ ہیں۔ بلکہ جس نے معاہدہ کی درخواست دی یا تکمیل معاہدہ کیا اور رقم وصول کی تو اس نے ذاتیات کے لیے کیا ہے، آج تک ہم نے اس سے استفادہ حاصل نہ کیا ہے اور نہ ہی ہم اس کے ذمہ دار ہیں۔ ہمارے آباؤ اجداد قیامِ پاکستان اور اس سے قبل سال 1876ء سے مملکتِ پاکستان میں اسی علاقہ

میں رہائش پذیر ہیں اور ہمارے آباؤ اجداد محنت مزدوری کر کے گزر بسر کرتے چلے آرہے ہیں اور آج تک کسی بینک سے قرضہ وغیرہ نہ لیا ہے بلکہ اپنے مال مویشی پال کر اور کھیتی باڑی کر کے گزر بسر کرتے چلے آرہے ہیں۔ ہم مسلمان ہیں اور اللہ تعالیٰ کو جان دینی ہے اور کسی قسم کا قرض ناقابلِ معافی جرم ہے۔ ہم اپنے اور اپنے ورثاء کے خلاف یہ قرض کا جرم برداشت نہیں کر سکتے کیونکہ جو کوئی مسلمان اپنے خلاف قرض کا لفظ لے کر مرتا ہے تو اس کی بخشیش نہ ہے۔

لہٰذا بذریعہ نوٹس ہٰذا آپ کو مطلع کیا جاتا ہے کہ ہم آپ کے کسی قسم کے قرض کے جواب دہ نہ ہیں، جس نے قرض حاصل کیا ہے اسی سے وصول کیا جائے اور تفصیلِ قرضہ اندر 15 یوم فراہم کی جائے کہ کس کس پاکستانی شہری نے کتنا کتنا قرض حاصل کیا ہے اور اس کے اخراجات کی تفصیل فراہم کی جائے اور پاکستانی شہری کے خلاف قرض کا لفظ ختم کیا جائے۔"

ہمارے نزدیک اصل ضرورت یہ ہے کہ قومی معیشت کی بحالی اور خود مختاری کے لیے عوامی شعور کو بیدار کرنے اور رائے عامہ کو اس دھاندلی کے خلاف منظم کرنے کے لیے منظم جدوجہد کا اہتمام کیا جائے تاکہ ہم ایک قوی تحریک کی صورت میں قومی خود مختاری اور معیشت کی بحالی کے لیے کوئی مؤثر کردار ادا کر سکیں، اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق سے نوازیں، آمین۔

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد-۱۱ اگست ۲۰۲۳ء)

قومی معیشت کی تشکیلِ نو، وقت کی اہم ضرورت

روزنامہ اسلام لاہور ۱۶ ستمبر ۲۰۲۳ء میں شائع شدہ ایک سروے رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ملک کے موجودہ معاشی بحران میں ۹۵ فیصد پاکستانی بے روزگاری کے خوف میں مبتلا ہیں اور صرف ۵ فیصد کو روزگار کا تحفظ میسر ہے۔ ۶۳ فیصد نے نوکری ختم ہونے کے خدشہ کا اظہار کیا ہے، اور ۹۶ فیصد ملک کے مستقبل کے حوالے سے پریشان ہیں۔

یہ ملک کی موجودہ معاشی صورتحال کی ایک ہلکی سی جھلک ہے جس سے قوم دوچار ہے اور اس کی سنگینی میں مسلسل اضافہ دکھائی دے رہا ہے۔ یہ سب کچھ ہماری ان قومی پالیسیوں کا منطقی نتیجہ ہے جو گزشتہ پون صدی سے جاری ہیں، جن کی بنیاد بیرونی اداروں کی مشاورت بلکہ بڑھتی ہوئی مداخلت پر ہے، اور ہم اپنے

مسائل کا حل بھی انہی کے زیر سایہ تلاش کرنے میں مصروف ہیں۔

قیامِ پاکستان کا مقصد

قرآن کریم میں اللہ رب العزت نے واضح طور پر فرمایا ہے "من اعرض عن ذکری فان له معیشة ضنکا" (طہ ۱۲۴) جس نے میرے ذکر اور نصیحت سے اعراض کیا اس کا نتیجہ معیشت کی تنگی ہوگا۔ ہم نے قیامِ پاکستان کے وقت "لا الٰہ الا اللہ" کا نعرہ لگایا تھا جسے عملی اور قومی زندگی میں بھلا دینے کا ہم نے فطری نتیجہ بھگتا ہے۔ اور ارشادِ ربانی کی طرف رجوع کا اب بھی قومی پالیسیوں میں کوئی رجحان دکھائی نہیں دیتا۔ بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح مرحوم نے اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے افتتاح کے موقع پر ملک کی معیشت کی بنیاد اسلامی تعلیمات کو قرار دیا تھا مگر ہم نے سرے سے اپنا اسٹیٹ بینک ہی غیر ملکی اداروں اور سودی نظام کے اجارہ داروں کی نگرانی میں دے دیا ہے۔ جبکہ قرآن وسنت کی تعلیمات کے ساتھ ساتھ آج کے زمینی حقائق اور ماہرانہ تجزیے بھی صاف کہہ رہے ہیں کہ ہماری معاشی بدحالی کا سب سے بڑا سبب بیرونی قرضے اور سودی نظام ہیں جن سے نجات حاصل کیے بغیر معاشی صورتحال میں بہتری کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس صورتحال میں ہمیں وقتی اور عارضی اقدامات کی بجائے پورے معاشی ڈھانچے اور قومی پالیسیوں کا از سرنو جائزہ لے کر ان کی تشکیلِ نو کرنا ہوگی۔

اشعری قبیلہ کی روایت

بخاری شریف کی ایک روایت میں ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اشعری قبیلہ کا یہ معمول جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں آیا کہ وہ جب معاشی ناہمواری کا شکار ہوتے تو اپنے اثاثے جمع کر کے انہیں آپس میں برابری کی بنیاد پر تقسیم کر لیتے تھے۔ روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشعری قبیلہ کے اس طریق کار کی تحسین فرمائی اور اسے بہتر قرار دیا۔ ہمیں بھی اپنے ماحول کے مطابق اس پر غور کرنا چاہیے اور ایڈہاک ازم کے دائرہ سے نکل کر قومی معیشت کے پورے ڈھانچے کا از سرنو جائزہ لے کر خلافت راشدہ کے اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے مجموعی معاشی نظامِ معیشت کی تشکیلِ نو کی صورت نکالنی چاہیے۔ خدا کرے کہ ہمارے پالیسی ساز اداروں اور حکمرانوں کو یہ بات سمجھ میں آجائے، آمین یارب العالمین۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔ اکتوبر ۲۰۲۳ء)

سرمایہ دارانہ و جاگیر دارانہ نظام کا تسلسل

روزنامہ جنگ لندن ۲۶ ستمبر ۲۰۰۱ء کی ایک خبر کے مطابق اسلامی نظریاتی کونسل نے سرمایہ دارانہ و جاگیر دارانہ نظام کو ظالمانہ نظام قرار دیتے ہوئے حکومتِ پاکستان کو مشورہ دیا ہے کہ اس نظام کو تبدیل کیا جائے۔ کونسل کی سفارش میں کہا گیا ہے کہ یہ نظام تمام تر خرابی کی جڑ ہے، اس لیے اس نظام کو ختم کر کے اسلام کے اصولوں پر مبنی معاشرے کی تشکیل کے لیے مؤثر نظام نافذ کرنا چاہیے تاکہ سب سے انصاف ہو اور کوئی کسی کا حق نہ چھین سکے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارا موجودہ معاشی نظام سرمایہ دارانہ و جاگیر دارانہ ہے جس کی بنیاد چند مخصوص طبقات کو سہولتیں فراہم کرنے، ان کے مفادات کے تحفظ، اور غریب عوام کے استحصال پر ہے۔ اور اسی سودی اور استحصالی نظام کے بطن سے بیشتر معاشرتی جرائم اور خرابیوں نے جنم لیا ہے۔ یہ معاشی سسٹم اس نوآبادیاتی نظام کا تسلسل ہے جو مغربی حکمرانوں نے اپنے قبضے کے دور میں ہم پر مسلط کیا تھا اور جسے آزادی کے اعلان اور قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ختم ہو جانا چاہیے تھا۔

بانیٔ پاکستان کی ماہرینِ معیشت کو ہدایت

حتیٰ کہ خود بانیٔ پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح مرحوم نے بھی قیامِ پاکستان کے بعد اسٹیٹ بینک آف پاکستان کے افتتاح کے موقع پر ۱۵ جولائی ۱۹۴۸ء کو اپنے خطاب میں پاکستانی ماہرینِ معیشت کو ہدایت کی تھی کہ وہ مغرب کے معاشی نظام کی پیروی کرنے کی بجائے اسلامی اصولوں کی بنیاد پر نیا معاشی نظام تشکیل دیں۔ اس موقع پر انہوں نے واضح طور پر کہا تھا کہ مغرب کے معاشی نظام نے انسانیت کے لیے لاینحل مسائل پیدا کر دیے ہیں اور اکثر لوگوں کی رائے یہ ہے کہ مغرب کو اس تباہی سے کوئی معجزہ ہی بچا سکتا ہے۔ مغربی نظام افرادِ انسانی کے مابین انصاف کرنے اور بین الاقوامی میدان میں آویزش اور چپقلش دور کرنے میں ناکام رہا ہے، بلکہ گزشتہ نصف صدی میں ہونے والی دو عظیم جنگوں کی ذمہ داری سراسر مغرب پر عائد ہوتی ہے۔ مغربی دنیا صنعتی قابلیت اور مشینوں کی دولت کے زبردست فوائد رکھنے کے باوجود انسانی تاریخ کے بدترین باطنی بحران میں مبتلا ہے۔ اگر ہم نے مغرب کا معاشی نظریہ اور نظام اختیار کیا تو عوام کی پرسکون خوشحالی کو حاصل کرنے کے نصب العین میں ہمیں کوئی مدد نہیں ملے گی۔

مغربی نظامِ معیشت کا تسلسل

لیکن اس کے باوجود ہمارے معاشی ماہرین اور ریاستی اداروں کا معاشی قبلہ مغرب ہی چلا آرہا ہے اور

قیامِ پاکستان کے بعد اس ظالمانہ اور استحصالی نظام سے چھٹکارا حاصل کرنے کی بجائے ہم اس کے جال میں مزید جکڑتے چلے جا رہے ہیں۔ ورلڈ بینک، آئی ایم ایف اور دیگر عالمی مالیاتی اداروں کا شکنجہ ہمارے گرد دن بدن سخت ہوتا جا رہا ہے اور اس جال سے نکلنے کی کوئی کوشش کامیاب ہوتی دکھائی نہیں دے رہی۔ چند سال قبل وفاقی شرعی عدالت اور اس کے بعد سپریم کورٹ آف پاکستان نے سود کو غیر شرعی قرار دیتے ہوئے ملک میں رائج تمام سودی قوانین کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا اور حکومت کو ان کے متبادل اسلامی قوانین نافذ کرنے کی ہدایت کی تو کسی درجہ میں یہ امید قائم ہوگئی تھی کہ اس استحصالی نظام کی گرفت ڈھیلی پڑنا شروع ہوجائے گی۔ مگر ریاستی اداروں نے جس افسوسناک طریقہ سے اس عدالتی فیصلوں پر عملدرآمد کا راستہ روکا وہ ہماری قومی تاریخ کا ایک شرمناک باب ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ان حالات میں اسلامی نظریاتی کونسل کی یہ سفارش نہ صرف قومی سطح پر اس اہم اور بنیادی مسئلہ پر یاددہانی کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ اس نے ملک کے دینی حلقوں کی طرف سے اس سلسلہ میں فرض کفایہ ادا کیا ہے۔ خدا کرے کہ ہمارے حکمران اور ریاستی ادارے اس یاددہانی پر جلد توجہ دے کر قوم کو اس عظیم بحران بلکہ عذابِ خداوندی سے نجات دلا سکیں، آمین۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔ نومبر ۲۰۰۱ء)

قومی معیشت کی ''اوور ہالنگ'' کی ضرورت

روزنامہ اوصاف لاہور ۲۹ دسمبر ۲۰۲۳ء کی رپورٹ کے مطابق عالمی بینک کے علاقائی ڈائریکٹر ناجی بن حسائن نے اپنے ایک حالیہ مضمون میں پاکستان کی معاشی صورتحال پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ

''پاکستان کا معاشی ماڈل ناکارہ ہوچکا ہے، پاکستان کو اپنی معیشت کی اوور ہالنگ کرنے کی ضرورت ہے، معاشی ترقی کے فوائد اشرافیہ تک محدود ہیں، پاکستان اپنے ساتھی ملکوں سے پیچھے رہ گیا ہے، ماضی میں غربت میں خاطر خواہ کمی ہوئی تھی مگر غربت دوبارہ سر اٹھا رہی ہے، یہ سوچ پروان چڑھ رہی ہے کہ پالیسی بدلنا ضروری ہے۔''

محترم ناجی بن حسائن کی پوری رپورٹ لائق توجہ ہے اور ان کے تجزیہ و تبصرہ سے مجموعی طور پر ملک کا ہر باشعور شہری اتفاق کرے گا، مگر ان میں سے کوئی بات نئی نہیں ہے، بلکہ ہر بات ایسی ہے جو مختلف فورموں سے بار بار کہی جا چکی ہے، البتہ یہ تبصرہ چونکہ عالمی بینک کے علاقائی ڈائریکٹر کی طرف سے سامنے آیا ہے اس لیے توقع کی جا سکتی ہے کہ ہر معاملہ میں بین الاقوامی اداروں بالخصوص مغربی ماہرین پر بھروسہ

کرنے والے طبقات اور ادارے بھی اس پر سنجیدہ توجہ دیں گے، جس سے ملک کی معاشی بہتری کا راستہ نکالنے کی کوئی صورت شاید نکل آئے۔

جہاں تک قومی معیشت کے حوالے سے بنیادی پالیسی میں تبدیلی اور اس کی اوورہالنگ کی بات ہے یہ آواز سب سے پہلے بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح مرحوم نے اسٹیٹ بینک آف پاکستان کا افتتاح کرتے ہوئے اٹھائی تھی کہ ملکی معیشت کو اب معیشت کے مغربی اصولوں کی بجائے اسلامی تعلیمات و قوانین کے مطابق نئے سرے سے استوار کرنے کی ضرورت ہے، اور اس کے لیے انہوں نے ماہرینِ معیشت کو ہدایت کی تھی کہ وہ اس کے لیے محنت کریں۔ مگر ان کی وفات کے بعد سے اب تک عملی طور پر کوئی قدم ایسا سامنے نہیں آیا جسے قومی معیشت کی پالیسیوں میں بنیادی تبدیلی قرار دیا جا سکے۔ بلکہ اس کے برعکس اس حوالے سے کی جانے والی ہر عملی پیشرفت قومی معاشی معاملات اور اسلامی تعلیمات کے درمیان فاصلے میں اضافے کا باعث بنی ہے جس کا نتیجہ خود عالمی بینک کے تبصرہ کے مطابق یہ ہے کہ پاکستان کا معاشی ڈھانچہ ناکارہ ہو چکا ہے اور اس کی اوورہالنگ کی ضرورت ہے۔

پھر یہ ''ناکارہ پن'' صرف قومی معیشت تک محدود نہیں ہے بلکہ عدلیہ، انتظامیہ اور مقننہ سمیت ملک کے ہر قومی اور ریاستی ادارے کی صورتحال یہی ہے، اور کسی بھی ادارے کی معروضی صورتحال کو خود اس کے اپنے ماہرین کی تجزیاتی رپورٹوں پر نظر ڈال کر دیکھا جائے تو سب جگہ ماحول ایک ہی طرح کا دکھائی دے گا اور ہر طرف سے ''ڈھانچہ ناکارہ ہو گیا ہے، اوورہالنگ کی ضرورت ہے'' کی صدا بلند ہوتی سنائی دے گی۔

ہم سمجھتے ہیں کہ پاکستان قائم ہونے کے بعد سے قومی اداروں اور پالیسیوں کو ماضی کے نوآبادیاتی ماحول میں جکڑے رکھنے کے مسلسل طرزِ عمل نے ہمیں اس مقام پر لا کھڑا کیا ہے جسے تبدیل کیے بغیر اصلاحِ احوال کی کوئی صورت ممکن دکھائی نہیں دیتی۔ اس لیے آج بھی سب سے بڑی ضرورت معیشت سمیت تمام قومی اداروں کو اسلامی تعلیمات کے مطابق از سرِ نو ڈھالنے کی ہے، خدا کرے کہ ہم اس سمت کوئی پیشرفت کر سکیں، آمین یارب العالمین۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔ جنوری ۲۰۲۴ء)

''توڑو یہ کشکولِ گدائی، اترو قرض کی سولی سے''

ایک مجلس میں مہنگائی پر گفتگو چل پڑی، ایک صاحب جو حال ہی میں پاکستان میں ایک ماہ گزار کر واپس

آئے ہیں کانوں کو ہاتھ لگا رہے تھے کہ اتنی مہنگائی میں پاکستان کے عام آدمی پر کیا گزرتی ہوگی؟ میں نے عرض کیا کہ مہنگائی بین الاقوامی مسئلہ ہے اس سے جان تو نہیں چھڑائی جا سکتی۔ اشیائے صرف کی قیمتیں بین الاقوامی مارکیٹ کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ نتھی ہیں اور ہم اکیلے اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتے۔ لیکن دوسری طرف مسئلہ یہ ہے کہ پاکستان میں عام آدمی کی قوت خرید دم توڑتی جا رہی ہے اور غریب عوام کے لیے جسم اور جان کا رشتہ قائم رکھنا مشکل تر ہو گیا ہے۔

میرے نزدیک اس مسئلہ کا حل ملک کی لگژری اور اَپر کلاس کے پاس ہے، وہ اگر قربانی دے تو غریب آدمی کو زندگی کی بنیادی ضروریات مہیا کرنے کی کوئی صورت نکل سکتی ہے۔ موجودہ معاشی اور تجارتی ماحول میں عام آدمی کو اشیائے ضرورت کی خریداری کے لیے وسیع پیمانے پر سبسڈی دینے کی ضرورت ہے، اس کے سوا اس مسئلہ کا کوئی حل نظر نہیں آتا۔ لیکن یہ سبسڈی اس قدر وسیع پیمانے پر اس کے بغیر نہیں دی جا سکتی کہ لگژری کلاس اور اَپر کلاس اپنے معیارِ زندگی میں تبدیلی لائے اور اپنے ہی ملک کے غریب عوام کو سہولت فراہم کرنے کے لیے تعیش اور لگژری کی قربانی دے۔ اس رضا کارانہ قربانی کا بھی ایک وقت ہے کیونکہ اگر غربت اور بھوک سے بے بس ہو جانے والے لوگوں نے اپنی ضروریات از خود چھیننا شروع کر دیں تو پھر منظر یکسر تبدیل ہو جائے گا۔

اس مرحلہ پر مجھے حبیب جالب مرحوم یاد آ گئے اور میں نے دوستوں سے عرض کیا کہ میرا موقف وہی ہے جو حبیب جالب مرحوم نے ان الفاظ میں پیش کیا تھا:

جو پہنو ہم کو پہناؤ پھر اسلام کی بات کرو
گھر گھر جیون دیپ جلاؤ پھر اسلام کی بات کرو
کوٹھی بیس کنالوں کی اور نیچے ایک پجارو بھی
ہم کو سائیکل ہی دلواؤ پھر اسلام کی بات کرو
دیکھو کچھ تو رہ بھی گیا ہے اپنے دیس خزانے میں
کھاؤ لیکن تھوڑا کھاؤ پھر اسلام کی بات کرو
اللہ ہو کا ورد بجا ہے نبی کے گن بھی ٹھیک مگر
کچھ تو ان کا رنگ دکھاؤ پھر اسلام کی بات کرو
توڑو یہ کشکولِ گدائی اترو قرض کی سولی سے
امریکہ سے جان چھڑاؤ پھر اسلام کی بات کرو

ظاہر ہے کہ اشیائے صرف کی قیمتوں میں کمی تو نہیں لائی جا سکتی، البتہ عام آدمی کی قوت خرید میں اضافہ کر

کے اس مسئلہ کی شدت کو کم کیا جا سکتا ہے۔ جمعیۃ علماء اسلام پاکستان نے ۱۹۷۰ء کے انتخابی منشور میں مولانا عبداللہ درخواستیؒ، مولانا مفتی محمودؒ اور مولانا غلام غوث ہزارویؒ کی زیر قیادت اس مسئلہ کا یہ حل پیش کیا تھا کہ تنخواہ دار طبقے کی تنخواہوں میں ہوشربا تفاوت کو کم کر کے فوری طور پر ایک اور دس کے تناسب پر لایا جائے، پھر اسے بتدریج مزید کم کرتے ہوئے ایک اور پانچ کے تناسب پر فکس کر دیا جائے۔

(روزنامہ پاکستان، لاہور—۶ ستمبر ۲۰۰۸ء)

خواتین کی ملازمت اور فطرت کے تقاضے

ایک بحث دارالعلوم دیوبند کی طرف منسوب ایک فتویٰ کے حوالے سے بھارتی اخبارات میں زوروں پر ہے جس کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے مفتی صاحبان نے فتویٰ صادر کیا ہے کہ عورت ملازمت یا کاروبار نہیں کر سکتی اور اس کی کمائی ہوئی رقم حرام ہے۔ ہم نے جب اس فتویٰ کی بات سنی تو ذہن نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس لیے کہ ایک عام مسلمان بھی جانتا ہے کہ ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ تجارت کیا کرتی تھیں اور جناب رسول اکرمؐ کی ازواجِ مطہرات میں حضرت ام سلمہؓ، حضرت ام حبیبہؓ اور حضرت زینبؓ اپنے گھر میں کام کرتی تھیں اور مختلف چیزیں تیار کر کے بازار میں فروخت کیا کرتی تھیں۔ دیگر حضرات صحابہ کرامؓ کی ازواجِ مطہرات بھی تجارت اور حرفت کے کام کرتی تھیں اور کمائی کیا کرتی تھیں۔ اس لیے یہ بات تو کوئی عام سا مولوی بھی نہیں کہہ سکتا چہ جائیکہ دارالعلوم دیوبند جیسے ذمہ دار ادارے کے مفتی صاحبان یہ فتویٰ دیں۔

آج ایک ای میل کے ذریعے بھارت کے بزرگ عالمِ دین حضرت مولانا عتیق الرحمان سنبھلی کا ایک وضاحتی بیان موصول ہوا تو معلوم ہوا کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ یہ بیان قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے جس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بات کا بتنگڑ کیسے بنایا جاتا ہے۔

> ”جماعتِ دیوبند کے بزرگ عالم اور معروف دانشور و مصنف مولانا عتیق الرحمان سنبھلی (مقیم لندن) نے دارالعلوم دیوبند کے فتوؤں کے خلاف میڈیا کی حالیہ مہم کو نہایت غیر ذمہ دارانہ بلکہ معاندانہ قرار دیا ہے۔ مولانا نے اپنے ایک اخباری بیان میں، جو آج دہلی سے جاری کیا گیا، کہا کہ دارالعلوم صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے مسلمانوں کا ایک اہم دینی و علمی مرکز ہے۔ میڈیا کے کچھ حلقے اور مسلم دشمن گروہ اس کو مستقل ایک بدنام کن مہم کا نشانہ بنائے ہوئے ہیں۔ مولانا نے دارالعلوم کے دفتر اہتمام سے فرمائش کر کے

متعلقہ فتوؤں کی کاپی منگوا کر خود دیکھی اور صاف محسوس کیا کہ میڈیا نے توڑ موڑ کر بات کو پیش کیا ہے۔

مولانا کا کہنا ہے کہ ملک اور بیرون ملک کے بعض اخبارات اور ٹی وی چینلز نے بالکل جھوٹ یہ بات نشر کی کہ دارالعلوم کی طرف سے عورت کی کمائی کو حرام کہا گیا ہے۔ اس کے برعکس دارالعلوم کے فتوؤں میں صراحت ہے کہ "کمائی پر حرام ہونے کا حکم نہیں"۔ بعض فتوؤں میں یہ بھی صراحت ہے کہ "عورت کے لیے کمانا ممنوع نہیں"۔ ہاں بجا طور پر شرعی لباس اور حیا کے تقاضوں کی پابندی کی شرط ہے۔

مولانا کا کہنا تھا کہ چونکہ اس زمانے میں دفتروں اور بازاروں کا ماحول نہایت بے حیائی کا ہے اور مغربی تہذیب و تعلیم نے ذہن ناپاک بنا دیے ہیں، دفتروں میں صنف نازک کے ساتھ زیادتیوں کے جس طرح کے واقعات عام ہیں اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے دارالعلوم کے فتوؤں میں خواتین کو بلا ضرورت سروس کرنے سے منع کیا گیا ہے اور یہ نہایت معقول بات ہے۔ مولانا نے بڑا افسوس ظاہر کیا کہ بعض مسلمان بھی حقیقت جانے بغیر میڈیا کے خلافِ حقیقت پروپیگنڈا سے متاثر ہو جاتے ہیں اور یہ بات بھول جاتے ہیں کہ دارالعلوم دیوبند ہمارے عقیدے و تہذیب کی آخری دفاعی لائن ہے۔

مولانا نے مزید کہا کہ نہایت حیرت کی بات یہ بھی ہے کہ ہمارے بعض اردو کے اخبارات بھی بسا اوقات اس مہم کا حصہ بن جاتے ہیں حالانکہ ان سے تو بجا طور پر یہ توقع ہوتی ہے کہ وہ دارالعلوم سے رابطہ کر کے اصل حقیقت جان لیں اور فتوؤں کو ان کے صحیح تناظر میں سمجھنے اور پیش کرنے کی کوشش کریں۔

مولانا نے پوری دنیا کے مسلمانوں سے اپیل کی کہ یہ وقت دارالعلوم کی تائید و حمایت اور مغربی تہذیب کے مقابلے میں اس کے راہنما کردار کو تقویت پہنچانے کا ہے، نہ کہ اسلام دشمن طاقتوں کے سامنے سپر اندازی کرنے کا۔"

اسلام نے عورت اور مرد کے میل جول کی حدود متعیّن کی ہیں اور پردے و حجاب کے ضابطے نافذ کیے ہیں جن کی پابندی بہر حال ضروری ہے۔ ان حدود کے دائرے میں رہتے ہوئے عورت ملازمت بھی کر سکتی ہے، کاروبار بھی کر سکتی ہے، اور جائز کمائی کے دیگر ذرائع بھی اختیار کر سکتی ہے جس کی شریعت میں کوئی ممانعت نہیں ہے۔ لیکن اگر کوئی طبقہ ملازمت اور کاروبار وغیرہ کے جواز کے نام پر مرد اور عورت

کے درمیان اس فطری فرق کی نفی کرنا چاہتا ہے جس کی بنیاد پر اسلام نے مردوں اور عورتوں کے لیے قوانین میں فرق رکھا ہے، تو فطرتِ سلیمہ کے طے کردہ اس فرق کو ختم کرنے کی اجازت کسی صورت میں نہیں دی جاسکتی اور نہ ہی عملاً اسے ختم کیا جاسکتا ہے۔

(روزنامہ پاکستان، لاہور - ۲۳ مئی ۲۰۱۰ء)

پاکستان میں کرپشن کی حکمرانی

ہفت روزہ "پاکستان پوسٹ" (ہیوسٹن، امریکہ) نے ۱۴ جولائی ۲۰۱۱ء کے شمارے میں یہ خبر شائع کی ہے کہ عالمی ادارہ "ٹرانسپرنسی انٹرنیشنل" نے ایک حالیہ رپورٹ میں بتایا ہے کہ پاکستان میں گزشتہ تین سال کے دوران کرپشن میں چار سو گنا اضافہ ہوا ہے اور اس سے قومی خزانہ کو تین ہزار ارب روپے کے نقصان کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ رپورٹ کے مطابق پاکستان کے حکومتی اداروں میں کرپشن اپنے عروج پر ہے اور وزراء اور اعلیٰ سیاسی شخصیات کی کرپشن کی کہانیاں زبان زدِ عوام ہیں۔

کرپشن ہمیشہ سے پاکستان کا مسئلہ رہا ہے اور ملک و قوم کو درپیش بیشتر مسائل کا بنیادی سبب یہی کرپشن ہے۔ جس کے بارے میں سپریم کورٹ آف پاکستان کے چیف جسٹس محترم جناب جسٹس افتخار محمد چوہدری نے چند ماہ قبل ایک کیس کی سماعت کے دوران کہا تھا کہ ہمارا سب سے بڑا قومی مسئلہ "کرپشن" ہے اور اس کے ساتھ انہوں نے کہا تھا کہ کرپشن سے نجات اور گڈ گورننس کے قیام کے لیے ہمیں حضرت عمر فاروقؓ کی پیروی کرنا ہوگی، اس موقع پر چیف جسٹس نے یہ بھی کہا تھا کہ فوج اور سول بیوروکریسی سمیت قومی زندگی کا کوئی بھی شعبہ کرپشن سے پاک نہیں ہے۔

قومی خود مختاری کو درپیش چیلنج، ملکی سرحدات کی پامالی، بڑھتی ہوئی مہنگائی اور خوفناک لوڈشیڈنگ سمیت کسی بھی قومی مسئلہ اور بحران کا تجزیہ کریں تو اس کے پیچھے چند افراد کی کرپشن، مفاد پرستی اور بدعنوانی کارفرما دکھائی دے گی۔ اور اس طرح نیچے سے اوپر تک ہر سطح پر ہمیں اپنے ملک میں کرپشن ہی کی حکمرانی اور بالادستی کا سامنا ہے جو "الناس علی دین ملوکہم" کے مصداق گزشتہ تین برسوں میں چار سو گنا تک بڑھ گئی ہے اور یہ دیمک قومی معیشت کے ڈھانچے کو مسلسل چاٹ رہی ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ اس عذاب اور بحران میں نجات کا واحد راستہ وہی ہے جو چیف جسٹس نے تجویز کیا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ کے نقش قدم پر چلا جائے۔ ہمارا دستور بھی یہی کہتا ہے کہ ملک میں قرآن و سنت کے احکام و قوانین کی عملداری قائم کی جائے اور ملکی رائے عامہ بھی کئی بار یہ فیصلہ دے چکی ہے کہ اسلامی

جمہوریہ پاکستان میں اسلامی نظام کا نفاذ عمل میں لایا جائے، اس کے سوا ہمارے کسی مسئلہ کے حل اور قومی زندگی میں اصلاح کا دوسرا کوئی راستہ موجود نہیں ہے۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ—اگست ۲۰۱۱ء)

کرپشن کے خلاف مہم کب مؤثر ہوگی؟

سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں جب ایران فتح ہوا تو جنگ سے واپس آنے والے ایک سپاہی نے حضرت عمرؓ کو فارس کے بادشاہ کے سونے کے کنگن پیش کیے، جو اس نے غنیمت کا مال حاصل کرتے ہوئے سنبھال لیے تھے، اور امانت کے طور پر ان کی حفاظت کر کے انہیں امیر المؤمنین کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔ حضرت عمرؓ اس سپاہی کی دیانت سے بہت متاثر ہوئے اور اپنی مجلس کے شرکاء کے سامنے اس کی تعریف کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ ہماری فوج کے سپاہی اس قدر دیانتدار ہیں۔ اس پر محفل میں شریک ایک بزرگ نے امیر المؤمنین سے عرض کیا کہ حضرت اصل بات یہ ہے کہ آپ خود دیانتدار اور فرض شناس ہیں، اس لیے آپ کی دیانت کے اثرات آپ کے ملازمین اور سپاہیوں پر بھی ہیں، اور ان کی دیانت کی وجہ آپ کی دیانت ہے۔

اس لیے اصل ضرورت اس بات کی ہے کہ مقتدر حضرات، حکمران طبقہ اور بڑے کہلانے والے لوگ کرپشن کے خاتمہ کی طرف پہل کریں، اگر حکمران دیانتدار ہوں گے تو ان کا عملہ اور حکومت کے ملازمین جس درجہ کے بھی ہوں، ان میں دیانت پیدا ہوگی اور وطنِ عزیز کو کرپشن سے نجات دلائی جا سکے گی۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ—اکتوبر ۲۰۱۱ء)

کرپشن ختم کرنے کا عہد اور اس کے تقاضے

گزشتہ دنوں ایک جرمن این جی او کی دعوت پر اسلام آباد میں کرپشن کے خلاف کانفرنس کا اہتمام ہوا جس میں ملک کی چند بڑی سیاسی جماعتوں نے بھی شرکت کی۔ صدر جنرل پرویز مشرف نے کانفرنس سے خطاب کیا اور اس موقع پر ملک میں کرپشن کے خاتمہ کے لیے مشترکہ عزم کرتے ہوئے ایک عہد نامہ پر دستخط کیے گئے۔

خیانت، بددیانتی، بدعنوانی اور کرپشن ہمارے ہاں ایک قومی بیماری کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ جس

کے خاتمہ کے لیے جس طرف سے بھی کوشش کی جائے گی اور اس کے خلاف جہاں سے بھی آواز اٹھے گی اس کا خیر مقدم کیا جائے گا۔ کرپشن ہماری قومی زندگی اور ڈھانچے کو گھن کی طرح چاٹ رہی ہے اور اس نے پورے نظام کو مفلوج کر کے رکھ دیا ہے۔ اس لیے ہم اس کانفرنس اور اس میں کیے جانے والے عہد نامہ کا خیر مقدم کرتے ہیں، البتہ اس کے ساتھ دو گزارشات پیش کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں:

1. ایک یہ کہ کرپشن صرف عہد نامہ پر دستخط کر دینے اور کرپشن کے خلاف بیانات اور تقاریر کا سلسلہ دراز کر دینے سے ختم نہیں ہوگی۔ بلکہ اس کے لیے ٹھوس عملی اقدامات اور مربوط حکمتِ عملی کی ضرورت ہے، جس میں قربانی اور ایثار کے سخت تر مراحل بھی آتے ہیں۔ اس کے بغیر کرپشن کے خاتمہ کی باتیں محض خود فریبی کی بات ہوگی۔
2. دوسری گزارش یہ ہے کہ ہمارے ہاں عام طور پر کرپشن کا تعلق صرف مالی معاملات سے ہی سمجھا جاتا ہے، اور دولت کے غلط طریقہ سے حصول اور لوٹ کھسوٹ کو ہی کرپشن تصور کیا جاتا ہے۔ بلاشبہ یہ بھی کرپشن کا بہت بڑا شعبہ ہے، لیکن اسلامی تعلیمات کی رو سے کرپشن کا دائرہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ارشاد میں امانت کے ضائع کیے جانے کو قیامت کی نشانی قرار دیا تو آنحضرتؐ سے پوچھا گیا کہ امانت کے ضائع ہونے سے یا ضائع کیے جانے کی عملی شکل کیا ہوگی؟ تو سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا "اذا وُسد الامر الیٰ غیر اہلہ" جب معاملات نااہل لوگوں کے سپرد کیے جانے لگیں۔ یعنی معاملات کا نااہل لوگوں کے سپرد ہونا اور کسی منصب پر ایسے شخص کا بیٹھ جانا جو اس کا اہل اور مستحق نہ ہو، یہ بھی امانت کا ضائع ہونا ہے اور بہت بڑی کرپشن ہے۔ بلکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو کرپشن کا اصل سرچشمہ ہی یہ ہے:
   - کیونکہ جب معاملات اہل لوگوں کے سپرد ہوں گے اور ہر منصب پر وہ شخص بیٹھا ہوگا جو اپنی تعلیم و تربیت اور اخلاق و دیانت کے لحاظ سے اس کی اہلیت رکھتا ہے، تو باقی معاملات میں بدعنوانی اور کرپشن کے امکانات خود بخود کم ہوتے چلے جائیں گے۔
   - اور اگر معاملات ہر سطح پر نااہل لوگوں کے ہاتھ میں رہیں گے اور کرپشن کے خاتمہ کے لیے صرف نچلی سطح پر اقدامات کیے جاتے رہیں گے تو ان اقدامات کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا، کیونکہ نااہل ہاتھ کرپشن کے ایک طریقہ کی راہ روکنے پر اس جیسے کئی دوسرے طریقے ایجاد کر لیں گے۔

اس لیے کرپشن کے خاتمہ کی اصل عملی صورت یہی ہے کہ ملک کے نظام کو درست کیا جائے اور تمام

معاملات کو صحیح طور پر چلانے کے لیے اہلیت، دیانت اور استحقاق کو ہر سطح پر بنیاد بنایا جائے۔ اس کے بغیر ملک میں کرپشن کے خاتمہ کا نعرہ لگانا خود کو اور پوری قوم کو فریب میں مبتلا رکھنے کی بات ہوگی۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔ اکتوبر ۲۰۰۲ء)

صدرِ پاکستان کا ذاتی خرچ پر حج، ایک اچھی روایت

صدر پاکستان جناب محمد رفیق تارڑ اس سال حج پر جا رہے ہیں جو صدر منتخب ہونے کے بعد ان کا پہلا بیرونی سفر اور پہلا حج ہوگا۔ ہمارے ہاں عام طور پر یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ صدر یا وزیر اعظم حج اور عمرہ کے لیے جاتے ہیں تو ایک اچھا خاصا وفد ان کے ہمراہ ہوتا ہے۔ اور اس فوج ظفر موج کے اخراجات سرکاری خزانے سے ادا ہوتے ہیں، جو قومی خزانے پر ناروا بوجھ ہونے کے ساتھ ساتھ شرعاً بھی محلِ نظر ہے، مگر صدر تارڑ نے اس روایت کو توڑ دیا ہے۔

روزنامہ خبریں لاہور ۱۵ مارچ ۱۹۹۸ء کے مطابق ایک اخبار نویس نے صدر سے ان کے حج کے سفر کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ وہ حج کا سفر ذاتی خرچے پر کر رہے ہیں۔ ان سے پوچھا گیا کہ سفر میں ان کے ساتھ کون کون ہوگا؟ تو انہوں نے بتایا کہ جو بھی چاہے ان کے ساتھ جا سکتا ہے مگر خرچہ سب کا اپنا اپنا ہوگا۔

صدر تارڑ نے اس سے قبل ایوانِ صدر کے اخراجات اور فالتو عملہ میں کمی کے لیے بھی بعض اقدامات کیے ہیں جنہیں ملک کے سنجیدہ حلقوں میں سراہا گیا ہے۔ یہ ایک اچھی روایت ہے اور ملک کے معاشی مسائل کا حل بھی یہی ہے کہ اربابِ اختیار اپنے اخراجات پر نظر ثانی کریں اور قومی خزانے سے ہونے والے مصارف کو بنیادی ضروریات پر قناعت کے دائرے میں لے آئیں۔ اس سے ملک کے دوسرے طبقات میں بھی قناعت اور سادگی کا شعور بیدار ہوگا اور ملک اپنی معاشی مشکلات پر آسانی سے قابو پا سکے گا۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔ اپریل ۱۹۹۸ء)

معاشرتی امتیاز اور طبقاتی تقسیم

اسلامی نظریاتی کونسل کی ایک سفارش گزشتہ دنوں بعض قومی اخبارات میں نظر سے گزری ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ مکانات کی تعمیر میں درجہ بندی کے لیے قانون سازی کی ضرورت ہے اور حکومت کو

مختلف درجات کے لیے ضرورت کی حد بندی کر کے زائد از ضرورت بلڈنگ کی تعمیر پر پابندی لگا دینی چاہیے۔

ہمارے ہاں اس حوالے سے جو تفاوت پایا جاتا ہے وہ بعض مقامات پر اس قدر ہوشربا ہے کہ معاشرہ میں مساوات، بھائی چارے اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہونے کی اسلامی تعلیمات خواب کی باتیں معلوم ہونے لگتی ہیں، اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایک قوم کے افراد نہیں ہیں، بلکہ مختلف قوموں کے لوگ یہاں رہتے ہیں جن کا ایک دوسرے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

چند ماہ قبل کی بات ہے میں گوجرانوالہ کی جدید ترین اور ترقی یافتہ بستی ''واپڈا ٹاؤن'' گیا جہاں اعلیٰ درجہ کے مکانات اور زندگی کی بہترین سہولتیں موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک قدیمی گاؤں کوہلووالہ ہے۔ درمیان میں چار انچ کی دیوار کا صرف ایک پردہ ہے، دیوار کی ایک جانب واپڈا ٹاؤن ہے دوسری طرف کوہلووالہ ہے اور شاید یہ میرے اس معاملہ میں حد درجہ حساس ہونے کی بات ہے کہ مجھے یہ دیوار معاشرتی طور پر ''دیوار برلن'' محسوس ہوتی ہے۔ میں نے بہت سے دوستوں سے کہا ہے کہ وہ وہاں جائیں، اس دیوار کے اوپر کھڑے ہو کر دونوں طرف کا منظر دیکھیں، پھر اسلام کی ان تعلیمات کو ذہن میں لائیں جو مسلمانوں کے باہمی معاشرتی حقوق کے حوالے سے قرآن و سنت میں سینکڑوں مقامات پر موجود ہیں، اور اس کے بعد اس بات کا فیصلہ کریں کہ اسلام کے نام پر قائم ہونے والے اس ملک میں اور مسلمان کہلانے والی اس قوم میں اسلامی معاشرت کا ماحول پیدا کرنے کے لیے ابھی کس قدر محنت کی ضرورت ہے۔

اسلامی معاشرت کا مثالی دور

ہمارے لیے اسلامی معاشرت کا آئیڈیل دور صحابہ کرامؓ کا دور اور اسلامی نظام کا آئیڈیل سسٹم خلافت راشدہ کا سسٹم ہے۔ اس دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ میں حضرت عثمانؓ، حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت زبیرؓ جیسے مالدار ترین حضرات بھی تھے اور حضرت علیؓ، حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ اور حضرت عمار بن یاسرؓ جیسے فقیر منش حضرات بھی کثیر تعداد میں تھے، لیکن مکان، لباس، خوراک، سواری اور دیگر روزمرہ ضروریات کے حوالے سے معیار زندگی کا ایسا تفاوت موجود نہیں تھا کہ الگ الگ طبقات نظر آنے لگیں۔ تھوڑے بہت فرق سے انکار نہیں کہ وہ فطری امر ہے، لیکن اس طرح کا فرق کہ آبادیاں ہی الگ الگ ہو جائیں اور روزمرہ ضروریات و معمولات کا معیار زمین و آسمان کا فرق ظاہر کرنے لگے اس دور میں کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ سرکاری عمّال کے لیے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے باقاعدہ پابندی لگا دی تھی کہ وہ

- ترکی گھوڑے پر سوار نہیں ہوں گے۔
- چھنے ہوئے آٹے کی روٹی نہیں کھائیں گے۔
- گھر کے دروازے پر ڈیوڑھی نہیں بنائیں گے اور
- باریک لباس نہیں پہنیں گے۔

یہ باتیں اس دور میں معاشرتی امتیاز کی علامتیں شمار ہوتی تھیں اور "سٹیٹس سمبل" سمجھی جاتی تھیں جن پر امیر المومنین حضرت عمرؓ نے پابندی لگادی اور اپنے ہر سطح کے عمّال، افسروں اور گورنروں کو پابند کر دیا کہ وہ لباس، رہن سہن، خوراک اور سواری وغیرہ میں عام لوگوں جیسی زندگی اختیار کریں گے، اور کوئی ایسا امتیاز پیدا نہیں کریں گے جس سے وہ عام شہریوں سے الگ کوئی طبقہ دکھائی دینے لگیں۔

حضرت عمرؓ نے صرف پابندی نہیں لگائی بلکہ اس پر عمل بھی کیا۔ کوفہ کے گورنر حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے گھر کے آگے چھپر تعمیر ہونے کی اطلاع ملی تو اس کو اپنے حکم سے آگ لگوادی۔ اور مصر کے گورنر عیاض بن غنمؓ کے بارے میں شکایت موصول ہوئی کہ انہوں نے باریک لباس کا استعمال شروع کر دیا ہے تو انہیں کچھ عرصہ کے لیے گورنری سے معزول کر کے بیت المال کی بکریاں چرانے پر لگا دیا۔ یہ امت کو اس بات کی تعلیم تھی کہ معاشرہ میں طبقاتی تفاوت اسلامی تعلیمات کی رو سے قابلِ قبول نہیں ہے اور اسلام کا معاشرہ طبقاتی نہیں ہے کہ اس میں ایک ہی شہر کی حدود کے اندر مختلف طبقات مختلف معیار زندگی کے الگ الگ انداز سے زندگی بسر کر رہے ہوں۔

خود جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو دیکھ لیجئے کہ زندگی بھر سہولتوں اور آرام طلبی کے ہر قسم کے مواقع میسر آنے کے باوجود جان بوجھ کر فقر و فاقہ کی زندگی بسر کی ہے۔ یہ صرف عزیمت و تقویٰ کی بات نہیں تھی، بلکہ اس کا تعلق تعلیم و تربیت سے بھی ہے اور معاشرتی معاملات میں امت کی رہنمائی سے بھی ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدینؓ کی اس قسم کی تعلیمات اور ان حوالوں سے ان کے کردار کو ذاتی تقویٰ اور عزیمت کے کھاتے میں ڈال کر ان کے معاشرتی اور تربیتی پہلوؤں سے آنکھ بند کر لیتے ہیں اور رخصت کا سائن بورڈ کھڑا کر کے اپنے لیے ان تمام باتوں کی گنجائش پیدا کرنا شروع کر دیتے ہیں جن کا خیر القرون میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارش اور تفاوت کا قومی ماحول

زائد از ضرورت مکان کی تعمیر پر پابندی کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل نے جو سفارش کی ہے وہ اس سلسلہ میں ایک جزوی حوالے سے ہے۔ اس کا تعلق اس بات سے بھی ہے کہ زائد از ضرورت بلڈنگ کی

تعمیر سے سرمایہ بلاوجہ ضائع ہوتا ہے اور ایک بڑی رقم کسی ترقیاتی یا رفاہی مصرف پر لگنے کی بجائے نمود و نمائش اور تعیش کے کاموں پر صرف ہوجاتی ہے۔ ہم اس سفارش کی حمایت کرتے ہیں اور اسلامی نظریاتی کونسل کو اس سفارش پر مبارکباد دیتے ہیں۔ لیکن اصل ضرورت معاشرتی رویہ اور طرز عمل کو تبدیل کرنے کی ہے اور معاشرہ کے مختلف طبقات کے درمیان پائے جانے والے اس خوفناک تفاوت کو کم کرنے کی ہے، جس نے ہمیں ایک دوسرے سے عملی طور پر لاتعلق طبقات میں بانٹ رکھا ہے۔

یہ تفاوت تنخواہوں میں بھی ہے، لباس میں بھی ہے، سواری میں بھی ہے، خوراک میں بھی ہے اور دیگر معاشرتی ضروریات واقدار میں بھی ہے۔ جس کی بنیاد معاشرہ کی طبقاتی تقسیم کے ذہن وفکر پر ہے۔ ایک طرف ایک ہی شہر میں رہنے والے ایک صاحب کی ماہانہ تنخواہ دس لاکھ روپے ہے اور دوسری طرف اسی شہر کے دوسرے شخص کو بمشکل تین چار ہزار روپے ملتے ہیں۔ مجھ سے ایک دوست نے پوچھا کہ تنخواہوں میں اس قدر تفاوت اور معیار زندگی میں اس قدر فرق کی اسلام میں کوئی گنجائش ہے؟ میں نے عرض کیا کہ اگر آئیڈیل دور صحابہ کرامؓ اور خلفاء راشدینؓ کا ہے تو کوئی گنجائش نہیں ہے، اور ہماری موجودہ معاشرتی زندگی اسلامی تعلیمات کے سراسر منافی اور متضاد ہے۔ اگر ہم نے کسی اور سوسائٹی کو اپنے لیے آئیڈیل اور راہنما قرار دے لیا ہے تو اس طرح کی سینکڑوں گنجائشیں مل سکتی ہیں۔

جمعیت علماء اسلام کی تجویز

جمعیت علماء اسلام پاکستان نے ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں جس منشور کے تحت حصہ لیا تھا اس میں کہا گیا تھا کہ جمعیۃ برسر اقتدار آنے کے بعد ملک بھر میں تنخواہوں کے تناسب میں تفاوت اور فرق کو کم کر کے فوری طور پر انہیں ایک اور دس کے تناسب پر لے آئے گی، اور پھر اسے بتدریج ایک اور پانچ کے تناسب پر لایا جائے گا۔ یہ فیصلہ معاشرہ کی طبقاتی تقسیم کے پس منظر میں تھا اور جمعیۃ علماء اسلام نے اس کے ذریعے طبقاتی تقسیم کے تلخ نتائج و ثمرات کو محسوس کرتے ہوئے ان کو کم کرنے کے لیے ایک عملی راستہ اختیار کرنے کی بات کی تھی۔

یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ مکرمہ کے چند سرداروں کے مطالبہ پر ان سے گفتگو کے لیے حضرت عمارؓ، حضرت بلالؓ اور ان جیسے فقیروں کو مجلس سے اٹھانے کی اجازت نہیں دی۔ اور پھر اللہ تعالیٰ بھلا کرے فقہاء کرام کا کہ انہوں نے مسجد کے آداب و شرائط میں یہ بات طے کر دی کہ کسی مسلمان کو مسجد میں آنے سے نہیں روکا جائے گا، ورنہ ہم تو طبقاتی تفاوت و تقسیم کے اس مقام تک پہنچ چکے ہیں کہ ہمارے ہاں رہائشی بستیوں کی طرح مسجدیں بھی امیروں اور غریبوں کے

لیے الگ الگ ہوتیں، اور اسلام آباد کے مختلف گریڈوں کے حساب سے رہائشی سیکٹروں کی تقسیم کی طرح مسجدوں پر بھی بورڈ لگ جاتے کہ یہ مسجد بیس تا بائیس گریڈ والوں کی ہے، یہ پندرہ تا انیس گریڈ والوں کی مسجد ہے، اور اس مسجد میں اس سے نچلے گریڈ کے ملازمین نماز پڑھ سکتے ہیں۔

اس لیے ہم اسلامی نظریاتی کونسل کی مذکورہ بالا سفارش کا خیر مقدم کرتے ہوئے کونسل کے ذمہ دار حضرات سے یہ گزارش کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ وہ معاشرہ کی طبقاتی تقسیم کی مجموعی صورتحال کے بارے میں بھی رائے دیں اور قوم کی اس باب میں رہنمائی کریں کہ اس طبقاتی تقسیم اور تفاوت کے زہر کا تریاق ہمیں کہاں سے ملے گا اور ہم اس دلدل سے کیسے نکل پائیں گے؟

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۲۲ اگست ۲۰۰۳ء)

معاشی تفاوت کی دو خبریں

گزشتہ دن کے ایک اخبار میں دو خبروں نے توجہ کو اپنی طرف ایسا مبذول کیا کہ انہیں کئی بار پڑھنا پڑا۔ ایک صفحہ اول پر ہے اور دوسری آخری صفحہ پر۔ پہلے صفحہ کی خبر یہ ہے کہ وزیر اعظم میر ظفر اللہ خان جمالی نے ارکان قومی اسمبلی کی تنخواہوں اور الاؤنسز میں اضافے کی منظوری دے دی ہے، جس کا باقاعدہ نوٹیفیکیشن کیبنٹ ڈویژن جاری کرے گا۔ اس سے پہلے ارکان قومی اسمبلی کے الاؤنسز سمیت ماہانہ تنخواہ سترہ ہزار پانچ سو روپے تھی، جبکہ اضافے کے بعد اب ہر رکن کو مجموعی طور پر اڑتیس ہزار روپے ملیں گے۔ سالانہ کنوینس الاؤنس تیس ہزار روپے سے بڑھا کر ساٹھ ہزار روپے کر دیا گیا ہے، اس طرح پہلے ہر رکن اسمبلی کو سالانہ پچاس ہزار روپے کے ٹریولز واؤچر ملتے تھے یا وہ اس کے برابر نقد رقم لے سکتا تھا، اب انہیں سالانہ ایک لاکھ روپے کے ٹریول واؤچر یا نقد رقم ملے گی۔ وزیر خزانہ شوکت عزیز اور ارکان اسمبلی ذوالفقار ڈھلوں، شیر افگن، فصیح ظفر، اکرم بھنڈر، فوزیہ وہاب اور عمر ایوب خان پر مشتمل کمیٹی نے تنخواہ میں اس اضافے کی سفارش کی تھی۔

اب صفحہ آخر کی خبر بھی دل پر ہاتھ رکھ کر ملاحظہ فرمالیجئے کہ باغبانپورہ لاہور کے علاقہ یونس پورہ میں ریٹائرڈ سرکاری ملازم قلب عباس کی پینتالیس سالہ اہلیہ طاہرہ نے بچوں کے لیے عید کے کپڑے نہ ہونے سے دل برداشتہ ہو کر زہریلی گولیاں کھا کر زندگی کا خاتمہ کر لیا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ یونس پورہ کا رہائشی قلب عباس کچھ عرصہ قبل ہی ریٹائر ہوا اور وہ اس کے بعد سے بے روزگار تھا۔ گھر میں فاقوں کے باعث اکثر جھگڑا رہتا تھا، اس کی اہلیہ نے تین بچوں کے لیے عید کے نئے کپڑے بنوانے کی ضد کی۔ حالات کی خرابی

کے باعث مسلسل کوشش کے باوجود بچوں کے نئے کپڑوں کا بندوبست نہ کر سکا، جس پر دونوں میاں بیوی میں جھگڑا ہوا اور طاہرہ نے دل برداشتہ ہو کر زہریلی گولیاں کھالیں۔ پولیس نے ضروری کارروائی کے بعد لاش ورثاء کے حوالے کر دی ہے۔

قومی اسمبلی کے ارکان ہمارے ملک کے معزز شہری ہیں اور عوام کے منتخب نمائندے ہیں۔ ان کا حق بنتا ہے کہ انہیں ایک باوقار شہری کے طور پر زندگی بسر کرنے کی سہولتیں مہیا کی جائیں اور آمد و رفت کے معقول ذرائع انہیں حاصل ہوں۔ مگر باغبانپورہ لاہور کا قلب عباس بھی اسی ملک کا شہری ہے اور ارکان قومی اسمبلی کو منتخب کرنے والے عوام میں سے ہے، اس کا بھی حق ہے کہ اسے اپنے گھر کو فاقوں اور جھگڑوں سے محفوظ رکھنے کے ضروری وسائل میسر ہوں اور وہ اپنے تین بچوں کو عید کے موقع پر نئے کپڑے مہیا کرنے کے لیے بیوی کی ضد پوری کر سکے۔

قومی سوچ کی ستم ظریفی

ان دونوں خبروں میں ستم ظریفی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ خبر نگار نے ارکان اسمبلی کی تنخواہوں اور الاؤنسز میں اضافہ کی تجویز کو ایک باقاعدہ کمیٹی کی سفارش کے طور پر بیان کیا ہے۔ اور تین بچوں کے لیے عید کے موقع پر نئے کپڑوں کے تقاضے کو بیوی کی ضد قرار دے دیا ہے کہ جیسے مذکورہ کمیٹی کی سفارش تو کسی استحقاق پر مبنی ہے اور خودکشی کے سوا کوئی راہ نہ پانے والی خاتون کا تقاضا ایک بے جا ضد تھی جس پر وہ خواہ مخواہ اپنی جان کو قربان کر بیٹھی ہے۔

یہ ہمارے ملک کے معاشی ڈھانچے اور معاشرتی ڈھانچے کی ایک جھلک ہے، جسے ہم دنیا کے سامنے ''اسلامی جمہوریہ پاکستان'' کے نام سے متعارف کراتے ہیں اور جس کے بارے میں دینی حلقوں کا دعویٰ ہے کہ وہ اس میں خلافت راشدہ کا نظام لانا چاہتے ہیں، جبکہ صدر جنرل پرویز مشرف کا ارشاد ہے کہ وہ پاکستان کو ایک ترقی پسند فلاحی اسلامی ریاست کی شکل دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ خلافت راشدہ اور فلاحی اسلامی ریاست میں کوئی تضاد نہیں ہے، بلکہ خلافت راشدہ نام ہی فلاحی ریاست کا ہے اور دنیا کی فلاحی ریاستوں میں خلافت راشدہ کو ایک مثالی اور آئیڈیل ریاست کے طور پر سب حلقوں میں تسلیم کیا جاتا ہے۔

خلافتِ راشدہ اور مہاتما گاندھی

ہم ان کالموں میں ذکر کر چکے ہیں کہ گاندھی جیسے غیر مسلم لیڈر نے انگریزی دور میں بعض صوبوں میں کانگریس کی وزارتیں قائم ہونے پر اپنے وزراء کو تلقین کی تھی کہ اگر وہ عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کرنا

چاہتے ہیں تو حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کے دورِ حکومت کو سامنے رکھیں۔ اور یہ بات بھی ریکارڈ پر آچکی ہے کہ برطانیہ میں جو بے روزگار اور نادار افراد کی ریاستی کفالت کا فلاحی نظام نافذ ہے، اسے تشکیل دینے والے دانشوروں نے اس کا خاکہ حضرت عمرؓ کے طرزِ حکومت سے اخذ کیا ہے۔

خلافت راشدہ کے معاشی اصولوں میں دو باتیں بطور خاص اہمیت رکھتی ہیں:

1. ایک یہ کہ ملک کے ہر شہری کی بنیادی ضروریات کی کفالت ریاست کے ذمہ ہے اور بیت المال اس بات کا ذمہ دار ہے کہ ریاست کے جو باشندے خوراک، رہائش، لباس، علاج اور تعلیم کی بنیادی ضروریات کے لیے خود اسباب و وسائل فراہم کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں، انہیں بیت المال کی طرف سے ضرورت کے مطابق وظائف دیے جائیں اور ان کی ضروریات پوری کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ امیر المؤمنین حضرت عمرؓ نے اس مقصد کے لیے شہریوں کی درجہ بندی کر کے ان کے وظائف مقرر کر رکھے تھے اور ان کا یہ قول تاریخ میں سنہری الفاظ کے ساتھ محفوظ ہے کہ ”اگر دریائے فرات کے کنارے کتا بھوک سے مر گیا تو اس کے بارے میں قیامت کے روز عمرؓ سے سوال ہوگا“۔ یہ احساس ذمہ داری تھا جس نے حضرت عمرؓ کو ہر دم بے چین کر رکھا تھا، حتیٰ کہ ان کی راتیں کسی راحت کدہ میں نیند کی حالت میں نہیں، بلکہ مدینہ منورہ کی گلیوں میں گھوم پھر کر لوگوں کے حالات معلوم کرنے میں گزرتی تھیں۔
2. اس کے ساتھ ہی خلافت راشدہ کا دوسرا بڑا معاشی اصول یہ تھا کہ معاشرہ میں معیار زندگی کے حوالے سے طبقاتی تقسیم نہ پیدا ہو اور خاص طور پر حکمران طبقہ اور رعیت کے معیار زندگی میں کوئی ایسا فرق رونما نہ ہونے پائے جس سے وہ الگ الگ طبقات کے افراد شمار ہونے لگیں۔ چنانچہ خلیفہ اول حضرت سیدنا ابوبکر صدیقؓ کے منصبِ خلافت پر فائز ہوتے ہی ان کے لیے بیت المال سے وظیفہ مقرر کیا گیا تو اس کے لیے یہ اصول طے پایا کہ انہیں قومی خزانہ سے اتنی تنخواہ دی جائے جس سے وہ مدینہ منورہ کے ایک عام باشندے جیسی زندگی بسر کر سکیں اور یہی اصول ان کے بعد بھی خلفاء کے لیے قائم رہا۔

پاکستان میں غربت کا بڑھتا ہوا تناسب

لیکن ہمارے ہاں صورتحال یہ ہے کہ عوام کے ووٹوں سے منتخب ہونے والے ارکان قومی اسمبلی اپنے لیے تو ہر رعایت، سہولت اور ذرائع و وسائل کے حصول کے خواہشمند رہتے ہیں، مگر جن غریب عوام کے ووٹوں سے وہ اس ایوان تک پہنچے ہیں، ان کی حالت زار کی طرف کوئی توجہ نہیں ہے۔ بین الاقوامی

رپورٹوں کے مطابق پاکستان میں غربت کا تناسب بڑھتا جا رہا ہے، عوام کی ایک بڑی تعداد روٹی کپڑے کی روز مرہ ضروریات کو پورا کرنے سے عاجز ہو گئی ہے، اور ملکی معیشت کے بہتری کی طرف سفر کے تمام تر سرکاری دعووں کے باوجود عام آدمی کی زندگی پر اس کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے۔ البتہ ہماری قومی اسمبلی کے ارکان نے اس شعبہ میں کوئی معرکہ سر کیا ہے تو وہ یہ کہ اپنی تنخواہوں اور مالی مراعات میں دو گنا سے بھی زیادہ اضافہ کر لیا ہے۔

ہماری بدقسمتی ہے کہ جب ہم بات کرتے ہیں تو خلافت راشدہ سے نیچے کہیں ہماری زبان نہیں رکتی، لیکن عمل کا موقع آتا ہے تو آج کے دور کے معروف تقاضوں کی طرف توجہ دینے سے بھی قاصر رہ جاتے ہیں۔ ہم نے اپنے اسلاف کو چھوڑ کر مغرب کو اپنا رہنما بنا رکھا ہے، مگر مغرب نے عوام کو سہولتیں فراہم کرنے اور ان کی ضروریات کی کفالت کے حوالے سے جو نظام وضع کیے ہوئے ہیں ان کی پیروی ہمیں مشکل دکھائی دیتی ہے۔ ہم نے مغرب کو صرف مذہب بیزاری اور بے راہ روی میں اپنا امام بنایا ہے اور اس کی کسی اچھی بات کو قبول کرنے کے لیے ہم تیار نہیں ہیں۔

قومی اسمبلی کے معزز ارکان سے گزارش ہے کہ وہ اپنے لیے زیادہ سے زیادہ سہولتوں کی فراہمی کا ضرور اہتمام کریں کہ قلم ان کے ہاتھ میں ہے اور سارے اختیارات ان کی جیب میں ہیں، لیکن تین بچوں کے لیے عید کے نئے کپڑے نہ ملنے پر خودکشی کرنے والی طاہرہ کی حالت زار کی طرف بھی توجہ دیں۔ یہ ایک نہیں اس جیسی لاکھوں طاہرائیں معاشرے میں بھری پڑی ہیں، صرف آنکھوں سے پٹی اتار کر ادھر ادھر دیکھنے کی ضرورت ہے۔ گنتی کی چند خوشحال سوسائٹیوں کو چھوڑ کر ملک کے ہر شہر، ہر محلے اور ہر گاؤں میں قلب عباس اور طاہرہ کے جھگڑے فضا کو چیر رہے ہیں۔ وزیر اعظم میر ظفر اللہ جمالی سے درخواست ہے کہ وہ قومی اسمبلی کے ارکان کی تنخواہوں میں اضافے کا باقاعدہ نوٹیفیکیشن جاری کرتے ہوئے باغبانپورہ لاہور کے تھانہ سے طاہرہ کی خودکشی کی فائل بھی منگوا کر دیکھ لیں۔ ہو سکتا ہے ہماری اشرافیہ کے دل کے کسی کونے میں احساس کی کوئی چنگاری جاگ اٹھے۔

(روزنامہ اسلام، لاہور۔ ۱۶ نومبر ۲۰۰۳ء)

لوڈ شیڈنگ اور سفید پوشی

لوڈ شیڈنگ کے عذاب سے تنگ عوام بار بار سڑکوں پر آ کر اپنے غصے اور جذبات کا اظہار کر رہے ہیں مگر منصوبہ سازوں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگ رہی۔ یوں محسوس ہو رہا ہے کہ نائن الیون کے بعد

پاکستان کو پتھر کے دور میں واپس لے جانے کی جو دھمکی دی گئی تھی، شاہ سے زیادہ شاہ کے وفاداروں کے ہاتھوں اس پر عمل کرایا جارہا ہے۔ لوڈشیڈنگ تو غریب عوام کے لیے اس شدید گرمی اور تپش میں عذاب بنی ہوئی ہے لیکن اس کے ردعمل میں جگہ جگہ ہونے والے احتجاجی مظاہروں نے بھی مستقل پریشانی کی صورت اختیار کرلی ہے اور قومی املاک کے نقصان کے علاوہ سڑکوں کے بلاک ہوجانے پر رکی ہوئی ٹریفک سے پیدا ہونے والے مسائل نے اضطراب اور بے چینی کا ایک اور ماحول پیدا کردیا ہے۔

لیکن اس سلسلہ میں اپنے تاثرات ومشاہدات کا ذکر کرنے سے پہلے ایک چھوٹی سی خوشی کی خبر قارئین تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ گزشتہ دنوں ایک پروگرام میں شرکت کے لیے فیصل آباد جاتے ہوئے کھرڑیانوالہ میں ایک دوست کے ہاں چائے کے لیے رکا تو یہ سن کر خوش کن حیرت ہوئی کہ اس قصبہ میں لوڈشیڈنگ بالکل نہیں ہوتی اور وہاں ایک محدود سے علاقے کے لوگ لوڈشیڈنگ کی ''لذت'' تک سے ناآشنا ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ کھرڑیانوالا اور گردونواح کے کچھ دیہات میں بجلی اردگرد کی بڑی فیکٹریاں فراہم کرتی ہیں اور ان کا بجلی کا اپنا نظام ہے جن میں بطور خاص ستارہ فیکٹری کا نام لیا جاتا ہے۔ یہ معلوم کر کے دہری خوشی ہوئی، ایک تو اس لیے کہ ہمارے ملک میں کوئی خطہ تو ایسا ہے جہاں کے باشندے لوڈشیڈنگ کے عذاب سے محفوظ ہیں اور دوسری اس بات پر کہ پاکستان میں ایسے صنعتکار بھی پائے جاتے ہیں جو اپنے مزدوروں اور ان کے ساتھ پڑوسیوں کو بھی ضروری سہولتیں فراہم کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں اور کچھ غریب عوام کے لیے آسانیاں مہیا کررہے ہیں۔ خدا کرے کہ ملک کے باقی علاقوں کے صنعتکار بھی ان کی پیروی کریں اور اپنے اردگرد کے جن عوام کو وہ زندگی کی جو سہولت بھی فراہم کرسکتے ہوں اس کے لیے عملی پیشرفت کریں۔

مجھے ۱۶ جون کو پاکستان شریعت کونسل کی مرکزی مجلس شوریٰ کے اجلاس میں شرکت کے لیے بھوربن مری جانا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک لطیفہ تو یہ ہوا کہ دورانِ سفر کراچی سے ایک دوست کا فون آیا کہ مبارک ہو پاکستان شریعت کونسل اتنی ترقی یافتہ ہوگئی ہے کہ بھوربن کے پی سی ہوٹل میں سالانہ اجلاس منعقد کررہی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ مبارکباد کا شکریہ مگر ہم اپنا اجلاس پی سی ہوٹل میں نہیں بلکہ اس کے سامنے واقع مدرسہ تعلیم القرآن میں کررہے ہیں جہاں بہت سی دینی جماعتوں کے اجتماعات موسم گرما میں منعقد ہوتے ہیں۔ اس موقع پر مجھے محترم عطاء الحق قاسمی کا ایک کالم یاد آگیا اور میں نے بہت سے دوستوں کو اس دوست کی مبارکباد کے حوالے سے اس کالم کا اقتباس سنایا جس میں قاسمی صاحب نے ''سفید پوشی'' کی تعریف اس طرح کی ہے کہ ماسی برکتے کے تندور سے روٹی کھا کر پی سی کے سامنے ٹہلتے ہوئے دانتوں میں خلال کرنے والے کو سفید پوش کہا جاتا ہے۔ ہم بھی وہی سفید پوش ہیں، سال میں ایک آدھ بار اجلاس کے

بہانے وہاں جمع ہوتے ہیں، اس مدرسہ کی مسجد میں ہمارا اجلاس ہوتا ہے اور اس کے قریب کسی عوامی ہوٹل میں دو تین کمرے کرائے پر لے کر ایک دو روز وہاں گزار لیتے ہیں۔

(روزنامہ پاکستان، لاہور — ۲۳ جون ۲۰۱۲ء)

شادی گھر کا نظم: مسجد کا ایک اور معاشرتی کردار

مسلم معاشرہ میں مسجد کے معاشرتی کردار کے حوالے سے میں اپنے بیانات اور مضامین میں ایک عرصہ سے گزارش کر رہا ہوں کہ ① عبادات ② دینی تعلیم ③ دعوت و تبلیغ اور ④ ذکر و اذکار کے حوالے سے تو مسجد معاشرہ میں کردار ادا کر رہی ہے اور اس کے اثرات و برکات بھی نمایاں محسوس ہو رہے ہیں، مگر اس میں ⑤ رفاہِ عامہ ⑥ مصالحت و کونسلنگ اور ⑦ طبقاتی مفاہمت و ہم آہنگی کے فروغ کو بھی شامل ہونا چاہیے جو کہ اسلامی معاشرے میں مسجد کی مرکزیت کا ضروری تقاضہ ہے۔

اس پس منظر میں اسلام آباد سے موصول ہونے والی ایک رپورٹ بہت خوشی اور اطمینان کا باعث بنی ہے جو قارئین کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ ملک بھر میں مساجد کے خطباء و ائمہ اور منتظمین و معاونین کو اس پر غور کر کے اس طرز پر اپنے ہاں کام کو مرتب و منظم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

"الحمد للہ غریب بیٹیوں کی شادی کیلئے مسجد رحمۃ للعالمین (ایف ایٹ فور، اسلام آباد) میں شادی گھر قائم کر دیا گیا ہے۔ نادار افراد کی بیٹیوں کو مسجد رخصت کرے گی۔ میزبانی کا سامان مثلاً برتن، میز اور کرسیاں فراہم کی جا رہی ہیں۔ خواتین اور مردوں کیلئے الگ الگ نشست اور کھانے کا انتظام ہوگا۔ دولہا اور دلہن کیلئے مناسب اسٹیج بھی دستیاب ہے۔ دلہن کی تیاری کا کمرہ (برائڈل روم) بھی مختص کیا گیا ہے۔ شادی کی ایک تقریب کیلئے تین گھنٹے کیلئے یہ جگہ فراہم کی جائے گی۔ یتیم اور مستحق بیٹیوں کیلئے کھانا مسجد فراہم کرے گی۔ میزبانی (سرونگ) کے لیے بوقت ضرورت تربیت یافتہ عملہ بھی دستیاب ہوگا۔ اہلِ خاندان نکاح اپنے پسند کے کسی بھی فرقے کے کسی بھی عالم سے پڑھوا سکتے ہیں۔ مزدور و محنت کش اور مستحق و بے سہارا افراد کی بیٹیوں کو باعزت طریقے سے مسجد سے رخصت کیا جائے گا۔ مستحق اور نادار افراد کے لیے یہ سہولتیں بالکل مفت ہیں۔

یہ تمام عمل نمازوں کے معمول یا نظام کو متاثر کیے بغیر جاری رہے گا۔ یہ مکمل نظام مسجد رحمۃ للعالمین پیش کر رہی ہے، والحمد للہ تعالیٰ۔

سوچیئے کہ بیٹیوں کی رخصتی کو مسجد سے منسلک کرنے سے خرافات ختم ہوں گی اور برکت کے ماحول میں نئی زندگی شروع ہوگی۔ سفید پوش اور خوددار غریب پر بوجھ کم ہو جائے گا۔ رخصتی کی تقریب ناچ گانے کی بجائے اذان اور نماز سے منسلک ہوگی۔ اسراف اور فضول خرچی کا خاتمہ ہوگا۔ نکاح کے موقع پر بھی تربیت و اصلاح ہوگی۔ سفید پوش لوگوں کیلئے ایک باعزت نظام بن جائے گا۔ کسی غریب باپ کو اپنی بیٹی بوجھ نہیں نظر آنے گی۔ کتنے ہی خوددار خاندان غیر ضروری قرض لینے یا مدد مانگنے کی آزمائش سے بچ جائیں گے۔ اس سے بیٹی، خاندان اور پھر نسل کا مسجد سے مضبوط تعلق بنے گا۔ شادی کا صحیح اسلامی کلچر متعارف کروانے میں شاندار مدد ملے گی۔ مسجد کی برکت سے نکاح کا بندھن مبارک اور سعید ہوگا۔

مساجد رحمت کا بڑا ذریعہ ہیں۔ اہلِ مساجد دینے اور بانٹنے والے بن جائیں اور دل بڑا کریں تو مسجدوں کے پاس ہال بھی ہیں، وضو خانے بھی، بیت الخلا بھی اور پارکنگ کی جگہ بھی۔ مسجدوں کو مرکزِ خدمت بنائیں۔

بکنگ کا طریقہ: خواہش مند خاندان مسجد انتظامیہ سے رابطہ کرے۔ مسجد اپنا ایک فرد بطور منتظم (کوارڈینیٹر) مقرر کرے گی۔ مقررہ تاریخ اور وقت کے مطابق ترتیب بنائیں۔ خاندان کو تقریب کا انتظام اور طریقہ سمجھا دیا جائے گا۔

اس سلسلہ میں مسجد یہ تجویز کرتی ہے کہ صرف ضروری لوگ مدعو کریں، بہتر ہے مہمان ۱۰۰ یا ۱۲۰ سے کم ہی ہوں، جس میں خواتین و حضرات کا تناسب آدھا آدھا رکھیں۔ موقع کی مناسبت سے اچھا اہتمام ہو لیکن اسراف سے پرہیز کیا جائے۔ شرعی تعلیمات کا لحاظ رکھا جائے۔ خاندان کے مرد اور خواتین ترتیب اور صفائی وغیرہ کا خود خیال رکھیں۔ نگرانی کیلئے ایک مرد اور ایک خاتون مقرر کر دیں۔ تقریب ختم ہوتے ہی صفائی کروا دی جائے۔ مسجد انتظامیہ کا کوئی فرد تقریب میں شریک نہیں ہوگا۔

منجانب: جامع مسجد رحمۃ للعالمین (ایف ایٹ فور، اسلام آباد)"

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد- ۳ مئی ۲۰۲۳ء)

مفادات کی جنگ کیلئے اسلام کا نعرہ!

سوشلزم کی بات تو سوشلسٹ جانیں لیکن اسلام کی حفاظت کی ذمہ داری ہم پر ہے اور ہمیں گروہی سیاست کے کھلاڑیوں پر یہ بات واضح کر دینی چاہیے کہ خدا کے لیے اسلام پر رحم کرو اور اپنے مفادات کی جنگ کے لیے اسلام کی بجائے کوئی اور عنوان منتخب کرو۔ اسلام نصف صدی سے اس خطۂ زمین میں غلط کاروں کے سیاسی استحصال کا شکار ہو رہا ہے۔ یہاں جو کرسی کی طرف بڑھا اس نے اسلام کو نعرے کے طور پر استعمال کیا اور جس کی کرسی کو خطرہ ہوا اس نے اسلام کو ڈھال بنالیا۔ اس کے سوا ان لوگوں کے ہاں اسلام کا اور کیا مصرف رہا ہے؟ اس لیے اب اسلام کے نام کو غلط مقاصد اور گروہی مفادات کے لیے استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ جو لوگ برسرِ اقتدار رہ کر اسلام کے عملی نفاذ کے لیے کچھ نہیں کر سکے اور آج کرسیوں پر بیٹھے بھی کچھ نہیں کر رہے، ان کے منہ سے اسلام اور قرآن کی بات ایسے ہی ہے جیسے شراب کی بوتل پر شربتِ صندل لکھ دیا جائے۔

اسلام مظلوم اور محنت کش کا ساتھی ہے، اس کی تعلیمات عدل و انصاف، حقوق کی مساوات، سیاسی آزادی اور عزتِ نفس کے تحفظ کی ضامن ہیں۔ وہ کسی ایک طبقے یا گروہ کے مفادات کا نہیں بلکہ معاشرہ کے ہر فرد کے صحیح مفادات کا ضامن ہے۔ اور اگر کچھ لوگ محض ذاتی و گروہی مفادات کے تحفظ کے لیے اسلام کا نام استعمال کر رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ معاشرہ کے غریب عوام کو اسلام کی طرف سے مایوس کر کے خود اس ملک میں سوشلزم اور کمیونزم کی راہ ہموار کر رہے ہیں۔ سوشلزم کا راستہ روکنا ہے تو اسلام کو پورے کا پورا عملی طور پر نافذ کر دو، ورنہ اگر تمہارے اس طرزِ عمل سے سوشلزم کی حوصلہ افزائی ہوئی تو کروڑوں مسلمانوں کو سوشلزم کی گود میں دھکیلنے کے ذمہ دار تم ہوگے۔

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور — ۲۶ ستمبر ۱۹۷۵ء)

بیرون ملک جانے کا جنون

روزنامہ نوائے وقت لاہور کی ایک خبر کے مطابق وفاقی تحقیقاتی ادارے نے تقریباً ایک درجن ایسی ریکروٹنگ ایجنسیوں کے خلاف کارروائی کا فیصلہ کیا ہے جو پاکستانیوں کو بوگس ویزوں پر بیرون ملک بھجوانے کا مذموم کاروبار کرتی ہیں۔ ابھی کچھ دنوں قبل حکومت مغربی جرمنی نے ایک خصوصی طیارے کے ذریعے ایک سو چار پاکستانیوں کو واپس بھجوایا تھا جو غیر قانونی طور پر انہی ریکروٹنگ ایجنسیوں کے ذریعے

وہاں پہنچے تھے اور یہ واقعہ پاکستان کے لیے بین الاقوامی سطح پر رسوائی کا باعث بنا تھا۔

ہمارے ہاں باہر جانے کا رجحان اب جنون کی صورت اختیار کرتا جارہا ہے جس کے محرّکات میں ملک میں معقول روزگار کے فقدان اور ہنرمند افراد کی بے قدری کے ساتھ ساتھ دولت جمع کرنے اور معیارِ زندگی کی دوڑ میں سب سے آگے بڑھ جانے کی ہوس بھی شامل ہے۔ ہم اہلِ علم و فن کے ملک سے باہر جانے کے مخالف نہیں کیونکہ اس سے ملک کی نیک نامی کے ساتھ ساتھ زرِمبادلہ بھی حاصل ہوتا ہے جو آج کے دور میں پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ لیکن باہر جانے کے نام سے اس وقت جو کچھ ہمارے ہاں ہورہا ہے اسے کسی بھی صورت مستحسن قرار نہیں دیا جاسکتا۔

حکومت اور دیگر قومی اداروں کو اس صورتحال کا جائزہ لینا چاہیے اور ویزوں کا جعلی کاروبار کرنے والی ایجنسیوں کے خلاف کارروائی کرنے کے ساتھ ساتھ ملک سے افرادی قوت کے اس بے تحاشا انخلا کے اثرات و نتائج پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔ ہماری رائے میں حکومت کو ملک کی افرادی قوت کی منصوبہ بندی کر کے ملک میں روزگار کے مواقع میں وسعت پیدا کرنی چاہیے۔ اور جن افراد کا بیرون ملک جانا ملک و قوم کے مفاد میں ہو اُن کی بھی مناسب تربیت کا اہتمام کیا جانا چاہیے تاکہ وہ بیرون ملک اپنے وطن کی بدنامی اور رسوائی کا ذریعہ نہ بنیں۔

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور - ۶ جنوری ۱۹۷۸ء)

حلال کی کمائی میں برکت ہے

اے پی پی کی اطلاع کے مطابق چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل محمد ضیاء الحق نے اسلام آباد میں سہ فریقی لیبر کانفرنس کے عشائیہ میں مزدوروں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا ہے کہ حلال کی کمائی میں برکت ہوتی ہے اور انسان رزق سے اس وقت ہی بھرپور استفادہ کر سکتا ہے جب وہ حلال کمائی کے ذریعے حاصل کیا گیا ہو۔

جنرل موصوف کا ارشاد بالکل بجا ہے مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ حلال کمائی کا ذریعہ کیا ہے؟ کیا اس نظامِ معیشت میں جس کی بنیاد سود اور سٹے پر ہو، کوئی بھی فرد اپنی کمائی کے خالص ہونے کا یقین کر سکتا ہے؟ جنرل صاحب موصوف صاحبِ اختیار ہیں اس لیے یہ فرض سب سے پہلے انہی کا ہے کہ وہ اس ملک میں حلال کمائی کے مواقع لوگوں کو مہیا کریں، اور یہ اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک معیشت کے اجتماعی نظام کو حرام سے پاک کر کے حلال پر اس کی بنیاد نہیں رکھی جاتی۔

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور-۶ جنوری ۱۹۷۸ء)

قومی مفاد کا تقاضہ کیا ہے؟

بعض اطلاعات کے مطابق ملک میں برقی کھڈیوں کی صنعت اس وقت شدید بحران کا شکار ہے اور اس سے وابستہ ہزاروں مالکان اور لاکھوں مزدور پریشان ہیں کیونکہ برقی کھڈیوں کی مصنوعات کی معقول کھپت نہ ہونے کے باعث بیشتر کھڈیاں بند پڑی ہیں اور اس صنعت سے متعلق حضرات نے حکومت سے مطالبہ کیا ہے کہ برقی کھڈیوں کے تیار کردہ کپڑے کی کھپت کے لیے بیرون ملک مناسب منڈیاں تلاش کی جائیں۔

اس مطالبہ کی تائید کے ساتھ ہم مسئلہ کے اس پہلو کو بھی سامنے لانا چاہتے ہیں کہ ملک میں کچھ عرصہ سے غیر ملکی کپڑے اور مصنوعات کے استعمال کا جو وبائی رجحان پیدا ہوا ہے وہ بھی ملکی صنعت کے عدمِ استحکام کا ایک اہم سبب ہے۔ قومی مفاد کا تقاضہ یہ ہے کہ قوم میں سادگی، کفایت شعاری اور ملکی مصنوعات کو ترجیح دینے کے جذبات کو ابھارا جائے اور قومی سطح پر ایک منظم اور ہمہ گیر تحریک چلائی جائے تاکہ ملکی صنعت کے استحکام کے ساتھ ساتھ زائد مصارف اور محض فیشن پر صرف ہونے والی دولت برباد ہونے کی بجائے کسی مفید قومی مقصد پر خرچ ہو سکے، کیونکہ ہم اس وقت اقتصادی طور پر جس حالت سے گزر رہے ہیں اس میں ملک فیشن پرستی کی عیاشی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور-۳ مارچ ۱۹۷۸ء)

گریڈ سسٹم اور انتظامی ڈھانچہ

صدر جنرل محمد ضیاء الحق نے گزشتہ روز پاکستان انجینئرنگ کونسل کے سالانہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے گریڈ سسٹم کی خرابیوں کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ تنخواہوں میں گریڈ سسٹم کی وجہ سے ملازمین کی توجہ صرف گریڈ پر رہ گئی ہے اور ملک کو اس سے بہت نقصان پہنچا ہے۔

گریڈ سسٹم کی موجودہ صورت دراصل مختلف محکموں میں تنخواہوں کے تفاوت کو ایک دائرہ میں لانے کے لیے طے کی گئی تھی اور تنخواہوں کے بے شمار معیاروں کو ختم کر کے ۲۲ گریڈ قائم کیے گئے تھے۔ جس کا مقصد تنخواہوں کے تفاوت کو ایک حد میں لانا اور اس معاملہ میں نظم پیدا کرنا تھا۔ لیکن گریڈ سسٹم کے نفاذ کے بعد سے اب تک کی صورتحال کو سامنے رکھا جائے تو مذکورہ مقاصد اور فوائد سے قطع نظر ایک بڑی

خرابی یہ پیدا ہوئی ہے کہ کسی بھی سرکاری ملازم کے مقام و مرتبہ کے تعیّن کا دارومدار اس کی اہلیت، کارکردگی، محنت اور اخلاص کی بجائے صرف اس کے گریڈ پر رہ گیا ہے۔ اور اسی لیے ملازمین کی اکثریت گریڈ کی ترقی کے چکر میں الجھ کر رہ گئی ہے اور اس طرح ایک نئی دوڑ ملازمین کی کارکردگی میں رکاوٹ بن گئی ہے۔ یہاں تک تو ہم صدر مملکت کی رائے سے اتفاق کرتے ہیں مگر مسئلہ صرف گریڈ سسٹم کا نہیں اور نہ ہی اس جزوی مسئلہ کو حل کرنے کی کسی کوشش سے ہمارے انتظامی ڈھانچے کی کارکردگی میں بہتری کی توقع کی جاسکتی ہے۔ بلکہ اصل مسئلہ اس انتظامی ڈھانچے کا ہے جو ہمیں آزادی کے وقت بدیسی حکمرانوں سے ورثہ میں ملا ہے اور ہم نے اسے اپنے غیر ملکی آقاؤں کی نشانی سمجھتے ہوئے ابھی تک جوں کا توں سینے سے چمٹا رکھا ہے۔ یہ انتظامی ڈھانچہ جس دور میں تشکیل پایا تھا اس دور کے تقاضے الگ تھے، اس وقت غیر ملکی حکمران تھے اور ان کی نوآبادیاتی حکمتِ عملی کا تقاضا تھا کہ ان کے اور ان کی رعیت کے درمیان ''مِنی آقاؤں'' کی ایک صف کھڑی رہے۔ چنانچہ نوآبادیاتی انتظامی ڈھانچے نے بڑی مہارت اور چابکدستی کے ساتھ ''مِنی آقا'' کا یہ کردار ادا کیا اور اس کردار کا تسلسل ابھی تک نہ صرف قائم ہے بلکہ ''آقائیت'' کے اظہار میں بھی کمی کی کوئی صورت سامنے نہیں آئی۔

ہمارے انتظامی قواعد و ضوابط، سرکاری ملازمین کے معیارِ زندگی اور طرزِ معاشرت میں شرمناک تفاوت، افسر و ملازم کی غیر ضروری تمیز، پروٹوکول کے آداب اور انتظامی افسران اور عوام کے درمیان ناقابلِ عبور کاوٹیں، یہ سب نوآبادیاتی طرزِ انتظام کے لوازمات ہیں۔ ایک آزاد ملک اور وہ بھی اسلامی نظام و دستور پر یقین رکھنے والا ملک آخر کس طرح ان ''نخروں'' کا متحمل ہوسکتا ہے۔ اسلام کو اگر خلافتِ راشدہ کے معیار پر دیکھا جائے اور اس دور کے معاشرہ کو آئیڈیل قرار دیا جائے تو عدل و انصاف کا یہ فطری نظام نہ معیارِ زندگی اور طرزِ معاشرت کے تفاوت کو قبول کرتا ہے، نہ اس طرح کے گریڈ سسٹم کا قائل ہے۔ نہ افسر و ملازم کی تمیز کا روادار ہے اور نہ ہی عوام اور حکّام کے درمیان کسی قسم کی رکاوٹ کو برداشت کرتا ہے۔ اس لیے جب پاکستان اسلام کے نام پر بنا ہے اور اسلامی نظام کے نفاذ کا ہر عام و خاص دعویدار ہے تو پھر انتظامی ڈھانچے کو اسلامی احکام و ہدایات سے مستثنیٰ رکھنے کی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اسلام کسی خاص شعبۂ زندگی کے لیے چند ہدایات کا نام نہیں بلکہ مکمل نظامِ حیات ہے اور اس کے اصول و ضوابط زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہیں۔ اور یہ ایک ایسی وحدت اور اکائی ہے جو کسی تقسیم اور تدریج کو قبول نہیں کرتی ہے۔ لہٰذا اگر اسلامی نظام کے ثمرات و نتائج دیکھنے کی خواہش ہے تو اسے قومی زندگی کے تمام شعبوں میں یکساں اور بیک وقت جاری کرنا ہوگا، اس کے بغیر نہ اسلام نافذ ہوگا اور نہ اس کے نفاذ کے مثبت اثرات قوم کے سامنے آئیں گے۔

(ہفت روزہ ترجمان اسلام، لاہور - ۱۲ اپریل ۱۹۸۲ء)

دینی خدمت گزاروں کی مشکلات وضروریات

محراب و منبر کے وارث محنت مزدوری کیوں نہیں کرتے؟

محترم راجہ انور صاحب کو شکایت ہے کہ محراب و منبر کے وارث محنت مزدوری کیوں نہیں کرتے؟ ان کی بڑی تعداد محنت مزدوری یا نوکری اور تجارت سے اپنا پیٹ کیوں نہیں پالتی؟ ان میں سے اکثر چندے اور قربانی کی کھالیں جمع کرنے کی بجائے جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر یا وزن اٹھا کر اپنی روزی کیوں نہیں کماتے؟

یہ شکایت نئی نہیں بہت پرانی ہے اور جب سے مسجد اور مدرسہ نے ایک ریاستی ادارے کی حیثیت سے محروم ہو کر پرائیویٹ ادارے کی حیثیت اختیار کی ہے اور اسے اپنا وجود برقرار رکھنے اور نظام چلانے کے لیے صدقہ، زکوٰۃ، قربانی کی کھالوں اور عوامی چندہ کا سہارا لینا پڑا ہے تب سے یہ شکوہ بہت سی زبانوں پر ہے اور مختلف طریقوں سے وقتاً فوقتاً اس کا اظہار ہوتا رہتا ہے۔

مغلیہ دور میں مساجد و مدارس کی سرکاری سرپرستی

مغل حکومت کے دور میں مسجد و مدرسہ کو ریاستی ادارے کی حیثیت حاصل تھی، ان کے اخراجات کی ذمہ داری ریاست پر تھی، درسِ نظامی ملک کا سرکاری نصابِ تعلیم تھا اور عدالتوں میں اسلامی احکام و قوانین کی عملداری تھی۔ جب اس سارے سسٹم کو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں مسلمانوں کی ناکامی کے بعد انگریز سرکار نے لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا اور مساجد و مدارس کی بندش کے ساتھ ساتھ ان کے لیے مخصوص اوقاف و وسائل بھی ضبط کر لیے تو باقی سارے معاملات سے قطع نظر، کم سے کم عام مسلمانوں کی عبادات کا نظام برقرار رکھنے اور ان کے لیے دینی تعلیم کا تسلسل قائم رکھنے کے لیے عوامی چندہ اور زکوٰۃ و صدقات کے ذریعہ مسجد و مدرسہ کے نظام کو چلانے کا رجحان پیدا ہوا۔ اور کچھ اصحاب بصیرت نے غریب عوام کے سامنے جھولی پھیلا کر، زکوٰۃ و صدقہ اکٹھا کر کے، قربانی کی کھالیں جمع کر کے، بلکہ ایک ایک گھر سے روٹی مانگ کر مسجد و مدرسہ کے اس نظام کو تباہ ہونے سے بچا لیا۔ ورنہ تاشقند اور سمرقند میں ایسی مساجد میں نے خود دیکھی ہیں اور وہاں نمازیں ادا کی ہیں جو گزشتہ نصف پون صدی کے عرصہ میں سیمنٹ کے گودام اور سینما ہال کے طور پر استعمال ہوتی رہی ہیں۔ اگر ہمارے ہاں کے منبر و محراب کے وارث کھالوں اور چندوں کے پیچھے نہ پھرتے تو یہاں بھی صورتحال تاشقند اور سمرقند سے مختلف نہ ہوتی۔

چندہ کے نظام کے حوالے سے دو قسم کے معترضین

مسجد و مدرسہ اور مولوی و چندہ کے اس نظام پر دو قسم کے حضرات کو اعتراض ہے اور ان کی شکایات

کے پس منظر کو الگ الگ طور پر سمجھنا ضروری ہے۔

- کچھ حضرات کو تو اس بات پر غصہ ہے اور وہ اپنے غیظ و غضب کو چھپانے میں کامیاب نہیں ہو رہے کہ یہ نظام ابھی تک بدستور قائم کیوں ہے؟ نہ صرف قائم ہے بلکہ مغرب اور اسلام کے درمیان موجودہ ''گلوبل سولائزیشن وار'' میں ایک ناقابلِ تسخیر مورچہ کی حیثیت کیوں اختیار کیے ہوئے ہے؟ اور چونکہ اس نظام کے باقی رہنے بلکہ دن بدن ترقی کرنے میں ظاہری سبب یہی صدقہ، زکوٰۃ، قربانی کی کھالیں اور چندہ ہے اس لیے انہیں یہ سارا کچھ بہت برا لگتا ہے۔
- لیکن کچھ حضرات خیر خواہی اور خلوص کے جذبہ کے ساتھ بھی اس خواہش کا اظہار کر دیتے ہیں کہ علماء کرام کو صدقہ و زکوٰۃ کی بجائے کوئی ہنر اپنا کر اپنی معیشت کا انتظام کرنا چاہیے۔ ایسے دوستوں کے پیشِ نظر انتہائی خلوص کے ساتھ یہ بات ہوتی ہے کہ منبر و محراب کے وارثوں کا معاشرتی مقام بلند ہونا چاہیے اور انہیں لوگوں کا دستِ نگر ہونے کی بجائے خود کفیل ہو کر دینی رہنمائی کا فریضہ سرانجام دینا چاہیے تاکہ ان کی بات میں زیادہ وزن ہو اور وہ زیادہ اعتماد کے ساتھ معاشرہ کی دینی قیادت کر سکیں۔ مگر منبر و محراب کے وارثوں کے لیے اس خواہش کو پورا کرنا ممکن نہیں ہے اور اس کی وجہ بھی مدرسہ و مسجد کے اسی نظام کا تحفظ ہے۔ کیونکہ ایک طرف حافظ، قاری اور مولوی کے ذاتی معاشرتی وقار کا مسئلہ ہے اور دوسری طرف مسجد و مدرسہ کے نظام کو باقی رکھنے کے تقاضے ہیں۔ اور ''مولوی'' پوری ہوشمندی کے ساتھ آج بھی اپنے ذاتی مفاد پر مسجد و مدرسہ کے نظام کے تحفظ کو ترجیح دے رہا ہے۔

نواب ریاست حیدر آباد کی مدارس کو پیشکش

ہم ان کالموں میں عرض کر چکے ہیں کہ ایک دور میں ریاست حیدر آباد دکن کے نواب نے، جو اپنے دور کے امیر ترین مسلمان حکمران سمجھے جاتے تھے، دارالعلوم دیوبند کی انتظامیہ کو پیشکش کی کہ اگر دارالعلوم کے نصاب میں کچھ جدید مضامین کو بھی شامل کر لیا جائے تو وہ دارالعلوم کے اخراجات میں تعاون کرنے اور دارالعلوم کے فضلاء کو اپنی ریاست میں ملازمتیں فراہم کرنے کے لیے تیار ہیں۔ اس کے جواب میں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے یہ تاریخی جملہ کہہ کر اس پیشکش کو مسترد کر دیا تھا کہ

> ''ہم ریاست حیدر آباد کا نظام چلانے کے لیے نہیں بلکہ مسلمانوں کی نماز، روزہ اور دینی تعلیم کا نظام باقی رکھنے کے لیے پڑھا رہے ہیں۔''

مولانا کے ارشاد کا مطلب یہ تھا کہ اگر ہم بھی اپنے مدارس میں پڑھنے والے طلبہ کو جدید تعلیم کا ٹچ

دے کر ریاستی نظام کے کل پرزے بنادیں تو پھر مسجدوں میں نماز کون پڑھائے گا اور لوگوں کو قرآن کریم کی تعلیم کون دے گا؟ اس لیے اس دور کے اکابر علماء نے شعوری طور پر حکمتِ عملی کے تحت اپنے طلبہ کو "جدید" علوم اور ہنر و فن سے دور رکھا تاکہ وہ مسجد و مدرسہ کے سوا کسی اور جگہ فٹ نہ آسکیں اور عام مسلمانوں کا عبادات اور دینی تعلیم کا نظام چلتا رہے۔

چنانچہ یہ بات اپنی جگہ پر کہ قیامِ پاکستان کے بعد اسلامی نظام کے لیے رجال کار فراہم کرنے کے نقطۂ نظر سے دینی مدارس کو اپنے نصاب و نظام میں ضروری تبدیلیاں کرنی چاہئیں تھیں اور ہم خود اس پر مسلسل معروضات پیش کر رہے ہیں، مگر جہاں تک مسجد و مدرسہ کے موجودہ نظام کی افادیت اور اس کے معاشرتی ثمرات کا تعلق ہے، اس کا مدار ظاہری طور پر اسی صدقہ و خیرات اور قربانی کی کھالوں پر ہے۔ اور اس سسٹم کو طنز و طعن کا نشانہ بنا کر اس کی نفی کرنا عام مسلمانوں کی عبادات اور دینی تعلیم کے نظام کو سبوتاژ کرنے کی شعوری یا غیر شعوری کوشش کرنے کے سوا اور کسی عنوان کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

دورِ نبویؐ سے راہنمائی

راجہ انور صاحب محترم نے ایک واقعہ کا حوالہ بھی دیا ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سوال کرنے والے شخص کو کلہاڑی دے کر جنگل سے لکڑیاں کاٹنے اور محنت کر کے پیٹ پالنے کی ترغیب دی تھی۔ یہ واقعہ درست ہے اور کسی بھی تندرست شخص کے لیے یہی حکم ہے تاکہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی بجائے محنت مزدوری کر کے روٹی کمائے۔ لیکن یہاں ایک عمومی رویہ اور الجھن کا حوالہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ کچھ لوگ دورِ نبویؐ کے انفرادی واقعات کا سہارا لے کر ان کے حوالہ سے اپنے جذبات و افکار پیش کرنے کی کوشش تو کرتے ہیں مگر اس دور کے سسٹم کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے کہ جس مسئلہ پر ہم بات کر رہے ہیں اس کی حیثیت جناب رسول اللہؐ اور خلفاء راشدینؓ کے رائج کردہ مجموعی نظام میں کیا تھی؟ اس سلسلہ میں دو حوالے سامنے لانا مناسب خیال کرتا ہوں۔

1. ایک خود جناب رسول اکرمؐ کے بارے میں ہے کہ آپؐ کا اپنا ذریعہ معاش کیا تھا؟ اور اگر راجہ صاحب کو مسلمان حکمرانوں کی خود ان کے بقول "لوٹ مار" کی کہانی پھر سے یاد نہ آجائے تو یہ گزارش ہے کہ ضابطہ اور قانون کے طور پر جنگوں میں حاصل ہونے والے "مالِ غنیمت" کا پانچواں حصہ بیت المال کے لیے مخصوص تھا اور پھر اس کا پانچواں حصہ آنحضرتؐ اور ان کے خاندان کے اخراجات کے لیے مخصوص ہوتا تھا۔ یعنی کسی بھی جنگ میں حاصل ہونے والے کل مالِ غنیمت کا چار فیصد حصہ جناب نبی اکرمؐ کے لیے متعیّن ہوتا تھا جس سے حضورؐ اور آپؐ

کے اہلِ خانہ کے اخراجات پورے ہوتے تھے۔ یہ سلسلہ آخر وقت تک جاری رہا حتیٰ کہ اسی مال غنیمت میں سے ایک بہت بڑے باغ "فدک" کو آنحضرتؐ کی ملکیت سمجھتے ہوئے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے خلیفۂ اول حضرت ابوبکرؓ سے اسے وراثت کے طور پر انہیں منتقل کرنے کا مطالبہ کیا تو حضرت صدیق اکبرؓ نے جواب دیا کہ یہ باغ آنحضرتؐ کی وراثت کے طور پر نہیں دیا جا سکتا بلکہ یہ بیت المال کی ملک میں رہے گا، البتہ اس کی آمدنی سے رسول اکرمؐ کی ازواجِ مطہراتؓ اور دیگر اہلِ خاندان کے اخراجات بدستور ادا کیے جاتے رہیں گے۔

2. دوسرا حوالہ یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ جناب نبی اکرمؐ کے وصال کے بعد حضرت ابوبکرؓ خلیفہ بنے تو ان کا معاملہ یہ تھا کہ مدینہ منورہ سے تھوڑے فاصلہ پر "سخ" نامی جگہ میں ان کی کپڑے کی کھڈیاں تھیں اور وہ کپڑا بیچ کر گزارا کیا کرتے تھے۔ خلیفہ بننے کے بعد وہ جب معمولی کپڑوں کی گٹھڑی اٹھا کر بازار کی طرف چلے تو حضرت عمرؓ نے انہیں روک لیا کہ آپ کا کاروبار میں مصروف رہیں گے تو لوگوں کے معاملات کون نمٹائے گا؟ اس لیے آج کے بعد آپ کاروبار نہیں کریں گے بلکہ کاروبار سلطنت کے لیے خود کو فارغ رکھیں گے۔.....

(روزنامہ اوصاف، اسلام آباد- ۱۰ مارچ ۲۰۰۰ء)

ضروریات اور معاوضوں کا تفاوت: ایک استفسار

کراچی کے جناب افتخار احمد (باغ ملیر، کراچی) کی طرف سے بھجوایا جانے والا ایک استفسار مختلف مفتیانِ کرام کے ہاں زیر غور ہے جو مساجد اور دینی مدارس میں کام کرنے والے ملازمین کی تنخواہوں اور دیگر حقوق کے معیار اور مقدار کے حوالے سے ہے۔ راقم الحروف کو بھی اس کی کاپی موصول ہوئی ہے، میں عام طور پر فتویٰ نہیں دیا کرتا البتہ ذاتی رائے کے طور پر اس بارے میں کچھ گزارشات افتخار احمد کو ان شاء اللہ ضرور بھجواؤں گا اور ان سے قارئین کرام کو بھی آگاہ کروں گا۔ سردست ان کا استفسار ملاحظہ فرمائیے اور داد دیجئے ان سینکڑوں این جی اوز کو جو دینی مدارس کی خامیوں کو اجاگر کرنے میں سالہا سال سے دن رات مصروف ہیں لیکن یہ پہلو آج تک ان کی توجہ حاصل نہیں کر سکا۔

"کیا فرماتے ہیں علماء دین و مفتیان شرع متین اس مسئلہ میں کہ:

(۱) آج کے اس ہوشربا مہنگائی کے دور میں جس میں کہ روز بروز مسلسل اضافہ ہی ہو رہا ہے، آئمہ مساجد، مؤذنین و خادمینِ مساجد، علماء کرام جو کہ متفرق شعبہ

جات مثلاً حدیث، فقہ، صرف ونحو، عربی، تفسیر، تصنیف وتالیف، اِفتاء اور دینی ادارے کے ترجمان ماہانہ رسائل وغیرہ میں اپنے فرائض منصبی انجام دے رہے ہیں، یا ناظمِ تعلیمات، نگران، اکاؤنٹنٹ، دفتری امور کلرک، قاصد، گارڈ، چوکیدار، یا مدارس درجہ ناظرہ ہو یا حفظ وشعبہ تجوید وخطاطی کا، یا نان بائی وباورچی وغیرہ وغیرہ کے امور دینی مدارس ومساجد میں انجام دے رہے ہیں، ان کی تنخواہوں کا ماہانہ معیار کیا ہونا چاہیے؟

(۲) علماء ومفتیان کرام وغیرہ جو کہ کم وبیش دس سے بارہ سال کے عرصہ میں ادارے سے فارغ التحصیل ہوتے ہیں، یا چند سالوں میں حفاظ وقراء بننے والے حضرات ہوتے ہیں، ان کو اکثر دینی مداس ومساجد میں آج کے اس شدید ترین مہنگائی کے دور میں بھی ۴۰۰۰ سے ۶۰۰۰ روپے ماہانہ تنخواہ بھی بڑی مشکل سے دی جارہی ہے بلکہ بعض مدارس ومساجد میں اس سے بھی کم ہے۔ جبکہ اتنے ہی عرصہ میں دنیاوی تعلیم حاصل کرکے فارغ التحصیل شخص کو علماء کرام وغیرہ کے مقابلہ میں کئی گنا زیادہ ماہانہ تنخواہ (اکثر دنیاوی کمپنیوں، اداروں یا بینک وغیرہ میں) دیگر سہولیات مثلاً علاج معالجہ، گھر، گاڑی، پیٹرول، ڈرائیور وغیرہ وغیرہ کے ساتھ دی جارہی ہیں۔ تو معلوم یہ کرنا ہے:

- کیا یہ دنیادار لوگوں کے مقابلہ میں دینی حضرات کی بذاتِ خود بھی اور ان کے مناصب کی توہین نہیں ہے؟
- کیا اس طرح کا عمل جائز ہے یا ناجائز اور اس کی ذمہ داری کس پر عائد کی جائے گی؟
- اگر مساجد ومدارس ودینی ادارے کی انتظامیہ کے پاس فنڈ ہوتا ہو لیکن تنخواہیں پھر بھی کم دی جاتی ہوں اور وہ بھی بغیر کسی سہولیات کے، تو ان کے بارے میں قرآن وحدیث کیا کہتے ہیں؟ حقوق العباد سے متعلق بھی فرمائیں نیز ماتحتوں سے متعلق سلوک کے بارے میں بھی فرمائیں۔
- آج کے اس گرانی کے دور میں ایک انگوٹھا چھاپ، تعلیم سے بے بہرہ، جاہل گنوار عام سا مزدور بھی جو کہ کسی راج مستری، الیکٹریشن، پلمبر، کار

پینٹر وغیرہ کا ہیلپر ہوتا ہے وہ بھی یومیہ ۴۰۰ روپے اجرت لے رہا ہے، جبکہ ایک کاریگر راج مستری، الیکٹریشن، کار پینٹر وغیرہ یومیہ آٹھ سے نو گھنٹے کام کرنے کی اجرت ۷۰۰ سے ۱۰۰۰ روپے لے رہے ہیں۔ اگر ان کی یومیہ اجرت کے حساب سے ماہانہ رقم اور دینی مدارس و مساجد میں خدمات انجام دینے والوں کو ماہانہ تنخواہ کو مدنظر رکھتے ہوئے ۴۰۰۰ سے ۶۰۰۰ جو کہ عموماً مدارس و مساجد میں دی جارہی ہیں، اگر کوئی شخص اپنے بچوں کو دینی تعلیم کے بجائے دنیاوی تعلیم ہی دلوائے، یا راج مستری، الیکٹریشن، پلمبر، کار پینٹر وغیرہ بنوانا شروع کردے کہ میرا بچہ کم از کم مالی لحاظ سے پریشان حال اور تنگ دست تو نہیں ہوگا (دنیاوی اسباب کے لحاظ سے) تو اس دین کی تعلیم سے بے رغبتی کی ذمہ داری کس پر عائد ہوگی؟ دینی اداروں کے مہتمم حضرات اور ان کی انتظامیہ بھی اگر ادارے میں کوئی بجلی کا کام، پلمبری کا کام، رنگ وروغن، کار پینٹر یا راج مستری وغیرہ سے متعلق کوئی کام نکلتا ہے تو ان مزدوروں کو چند گھنٹوں سے لے کر آٹھ نو گھنٹوں کی اجرت بخوشی ۷۰۰ سے ۱۰۰۰ روپے تک یومیہ ادا کرتے ہیں، نیز کاریگر کے ساتھ ہیلپر کی اجرت بھی ۴۰۰ روپے یومیہ ادا کی جاتی ہے۔ جبکہ ان کے مقابلے میں متفرق شعبہ جات کے اساتذہ کرام و علماء کرام، ائمہ مساجد وغیرہ کو ان سے کہیں زیادہ وقت دینے کے باوجود یومیہ اس کی آدھی اجرت بھی ادا نہیں کی جاتی۔ اس کی جوابدہی کس پر ہوگی؟ کیا یہ عمل قرآن و حدیث اور ان کی تعلیم دینے والوں کی تذلیل کے زمرے میں نہیں آئے گا کہ پیٹ، اہل و عیال اور بنیادی ضروریات زندگی کے اخراجات کی تکمیل جیسے مسائل سبھی کے ساتھ ہیں۔

(۳) کسی دینی یا دنیاوی اداروں میں ایک شخص تین مختلف شعبہ جات میں اپنے فرائض منصبی مکمل طور پر ادا کرتا ہے تو

- کیا وہ تینوں شعبہ جات کی علیحدہ علیحدہ اور پوری پوری تنخواہ لینے کا حقدار

نہیں ہے؟

- کیا ایک ادارے سے کسی ملازم کو مختلف شعبہ جات میں متفرق امور انجام دینے پر ایک سے زائد تنخواہ دینا ناجائز و حرام ہے؟

(۴) مثلاً ایک دینی ادارے میں مسمی زید کو تین مختلف اور اہم شعبہ جات:

- مدرس قرآن کریم تقرر ملازمت ۱۸ مارچ ۱۹۸۲ء
- کارہائے خصوصی تقرر ملازمت یکم دسمبر ۱۹۸۳ء جس کے تحت ناظمِ تعلیمات، ناظمِ تعمیرات، نگران، دفتری امور کلرک وغیرہ کے کام بھی آجاتے ہیں۔
- پیش امام و خطیب تقرر ملازمت ۱۰ اکتوبر ۱۹۸۵ء۔ تینوں ملازموں پر علیحدہ علیحدہ ماہانہ تنخواہ پر تقرر کیا گیا ہے اور تینوں ملازمتوں کا عرصہ چوبیس سال سے اٹھائیس سال ہو چکا ہے اور وہ شخص دیگر ملازمین کے مقابلہ میں ہر ملازمت کے امور احسن طریقہ سے پوری دیانتداری اور ذمہ داری کے ساتھ انجام دے رہا ہے۔
  - (الف) اتنی طویل مدتِ ملازمت کے بعد آج کے اس شدید ترین مہنگائی کے دور میں اس کی تنخواہ کا معیار اس کے مناصب کے لحاظ سے کیا ہونا چاہیے؟ ادارہ کے اس سینئر ترین ملازم کو مدرس کی تنخواہ اس کے شاگرد اور ساڑھے پانچ سال جونیئر ملازم سے بھی کم ۵۹۰۰ روپے کارہائے خصوصی کے، ۳۱۰۰ روپے (دو ملازمتوں کی تنخواہ ملا کر ۹۰۰۰) بغیر طعام و قیام وغیرہ کی سہولت کے، اور امام و خطابت کے صرف ۳۵۰۰ کسی بھی قسم کی طعام و قیام وغیرہ کی سہولت کے بغیر، یعنی تین اہم ترین ملازمتوں کی کل تنخواہ چوبیس سے اٹھائیس سال کے عرصہ ملازمتوں کے بعد ۱۲۵۰۰ روپے دی جا رہی ہے۔ جبکہ اگر کسی شخص کا کسی دنیاوی کمپنی یا ادارہ یا بینک وغیرہ میں یا کسی سرکاری و نیم سرکاری ادارہ میں چوبیس سے اٹھائیس سال کا عرصہ ہو چکا ہو، وہ بھی ادنیٰ ترین درجہ کی ملازمت کا مثلاً ایک غیر تعلیم یافتہ، انگوٹھا چھاپ، چوکیدار،

گارڈ، چپراسی، قاصد، ڈرائیور کی ملازمت کرنے والے کو بھی بہت سی مراعات کے ساتھ صرف ایک ملازمت کے ۱۲۰۰۰ سے ۱۵۰۰۰ کے درمیان ماہانہ تنخواہ دی جارہی ہے۔

- تو کیا اس دینی ادارے کے ملازم کی بذاتِ خود اور ان تینوں اہم مناصب کی بھی یہ تذلیل نہیں ہے؟ یہ دینی ادارے کا ملازم زید خود صاحبِ حیثیت بھی نہیں ہے، کرایہ کے مکان میں رہتا ہے، شادی شدہ ہے، الحمدللہ تین بچے بھی ہیں۔ کرایہ مکان، بل بجلی، بل گیس اور کرایہ آمد و رفت میں ہی ۷۰۰۰ سے ۸۰۰۰ خرچ ہو جاتے ہیں۔ بقیہ ۵۰۰۰ میں گھر کا ماہانہ راشن، علاج معالجہ، کپڑا لتا، بچوں کے اسکول وغیرہ کی فیس و دیگر بنیادی ضروریات زندگی پورا کرنا مشکل ہی ناممکن ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ادارہ کی ان تینوں ملازمتوں کے علاوہ زید کے پاس کوئی اور ذرائع آمدن نہیں ہیں اور بارہ سے چودہ گھنٹے کی ملازمتوں کے بعد کسی دوسرے امور و ملازمت کے لیے بھی وقت نہیں ملتا ہے۔ جبکہ اسی ادارے میں آج اگر کسی نئے مؤذن و خادم مسجد کا تقرر کیا جاتا ہے تو ۵۰۰۰ روپے طعام و قیام کی سہولت کے ساتھ یہاں تک کہ نئے چوکیدار یعنی ادنیٰ درجہ کے ملازم کا تقرر بھی کم از کم ۳۵۰۰ روپے پر طعام و قیام کی سہولت کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ جبکہ ان لوگوں کی تنخواہ بھی آج کے اس ہوشربا مہنگائی کے دور کے حساب سے کچھ بھی نہیں ہے۔
- بلکہ مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے کیا یہ ظلم کے زمرے میں نہیں آئے گا؟ کیا دینی ادارے کی انتظامیہ کا یہ عمل درست ہے یا خلافِ شرع اور ناجائز ہے؟ اور مؤذن و خادم کی تنخواہ امام سے زیادہ مقرر کرکے، جبکہ وہ صلاحیت و قابلیت میں امام کے مقابلے میں بہت کمتر ہو اور چوبیس سال امام سے جونیئر ہو تو کیا یہ امام کے منصب اور خود امام کی بھی توہین نہیں ہے؟

(۵) کیا ادارہ یا مساجد و مدارس کی انتظامیہ کمیٹی کی ائمہ مساجد، مؤذن و خادم مسجد کے لیے رہائش کا انتظام گھر یا اس کا کرایہ وغیرہ دینے کی ذمہ داری ہے کہ نہیں؟ تاکہ یہ حضرات سکون قلب کے ساتھ بہ حسن خوبی اپنے فرائض منصبی انجام دے سکیں۔

(۶) آج پوری دنیا میں کسی بھی مذہب سے تعلق رکھنے والے کسی بھی ادارہ کے ملازم کو ان سالانہ رخصتوں کے علاوہ جو اس ادارے وغیرہ کی طرف سے متعیّن ہوتی ہیں، ہفتہ میں ایک رخصت ضرور دی جاتی ہے تاکہ وہ اپنے اہل و عیال، رشتہ دار وغیرہ کے حقوق کی ادائیگی اور دیگر گھریلو ضروریات وغیرہ سے خوش اسلوبی سے عہدہ برآ ہو سکے۔ تو کیا ائمہ کرام، مؤذنین و خادمین مسجد کو ہفتہ میں ایک رخصت دینا ناجائز و حرام ہے؟ کیا یہ ان کی تحقیر و تذلیل میں شمار نہیں ہوگا؟ کیونکہ کسی دینی ادارے کی انتظامیہ امام و خطیب، مؤذن و خادم مسجد کو ہفتہ میں ایک بھی رخصت نہیں دیتی۔ کیا انتظامیہ کا یہ عمل خلافِ شرع ہے یا صحیح ہے؟

ازراہ کرم و عنایت شرع کی رو سے آج کے اس ہوشربا مہنگائی کے دور میں بھرپور طریقے سے مدنظر رکھتے ہوئے، نیز دنیاوی امور کے سلسلہ میں ملازمت، چاہے وہ ادنیٰ درجہ کا چوکیدار، گارڈ، نائب قاصد وغیرہ کی ملازمت ہو، بھاری تنخواہ پانے والے راج، مستری، پلمبر، الیکٹریشن، کار پینٹر یا ان کے ہیلپر وغیرہ کی یومیہ اجرت کے حساب سے ماہانہ رقم (کم وقت یعنی آٹھ سے نو گھنٹے کام کر کے صرف)، اور دینی امور کی خدمات انجام دینے والے حضرات کے مناصب و مراتب اور زیادہ اوقات کار اور دنیاوی لوگوں کی آمدنی اور دینی امور کی خدمات انجام دے کر ماہانہ آمدنی کے تقابل کو بھی خصوصی طور پر ملحوظ رکھتے ہوئے (کیونکہ گھربار، اہل و عیال اور بنیادی ضروریات زندگی وغیرہ کے مسائل سب کے ساتھ ہیں) مندرجہ بالا تمام سوالات کے مدلل و مفصل جوابات مرحمت فرما کر ممنون و مشکور فرمائیں۔ تاکہ سائل کے علاوہ دیگر عوام و خواص کی معلومات میں بھی اضافہ ہو جائے، نیز درپیش تمام مسائل سے متعلق معلومات حاصل ہو کر اصلاح بھی ہو جائے گی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔"

(روزنامہ پاکستان، لاہور - ۴ دسمبر ۲۰۰۹ء)

مساجد و مدارس کے ملازمین کے مسائل

مساجد اور دینی مدارس میں کام کرنے والے ملازمین اور ائمہ و اساتذہ کی معاشی زبوں حالی کے بارے میں کراچی کے جناب افتخار احمد کا ایک استفتاء اسی کالم میں قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا چکا ہے۔ یہ بات پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ اس حوالہ سے فتویٰ یا تحقیقی مضمون کی سطح کی کوئی چیز قارئین کی نذر نہیں کر سکوں گا کہ یہ میرا ذوق نہیں ہے، البتہ عمومی تناظر میں کچھ اصولی گزارشات ضرور کرنا چاہوں گا۔

تنخواہوں اور مراعات کا معاملہ

مساجد و مدارس کے ملازمین کو تنخواہیں اور دیگر مراعات آج کے معاشرتی ماحول میں بہت کم ملتی ہیں اور ان کی بنیادی ضروریات کے حوالے سے تو یہ بہت ہی کم ہیں۔ یہ ایک معروضی حقیقت ہے جس کا چند بڑے اور معیاری اداروں کو چھوڑ کر، جن کا تناسب مجموعی طور پر شاید پانچ فیصد بھی نہ ہو، ملک میں ہر جگہ مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن امام، خطیب، مدرس، مفتی، حافظ، قاری اور مؤذن قسم کے لوگ اپنی تربیت کے لحاظ سے تنخواہ اور معاشی مفادات کے لیے احتجاج، ہڑتال، جلوس، مظاہرہ اور بائیکاٹ وغیرہ کے عادی نہیں ہیں اور اسے قناعت اور خلوص کے خلاف سمجھتے ہیں۔ جبکہ جو لابیاں اور این جی اوز ملک میں اس قسم کے مسائل کے لیے آواز اٹھاتی ہیں انہیں اس ''مخلوق'' کے وجود اور بقا سے سرے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، بلکہ بعض حلقوں کے نزدیک اس قسم کے لوگوں کا معاشرے میں موجود نہ رہنا ہی ان کے لیے عافیت کا باعث سمجھا جاتا ہے، اس لیے مساجد و مدارس کے نظام سے تعلق رکھنے والے ملازمین کی معاشی ضروریات، معاشرتی اسٹیٹس اور حقوق عام طور پر بہت کم زیر بحث آتے ہیں۔

اگر کچھ باہمت اور باذوق صحافی ملک کے کسی بھی حصے میں ایک علاقے کو مخصوص کر کے وہاں کی مساجد و مدارس کے ملازمین، جن میں خطباء، اساتذہ اور دیگر ملازمین شامل ہیں، کی تنخواہوں، مراعات، معیارِ زندگی اور بنیادی ضروریات کے بارے میں ایک معروضی اور تجزیاتی رپورٹ مرتب کر سکیں تو یہ انتہائی چشم کشا رپورٹ ہوگی، اور آپ دیکھیں گے کہ دنیا میں الزامات کا سب سے زیادہ ہدف بننے والے اس طبقے کی غالب اکثریت کس کسمپرسی اور بے سروسامانی کے ماحول میں زندگی بسر کر رہی ہے۔ یہ دراصل ایک بڑے اجتماعی مسئلہ بلکہ المیہ کا ایک جزوی پہلو ہے جس کا تعلق ہمارے مجموعی معاشی نظام اور معاشرتی رویوں سے ہے۔ ہمارے موجودہ معاشی نظام کی بنیاد جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ نظام اور سوچ پر استوار

ہے۔ اس لیے یہ معاشرہ معاشی اور معاشرتی دونوں حوالوں سے طبقاتی ہے، اونچ نیچ کی نفسیات کے حوالے سے ہے، اور بعض طبقوں کی ہر حال میں بالاتری اور بالادستی کی اساس پر ہے۔ جس کے افسوسناک مظاہر ہمیں قدم قدم پر دکھائی دیتے ہیں مگر ہم خاموشی کے ساتھ آنکھیں بند کر کے وہاں سے گزر جاتے ہیں۔

معاشرتی حیثیت کا معاملہ

میں پنجاب میں پیدا ہوا ہوں اور پنجاب میں ہی رہتا ہوں مگر میرا اصل تعلق مانسہرہ (ہزارہ) کی سواتی برادری سے ہے۔ گزشتہ ماہ میں مانسہرہ گیا تو مجھے بتایا گیا کہ وہاں محکمہ مال کے کاغذات میں امام مسجد اور مولوی کو "کمین" کے خانے میں لکھا جاتا ہے اور وہ اسی اسٹیٹس کا حامل سمجھا جاتا ہے۔ خدا جانے پنجاب اور سندھ کی کیا صورتحال ہے لیکن ہزارہ کے بارے میں مجھے یہی بتایا گیا ہے۔ یہاں دو سوال سامنے آتے ہیں:

1. ایک یہ کہ کیا مالک اور کمین کی یہ اصطلاح اور معاشرتی درجہ بندی شرعی احکام کے حوالے سے درست ہے؟
2. اور دوسرا سوال یہ کہ خدانخواستہ اس تقسیم کو اصولی طور پر کسی درجے میں تسلیم بھی کر لیا جائے تو کیا مولوی، امام اور دینی خدمات سرانجام دینے والے لوگ اسی حیثیت کے حامل ہیں کہ انہیں "کمین" کے کھاتے میں شمار کیا جائے؟ میرے نزدیک یہ دونوں سوال سنجیدگی کے ساتھ غور و خوض کے متقاضی ہیں۔

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو غلاموں کے بارے میں فرمایا تھا کہ یہ تمہارے بھائی ہیں، ان کے ساتھ بھائیوں جیسا سلوک کرو، جو خود کھاتے ہو ان کو کھلاؤ، جو خود پہنتے ہو ان کو پہناؤ، ان کے ذمہ ان کی طاقت سے زیادہ کام مت لگاؤ اور اگر ان کے ذمے لگایا ہوا کام ان کی ہمت سے زیادہ ہے تو خود ان کے ساتھ کام میں شریک ہو کر ان کا ہاتھ بٹاؤ۔ ایک صحابی حضرت ابو مسعودؓ نے اپنی لونڈی کو اس کی کسی کوتاہی پر تھپڑ مار دیا تو آنحضرتؐ نے سخت غصہ کا اظہار فرمایا اور کہا کہ اس تھپڑ کا کفارہ یہ ہے کہ اس کو آزاد کر دو ورنہ تمہیں جہنم میں جلنا پڑے گا۔ آج دنیا میں غلاموں اور لونڈیوں کا وجود نہیں ہے۔ غلامی کو انسانی معاشرے سے ختم کرنے کے عمل کا آغاز اسلام نے کیا تھا جس کی تفصیلات کا یہ موقع نہیں ہے لیکن ان غلاموں اور لونڈیوں کی جگہ آج کسانوں، ہاریوں، کمیوں اور ذاتی ملازمین نے لے لی ہے۔ ہم انہیں غلام کہتے نہیں ہیں لیکن ان کے ساتھ ہمارا سلوک عام طور پر غلاموں سے بھی بدتر ہوتا ہے۔ ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ بے

چارہ مولوی اور امام مسجد بھی معاشرتی رویے اور محکمہ مال کے کاغذات دونوں حوالوں سے اسی طبقے میں شمار ہوتا ہے۔

اس صورتحال کی اصلاح کے لیے معاشی نظام اور معاشرتی رویے دونوں میں انقلابی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ یہ بات ہمارے پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ معاشرتی انقلاب اور تبدیلیاں محض قانون سے نہیں ہوا کرتیں، قانون بھی ایک درجے میں ضروری ہے لیکن اصل تبدیلی اور اصلاح ایمان و عقیدہ اور اخلاق و عادات کے ذریعے ہوتی ہیں اور اس کے لیے مسلسل فکری اور سماجی جدوجہد درکار ہے۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم نے ہر سماجی تبدیلی اور معاشرتی اصلاح کے لیے سیاسی نعرے بازی کو ضروری قرار دے رکھا ہے اور صرف قانون کے نفاذ کو کافی سمجھ لیا ہے جس کی وجہ سے کسی بھی صحیح مقصد کے لیے بھی ہماری جدوجہد ایک حد سے آگے بڑھ کر ناکامی کا شکار ہو جاتی ہے۔

اسلام کا مزاج کیا ہے؟

اس کے بعد میں اس بات کی طرف توجہ دلانا چاہوں گا کہ اس سلسلہ میں اسلام کا مزاج کیا ہے اور اسلامی تعلیمات کا تقاضا کیا ہے؟ اس کے لیے خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکرؓ کے دور کے دو فیصلوں کا حوالہ دوں گا۔

سرکاری وسائل کی تقسیم

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد امت کی دو بڑی شخصیتوں یعنی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے درمیان ایک مسئلہ پر اختلاف ہوا تھا جس کی تفصیلات امام ابو یوسفؒ نے کتاب ''الخراج'' میں اور امام ابوعبید قاسم بن سلامؒ نے کتاب ''الاموال'' میں بیان کی ہیں کہ جب بیت المال سے لوگوں کو وظائف دینے کے لیے کوئی اصول طے کرنے پر مشورہ ہوا تو حضرت عمرؓ کی رائے یہ تھی کہ اس میں درجہ بندی کی جائے۔ جن کا دینی مرتبہ اور خدمات زیادہ ہیں انہیں زیادہ مقدار میں وظیفہ دیا جائے اور ان کے بعد جو جس درجے میں ہیں ان کے وظائف ان کے درجے کے حساب سے طے کیے جائیں۔ یعنی بیت المال سے وظائف کی تقسیم گریڈ سسٹم قائم کر کے اس کے مطابق کی جائے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس سے اختلاف کیا اور فرمایا کہ دینی مرتبہ اور خدمات کا تعلق آخرت سے ہے، وہاں انہیں ثواب و اجر اپنے درجے کے مطابق ملے گا ''وھذہ معاش فالأسوة فیه خیر من الاثرة'' کہ یہ معیشت کا مسئلہ ہے اس میں ترجیحات قائم کرنے کی بجائے برابری کا اصول زیادہ بہتر ہے۔ چنانچہ خلیفہ اول حضرت صدیق اکبرؓ نے حضرت عمرؓ کی رائے قبول کرنے سے انکار کر دیا اور بحیثیت خلیفہ فیصلہ کیا کہ وظائف تمام لوگوں میں برابری

کی بنیاد پر تقسیم کیے جائیں گے۔

حضرت ابوبکرؓ نے اپنی خلافت کے دوران بیت المال سے وظائف سب لوگوں میں برابری کی بنیاد پر تقسیم کیے لیکن جب حضرت عمرؓ خلیفہ بنے تو انہوں نے یہ نظام تبدیل کر دیا اور گریڈ سسٹم کی بنیاد پر وظائف کی درجہ بندی کر کے ترجیحی اصول پر ان کی تقسیم شروع کر دی۔ مسلسل دس سال تک اسی طرح تقسیم کرنے کے بعد اس کے معاشرتی نقصانات سامنے آئے تو حضرت عمرؓ نے اعتراف کیا کہ اس بارے میں حضرت ابوبکرؓ کی رائے ہی درست تھی اور اعلان فرمایا کہ میں اگلے سال سے خلیفۂ اول کے فیصلے کے مطابق وظائف تقسیم کروں گا۔ مگر اس کی نوبت نہ آئی اور اگلے سال سے قبل ہی حضرت عمرؓ شہید ہو گئے۔

حضرت ابوبکرؓ کی رائے کے صحیح ہونے کے بارے میں حضرت عمرؓ کے اعتراف کے ساتھ میں ایک اور بات کا اضافہ کروں گا کہ امت کے معروف محدث امام ہیثمیؒ نے اپنی کتاب ''مجمع الزوائد'' میں راویوں کی توثیق کے ساتھ یہ روایت نقل کی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہدی آخر الزمان کی آمد اور ان کے حالات و اوصاف کا ذکر کرتے ہوئے ایک بات یہ فرمائی کہ امام مہدی بیت المال کے اموال کو لوگوں میں ''عدل'' کے ساتھ تقسیم کریں گے۔ اس پر جب آنحضرتؐ سے سوال کیا گیا کہ عدل سے کیا مراد ہے تو آپؐ نے فرمایا "بالسوية بين الناس" لوگوں میں برابری کی بنیاد پر۔ اس لیے میری طالب علمانہ رائے میں بیت المال یعنی سرکاری خزانے سے عام لوگوں کو دیے جانے والے وظائف کا برابری کی بنیاد پر تقسیم کرنا ہی اسلام کا مزاج اور حکم ہے اور اس میں درجہ بندی اور گریڈ سسٹم معاشی نظام کے حوالے سے اسلام کے مزاج کے خلاف ہے۔

سرکاری عہدیداران کا معیارِ زندگی اور طرزِ زندگی

خلیفۂ اول کے دور کا دوسرا اہم فیصلہ جس کا تذکرہ میں ضروری سمجھتا ہوں، خود حضرت ابوبکرؓ کے وظیفہ اور تنخواہ کے تعیّن کا ہے۔ حدیث و تاریخ کی مصدقہ روایات کے مطابق حضرت ابوبکرؓ کا اپنا ذریعۂ معاش کپڑے کی تجارت تھی لیکن جب خلیفہ منتخب ہونے کے بعد وہ اپنے کام کے لیے روانہ ہونے لگے اور کپڑوں کی گٹھڑی کندھے پر رکھی تو حضرت عمرؓ نے انہیں روک لیا اور کہا کہ آپ اپنے کام پر جا رہے ہیں تو لوگوں کے مسائل کون حل کرے گا اور کوئی شخص اپنی مشکل لے کر مسجد میں آیا تو اس کی بات کون سنے گا؟ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ میں لوگوں کے مسائل کو حل کرنے کے لیے مسجد میں بیٹھا رہوں گا تو اپنے بچوں کو کھانا کہاں سے دوں گا جن کی کفالت میرے ذمے ہے۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ آپ گٹھڑی کندھے سے اتاریں، میں اصحابِ شوریٰ کو جمع کرتا ہوں اور اس مسئلہ کا کوئی حل نکالتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کے بلانے پر اصحابِ شوریٰ مسجد نبویؐ میں جمع ہوئے اور یہ فیصلہ کیا کہ چونکہ خلیفۂ اول کے اوقات اب لوگوں

کی ضروریات میں صَرف ہوں گے اور وہ اپنا کوئی کام نہیں کر سکیں گے اس لیے ان کا وظیفہ بیت المال سے مقرر کیا جائے تاکہ وہ اپنے بچوں کی کفالت کر سکیں۔

اس موقع پر حضرت علیؓ کی رائے سے اصول اور معیار یہ طے ہوا کہ مدینہ منورہ کے ایک عام شہری کے معیارِ زندگی کو سامنے رکھ کر اس کے مطابق خلیفۂ وقت کا وظیفہ مقرر کیا جائے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر حضرت ابوبکرؓ کا وظیفہ بیت المال سے مقرر کر کے انہیں کوئی الگ ذریعۂ معاش اختیار کرنے سے روک دیا گیا۔

- یہاں سے فقہاء کرام نے یہ اصول قائم کیا ہے کہ جو شخص بھی معاشرے کی کسی اجتماعی ضرورت کے کام میں مصروف ہو اور اپنا کوئی کام نہ کر سکتا ہو اس کے معاشی اخراجات کی کفالت بیت المال کے ذمے ہے اور اسے اس کے لیے بیت المال سے باقاعدہ وظیفہ دیا جائے گا۔
- دوسرا اصول اس واقعہ سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وظیفہ کا تعیّن اگر سربراہ مملکت کے لیے ہو تو اس کے لیے بھی عام شہری کے معیارِ زندگی کو سامنے رکھا جائے گا۔ اس سلسلہ میں حضرت علیؓ کے مشورہ کا یہ جملہ بھی مؤرخین نے نقل کیا ہے کہ "لا وکس فیھا ولا شطط" عام شہری کے معیار سے نہ کم ہو اور نہ زیادہ ہو۔

اس کے ساتھ حضرت عمرؓ کے اس فیصلے کو بھی شامل کر لیجئے جو انہوں نے خلافت کا منصب سنبھالنے کے بعد کیا تھا اور اپنے عمّال یعنی سرکاری حکام اور افسران کو یہ حکم جاری کیا تھا کہ کوئی شخص

1. ترکی گھوڑے پر سوار نہیں ہوگا۔
2. اپنے مکان کے آگے ڈیوڑھی نہیں بنائے گا۔
3. چھنے ہوئے آٹے کی روٹی نہیں کھائے گا۔
4. باریک لباس نہیں پہنے گا، وغیرہ۔

یہ باتیں اس دور میں معاشرتی امتیاز کی علامت (اسٹیٹس سمبل) ہوتی تھیں، حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے گورنروں اور افسران کو یہ چیزیں اختیار کرنے سے حکماً روک دیا جس کا مقصد اس کے سوا کیا تھا کہ سرکاری حکام اور افسران ملک کے عام شہریوں کی طرح زندگی بسر کریں گے اور کوئی معاشرتی امتیاز اختیار نہیں کریں گے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے صرف یہ ہدایات نہیں دیں بلکہ ان کی خلاف ورزی پر بڑے بڑے عمّال کو سزائیں بھی دیں۔ کوفے کے گورنر حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے دروازے پر بنی ہوئی ڈیوڑھی کو حضرت عمرؓ کے حکم پر انہیں اطلاع دیے بغیر گرا دیا گیا، جبکہ مصر کے گورنر حضرت عیاض بن غنمؓ کو باریک لباس پہننے کے جرم کی سزا میں بکریوں کے بالوں سے بنا ہوا چغہ ننگے بدن پر پہن کر چھ ماہ تک بیت المال کی بکریاں چرانا پڑیں۔

بانیٔ پاکستان کے افکار

اگر ایک اسلامی ریاست کی تشکیل اور اسلامی معاشرہ کے قیام میں ہمارے لیے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مذکورہ بالا تعلیمات اور خلفاء راشدین کے یہ فیصلے معیار اور رہنما ہیں تو ہمیں جاگیردارانہ نظام اور جاگیردارانہ کلچر دونوں سے نجات حاصل کرنا ہوگی، اور سرمایہ دارانہ نفسیات اور سوچ سے پیچھا چھڑانا ہوگا جس کے لیے طبقاتی نظام کا خاتمہ سب سے زیادہ ضروری ہے۔ وظائف، تنخواہوں اور مراعات میں درجہ بندی اور گریڈ سسٹم سے یہ طبقاتی نظام جنم لیتا ہے۔ اس کی عملی مثال دیکھنی ہو تو اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد کو دیکھ لیں جہاں ایک ہی شہر میں رہنے والوں کے رہن سہن، خورد و نوش، لباس و رہائش اور طرزِ زندگی میں الگ الگ درجات اور جداگانہ رویے اسلامی تعلیمات کا کھلے بندوں مذاق اڑا رہے ہیں۔ میرے خیال میں بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ نے ۱۹۴۳ء میں کُل ہند مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے جب سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ طبقے کو مخاطب کیا تھا تو یہی صورتحال ان کے سامنے تھی۔ قائداعظم مرحوم نے فرمایا تھا کہ:

> ”اس مقام پر میں زمینداروں اور سرمایہ داروں کو متنبہ کرتا ہوں کہ وہ ایک ایسے فتنہ انگیز ابلیسی نظام کی رو سے، جو انسان کو بدمست کر دیتا ہے کہ وہ کسی معقول بات کو سننے پر آمادہ نہیں ہوتا، عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی پر رنگ رلیاں مناتے ہیں۔ عوام کی محنت کو غصب کر لینے کا جذبہ ان کی رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے۔ میں اکثر دیہات میں گیا ہوں، میں نے دیکھا ہے کہ لاکھوں خدا کے بندے ہیں جنہیں ایک وقت بھی پیٹ بھر کر روٹی نہیں ملتی، کیا اسی کا نام تہذیب ہے؟ کیا یہی پاکستان کا مقصود ہے؟ اگر پاکستان سے یہی مقصود ہے تو میں ایسے پاکستان سے باز آیا۔ اگر ان سرمایہ داروں کے دماغ میں ہوش کی ذرا سی رمق بھی باقی ہے تو انہیں زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے ساتھ چلنا ہوگا، اگر انہوں نے ایسا نہ کیا تو ان کا خدا حافظ، ہم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکیں گے۔“

یہ ہمارے معاشی نظام اور معاشرتی سسٹم کی مجموعی صورتحال ہے جس کی طرف ہر باشعور رہنما توجہ دلا رہا ہے اور اسے تبدیل کرنے کو وقت کی اہم ضرورت قرار دے رہا ہے لیکن کسی کو ڈور کا سرا نہیں مل رہا کہ وہ اس کی گرہوں کو کھول سکے۔

جمعیت علماء اسلام کا موقف

جمعیت علماء اسلام نے ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات کے موقع پر مولانا محمد عبد اللہ درخواستیؒ، مولانا مفتی محمودؒ، مولانا غلام غوث ہزارویؒ، مولانا پیر محسن الدین احمدؒ (مشرقی پاکستان) اور مولانا عبید اللہ انورؒ کی زیر قیادت اپنے انتخابی منشور میں اس مسئلہ کے حل کی طرف پیشرفت کے لیے:

- سرکاری زمینیں بے زمین کاشتکاروں میں تقسیم کرنے،
- انگریزی استعمار کے دور میں دی گئی جاگیریں ضبط کرنے،
- اور سرکاری ملازمین کی تنخواہوں میں ہوشربا تفاوت کو ختم کر کے پہلے ایک اور دس کے تناسب پر لانے، اور پھر بتدریج ایک اور پانچ کے تناسب پر فکس کر دینے

کا وعدہ کر کے مسئلہ کے حل کے آغاز کی ایک صورت پیش کی تھی۔ جمعیت علماء اسلام کی موجودہ قیادت کو اپنے مرحوم بزرگوں کا یہ موقف اور ۱۹۷۰ء کا یہ انتخابی منشور شاید یاد نہ ہو، مگر جاگیردارانہ و سرمایہ دارانہ نظام و کلچر اور نفسیات کے خاتمے کا آغاز اسی قسم کے اقدامات سے ہوگا اور کسی انقلابی عمل کے بغیر محض نعروں سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

مسجد و مدرسہ کا نظام بھی اسی معاشرے اور کلچر کا حصہ ہے اور تمام تر دینی تعلیم و تربیت کے باوجود اسے اس کلچر اور مجموعی نفسیات سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ظاہر بات ہے کہ جب مولوی اور امام مسجد کمیوں اور لاگیوں میں شمار ہوگا تو اس کے ساتھ معاملہ بھی اسی جیسا ہوگا۔ خصوصاً جب اس "کمی اور لاگی" کو معاشرے کے لیے غیر ضروری بلکہ معاشرے پر بوجھ سمجھا جائے گا تو وہی کچھ ہوگا جو ہو رہا ہے۔ اس لیے اصل ضرورت تو اس نظام اور کلچر کو بدلنے کی ہے اور اس کے لیے عوامی سطح پر منظم اور مربوط تحریک اور جدوجہد ناگزیر ہے۔

ارباب اختیار کی خدمت میں دو گزارشات

لیکن اس سے ہٹ کر اس مسئلہ سے نمٹنے اور اس کی تلخی کم کرنے کے لیے دینی جماعتوں، بڑے مدارس کے منتظمین اور ان کے چلانے والی کمیٹیوں کو توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں:

1. ایک یہ کہ جب کوئی شخص خود کو کسی اجتماعی دینی کام کے لیے وقف کر دے اور کسی ادارے سے اس طور پر وابستہ ہو جائے کہ وہ اپنی ضروریات کے لیے اور کوئی کام نہ کر سکتا ہو تو اس کی اور اس کے زیر کفالت افراد کی معاشی کفالت شرعاً اس ادارے کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ اور کفالت کا معیار اس ادارے کے افراد اپنی مرضی سے طے نہیں کریں گے بلکہ انہیں دوسرے عام شہریوں

کے معیارِ زندگی کو "لاوکس فیھا ولا شطط" کے درجہ میں بنیاد بنانا ہوگا۔

2. دوسری بات یہ کہ صاحبِ ہدایہ نے حضرت امام ابوحنیفہؒ کا بیان کردہ یہ اصول ذکر کیا ہے کہ "لا رضاء مع الاضطرار" مجبوری کی رضا کا اعتبار نہیں ہے۔ اس کا مطلب مذکورہ مسئلہ کے حوالہ سے میری سمجھ میں یہی آتا ہے کہ کوئی شخص اگر اضطرار اور مجبوری کی وجہ سے اپنے معروف حق سے کم پر راضی ہوگیا ہے تو اس کی اس رضا کا اعتبار نہیں ہے اور شرعاً وہ اسی حق کا حقدار ہے جو معروف حق کے طور پر اسے حاصل ہونا چاہیے۔

لہٰذا میرا خیال ہے کہ اگر چند بڑے دارالافتاء اور وفاق المدارس العربیہ اس سلسلہ میں تمام پہلوؤں کا جائزہ لے کر ملک بھر کی مساجد و مدارس کے لیے کوئی اجتماعی ضابطۂ اخلاق طے کر دیں تو معاشرے کے دینی خدمات سرانجام دینے والے اس مظلوم ترین طبقے کی دادرسی کی کوئی صورت نکل سکتی ہے۔

(روزنامہ پاکستان، لاہور - ۸ دسمبر ۲۰۰۹ء)

دینی طلبہ کے روزگار کا مسئلہ اور حضرت حسین احمد مدنیؒ

عید الفطر کی تعطیلات ختم ہوتے ہی دینی مدارس میں تعلیمی سرگرمیوں کی تیاریاں شروع ہوگئی ہیں۔ چند روز تک داخلوں کا آغاز ہو رہا ہے اور ہزاروں مدارس میں لاکھوں طلبہ و طالبات نئے سال کی تعلیمی ترجیحات طے کرنے میں مصروف ہیں، جبکہ گزشتہ سال فارغ ہونے والے ہزاروں طلبہ و طالبات اپنے لیے نئی سرگرمیوں اور روزگار کے مواقع کی تلاش کر رہے ہیں۔

دینی مدارس کے فضلاء کے لیے روزگار اور مختلف قومی شعبوں میں دینی خدمات کے حوالہ سے ذہن سازی اور منصوبہ بندی ہماری ترجیحات میں عمومی طور پر شامل نہیں ہوتی بلکہ اسے دینی دائرے سے انحراف کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ مگر شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے ۱۹۳۷ء کے دوران علی گڑھ میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی پچاس سالہ تقریب میں صدارتی خطبہ کے دوران اس مسئلہ کو دینی اداروں کے انتہائی اہم قرار دیا تھا۔ حضرت مدنیؒ کے خطبۂ صدارت کا اس عنوان سے متعلقہ حصہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔ اس پہلو پر سنجیدہ غور و خوض کی درخواست کے ساتھ کہ دینی مدارس کے فضلاء کے بارے میں جن تجاویز پر شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے برطانوی حکومت سے معاملات طے کرنے کی بات فرمائی تھی، کیا ان تجاویز پر اسلامی جمہوریہ پاکستان کی مسلمان حکومت کے ساتھ گفتگو نہیں کی جا سکتی؟

اس خطبۂ صدارت میں جمعیت علماء ہند کے صدر اور دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا ارشاد گرامی یہ ہے کہ:

"چونکہ اسلامی تعلیمات، اسلامی تواریخ، اسلامی معاشرت، اسلامی تمدن، اسلامی علوم و فنون یہ سب عربی زبان میں ہیں، اس ساڑھے تیرہ سو برس میں مسلمانوں نے بڑے بڑے مذہبی اور تمدنی انقلابات برپا کیے ہیں اور علوم و فنون کے بہت سے شعبوں میں مسلمانوں کا مستقل اور پائیدار اثر قائم ہوا ہے، اور یہ سب کچھ عربی زبان میں ہے۔ مسلمانوں کے خاص خاص علوم ہیں جو اور کسی زبان میں پوری طرح نہ مکمل ہو سکتے ہیں نہ ترجمہ کیا جا سکتا ہے۔ جیسے حدیث، تفسیر، اصول، اسماء الرجال وغیرہ۔ الغرض مسلمانوں کا سارا علمی سرمایہ عربی زبان میں ہے، اس لیے من حیث القوم مسلمان عربی تعلیم کے لیے مجبور ہیں۔ نہ اس کو چھوڑ سکتے ہیں اور نہ ان کو چھوڑنا چاہیے۔

غور طلب یہ امر ہے کہ صرف ہندوستان میں شاید کئی لاکھ مسلمان ہر سال عربی تعلیم میں مشغول رہتے ہیں اور ہر سال ہزاروں طالب علم آٹھ دس برس کی محنت شاقہ کے بعد سندِ فراغ حاصل کرتے ہیں۔ ان لیے بظاہر معاش کا کوئی ذریعہ نہیں۔ یہی لوگ قومی اور مذہبی رہنما اور قومی رہبر ہوتے ہیں، مگر معمولی بسر اوقات اور اپنی قوت سے قدر کفاف حاصل کرنے کا موقع بھی ان کو حاصل نہیں ہوتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ رہنما ہوتے ہیں مگر محتاج، رہبر بنتے ہیں مگر مفلس۔ اور احتیاج کی وجہ سے جو جو خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں وہ ہوتی رہتی ہیں۔

یہ چیز ناممکن ہے کہ مسلمانوں کو عربی تعلیم سے روک دیا جائے، اور روکنا مناسب اور جائز بھی نہیں۔ ورنہ یہ مسلمانوں کی مذہبی اور ملی تباہی کا باعث ہو جائے گا۔ لہٰذا کیا مسلمانوں کی اس تعلیمی کانفرنس کے لیے یہ امر غور طلب نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کی عربی تعلیم کے مسئلہ کی طرف اپنی مکمل توجہ منعطف کرتی ہوئی عربی تعلیم یافتہ اشخاص کے ذرائع معاش کے مسئلہ کو حل کرے۔

یقیناً مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے اس مسئلہ سے اب تک بہت بڑی غفلت برتی ہے۔ شکایت کی جاتی ہے کہ اچھے علماء پیدا نہیں ہوتے، مگر اچھے علماء پیدا ہونے کے اسباب و ذرائع کی طرف توجہ نہیں کی جاتی۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مشہور مقولہ ہے "لو

کلفت بصلة ما عرفت مسئلة" (اگر مجھ کو پیاز کی تکلیف دی جاتی تو ایک مسئلہ کو بھی نہ پہچانتا)۔ ضروری ہے کہ علماء کو احتیاج اور افلاس سے نکالا جائے۔ ان کو اس قابل بنا دیا جائے کہ وہ اپنی روزی اپنے قوتِ بازو سے حاصل کر سکیں تاکہ ان میں فارغ البالی، خود داری، آزادی رائے پیدا ہو سکے اور "چہ خورد بامداد فرزندم" سے فی الجملہ آزاد ہو جائیں۔ یہ امر مشکل نہیں ہے مگر اس کے لیے متفقہ قومی آواز کی ضرورت ہے۔ مسلم تعلیمی کانفرنس کا اہم فریضہ یہ ہے کہ وہ اس مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لے۔ مجھ کو قوی امید ہے کہ پوری مسلم قوم اس مسئلہ میں کانفرنس کا ساتھ دے گی۔

میں فی الحال حسبِ ذیل تجاویز عربی تعلیم یافتوں کے لیے پیش کرنے کا شرف حاصل کرنا چاہتا ہوں:

1. کچھ کچھ معتدبہ وظائف ان طلبہ کے لیے مقرر کیے جائیں جو عربی سے فراغت حاصل کرنے کے بعد انگریزی پڑھنا چاہیں۔ اور علیٰ ہذا القیاس انگریزی مدارس کے ان فارغ شدہ طلبہ کے لیے بھی جو عربی پڑھنا چاہیں ان کے لیے بھی وہ وظائفِ امدادیہ جاری کیے جائیں۔
2. جس طرح مولوی فاضل وغیرہ کے سند یافتہ صرف زبانِ انگریزی میں گورنمنٹی امتحانات میں شرکت حاصل کر کے کامیابی حاصل کر سکتے ہیں، اسی طرح مسلم یونیورسٹی اپنے یہاں ایسے قوانین بنائے جن کے رو سے عربی مدارس کے فارغ شدہ طلبہ صرف انگریزی زبان کے امتحان میں شامل ہو سکیں۔ ان کے لیے تعلیم کا مستند انتظام کیا جائے کہ ایف اے کے بعد وہ بی اے کا امتحان دے سکیں۔
3. عربی مدارس کے طلبہ کے لیے ریلوے وغیرہ سے وہ تمام مراعات ملنی چاہئیں جو انگریزی مدارس کے طلبہ یا ایڈ گرفتہ مدارس کے طلبہ کو ملتی ہیں۔ ایجوکیشنل کانفرنس مستند مدارس عربیہ کی ایک فہرست تیار کرے جس کو گورنمنٹ بھی تسلیم کرے۔
4. قانون کے امتحانوں میں انگریزی زبان دانی کی شرط نہ رکھی جائے۔ امتحانات ملکی زبانوں میں ہوں، علمی استعداد شرط کی جائے۔ مگر حسبِ مراتب جن

امتحانوں کے لیے میٹرک، انڈر گریجویٹ یا گریجویٹ کی شرط ہے وہ رکھی جائے، اور اسی درجہ کے عربی استادوں کو بھی کافی سمجھا جائے۔ عربی نصاب میں اس کے لیے مدارج قائم ہوسکتے ہیں اور بعض ضروری چیزوں کا نصاب بھی اضافہ ہوسکتا ہے۔

5. کورٹ کی لینگویج بدل دی جائے۔ اگر فوراً ہائی کورٹ کی زبان بدلی نہ جاسکے تو وہ انگریزی ہی رہنے دی جائے، لیکن دوسرے تمام کورٹوں کی زبان لازمی طور پر بدل دی جائے۔
6. رجسٹریشن ڈیپارٹمنٹ میں عربی کی اسناد کو بھی ملازمت کے لیے کافی سمجھا جائے۔
7. اوقاف کے تمام ذمہ دار عہدوں کے لیے عربی اور مذہبی تعلیم کی تکمیل کو ضروری سمجھا جائے اور شرط کردی جائے۔
8. محکمہ منصفی اور ججی (صدارتِ اعلیٰ) کے لیے، جس میں اکثر قضاء شرعی اور تقسیمِ وراثت وغیرہ کی ضرورت پڑتی ہے، مذہبی تعلیم کی سند ضروری قرار دی جائے۔
9. مسلمانوں کو محکمۂ قضاء حسبِ طلب عطا کیا جائے جس کا مطالبہ عرصۂ دراز سے مسلمان کررہے ہیں۔
10. آرٹ اور صنعت کی تعلیم میں عربی تعلیم کے سندیافتوں کو شرکت کا موقع دیا جائے۔
11. محکمہ ہائے انہار، زراعت، تجارت کی تعلیمات میں عربی تعلیم یافتوں کو شریک کیا جائے۔
12. یونیورسٹیوں کے وہ طلبہ جو عربی پڑھتے ہیں، تھوڑے تھوڑے دنوں کے لیے کسی عربی دینی مدرسہ میں جاکر قیام کریں اور عربی کی اعلیٰ تعلیم سے استفادہ کریں۔

محترم حضرات! میں نہایت عدیم الفرصت اور بہت ہی کم مایہ ہوں، بہت کم فرصت میں نہایت جلدی کے ساتھ قلمبند کرکے اپنے مختلف پریشان خیالات کو آپ حضرات کی

بارگاہ میں پیش کر رہا ہوں اور امیدوار ہوں کہ اپنی نظرِ عفوِ کرم کو کام میں لا کر اگر کوئی چیز خلافِ رائے یا باعثِ تکدر ہوئی ہو اس سے سماح فرمائیں گے۔"

(روزنامہ اسلام، لاہور-۲۱ جولائی ۲۰۱۵ء)

دینی خدمات کا معاوضہ اور مولانا محمد مسلم قاسمی

گزشتہ دنوں کسی دوست نے واٹس ایپ پر جمعیت علماء ہند صوبہ دہلی کے صدر اور مدرسہ عالیہ عربیہ فتح پوری دہلی کے مہتمم مولانا محمد مسلم قاسمی کے اس فتویٰ کا ایک صفحہ بھجوایا ہے جو ائمہ مساجد اور مدارس و مکاتب کے اساتذہ کی تنخواہوں کے بارے میں ہے اور اس پر کچھ دیگر حضرات کے دستخط بھی ہیں۔ اس کا ایک حصہ ملاحظہ فرمالیجئے:

"کل قیامت کے دن یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ مسجد میں ماربل، اے سی، بہترین قالین اور عمدہ جھاڑ فانوس وغیرہ لگائے تھے یا نہیں؟ لیکن اگر اتنی کم تنخواہ دی جس سے روز مرّہ کی عام ضروریاتِ زندگی بھی پوری نہ ہوسکیں تو یہ ان کی حق تلفی ہے جس کا حساب یقیناً اللہ کے ہاں دینا پڑے گا۔ مسجد و مدرسہ کی آمدنی کے سب سے زیادہ مستحق امام، مؤذن اور اساتذہ ہیں۔ یہ جتنے اچھے اور خوشحال رہیں گے مسجد اور مدرسوں کا نظام اتنا ہی اچھا چلے گا۔ صرف امام کی تنخواہ دے کر امام پر اذان کی بھی ذمہ داری ڈالنا اور جھاڑو وغیرہ دینے کے کام پر مامور کرنا یہ ان کی توہین ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حاملینِ قرآن (قرآن کا علم رکھنے والے) کی تعظیم کرو، بے شک جس نے ان کی عزت کی اس نے میری عزت کی (الجامع الصغیر ۱/۱۴)۔ تنخواہ اچھی دینا بھی ان کی عزت کرنے میں داخل ہے۔ اور حدیث میں ہے کہ حاملینِ قرآن اسلام کا جھنڈا اٹھانے والے اور اس کو بڑھاوا دینے والے ہیں، جس نے ان کی تعظیم کی اس نے اللہ کی تعظیم کی، اور جس نے ان کی توہین کی اس پر اللہ کی لعنت ہے (الجامع الصغیر ۱/۱۴۲)۔

تنخواہ کم ہونے اور ضروریاتِ زندگی زیادہ ہونے کی وجہ سے امام اور اساتذہ ہو کر وہ کسی مالدار صاحب خیر سے سوال کرنے کی جرأت کر بیٹھتے ہیں اور بعض دفعہ سوال پورا نہ ہونے کی صورت میں سخت ذلت اٹھانی پڑتی ہے۔ ایسے حالات میں تنخواہ نہ بڑھا کر انہیں پریشانی

میں ڈالنا بھی ایک طرح کی توہین ہی ہے۔ لہٰذا امام اور اساتذہ کی تنخواہیں ان کے گھر کے خرچہ کے مطابق موازنہ کرکے مہنگائی کے ساتھ ساتھ بڑھاتے رہنا چاہیے۔ سال پورا ہونے کا انتظار یا تنخواہ بڑھانے کے معاملہ میں تنگ دلی سے کام لینا یا دیگر نامناسب شرط و قید لگانا صحیح نہیں۔ (مستفاد از فتاوی رحیمیہ قدیم ۴/۵۳۵)"

یہ فتویٰ ۱۷ اپریل ۲۰۱۸ء کو جاری کیا گیا ہے اور اس میں ہمارے دینی ماحول کے ایک ایسے پہلو کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو صرف ہندوستان میں نہیں بلکہ پاکستان، بنگلہ دیش اور پورے جنوبی ایشیا کے عمومی ماحول میں دن بدن سنگین صورت اختیار کرتا جارہا ہے۔

بغیر معاوضہ کے دینی خدمات کا تصور

سب سے پہلے تو ہمارے ہاں یہ غلط تصور رواج پا گیا ہے کہ دینی خدمات کسی معاوضہ کے بغیر سرانجام دینی چاہئیں اور کسی دینی خدمت پر وظیفہ یا تنخواہ کا تقاضہ کرنا ثواب اور اجر سے محرومی کا باعث بن جاتا ہے۔ بخاری شریف کی ایک روایت کے مطابق امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد گرامی ہے کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی خدمت ان کے سپرد کی اور اس کی انجام دہی کے بعد آنحضرتؐ نے انہیں کچھ حق الخدمت پیش کیا جو انہوں نے یہ کہہ کر قبول کرنے میں تامل کیا کہ میں نے تو یہ خدمت اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے سرانجام دی ہے اور میری مالی حالت بہتر ہے مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ جناب رسول اللہ نے ان کی یہ بات قبول نہیں کی اور فرمایا کہ "خذہ و تمولہ" اس کو وصول کرو اور اپنے مال میں شامل کرو، اس کے بعد اگر تمہاری مرضی ہو تو صدقہ کر دو۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی دینی خدمت پر حق الخدمت ادا کرنا ضروری ہے، اسے وصول کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور اس سے دینی خدمت کا ثواب و اجر ختم نہیں ہو جاتا۔

"عرف" کے دائرہ کا تعیّن

اسی طرح یہ بات ہمارے ہاں معمول بن گئی ہے کہ دینی خدمات سرانجام دینے والوں کی تنخواہیں اور دیگر سہولتیں عام طور پر کم از کم معیار پر مقرر کی جاتی ہیں۔ کچھ خدا ترس اور معیاری دینی مدارس و مراکز اساتذہ اور ائمہ و حفاظ کو معقول مشاہرے دیتے ہیں اور سہولتیں بھی مہیا کرتے ہیں مگر ان کی تعداد اکثریت میں بہرحال نہیں ہے۔ جبکہ عمومی ماحول یہ ہے کہ جس شخص کو ہم امامت، اذان، تعلیم قرآن کریم، دینی تدریس اور اس نوعیت کی کوئی ذمہ داری سونپ رہے ہیں اور اس کے اوقات کار کو اس کام کے لیے

مخصوص کر رہے ہیں، اس کا وظیفہ مقرر کرتے وقت ہم اس بات کا کوئی لحاظ نہیں رکھتے کہ اس سے اس کی اور اس کے کنبہ کی روزمرّہ کی ضروریات اس علاقہ کے عُرف کے مطابق باوقار طریقہ سے پوری ہو سکتی ہیں یا نہیں؟ ضروریات اور اخراجات کے تعیّن میں قرآن کریم نے "عرف" کو معیار قرار دیا ہے اور اس کی پابندی کا حکم دیا ہے۔ "متاعاً بالمعروف" کے ارشاد گرامی کے ساتھ ساتھ یتیم کے مال کی نگرانی اور انتظام کرنے والے کے لیے قرآن کریم میں "فلیأکل بالمعروف" فرمایا گیا ہے۔

جبکہ اس عرف کا دائرہ متعیّن کرتے وقت ہمیں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے اس ارشاد گرامی کو سامنے رکھنا ہوگا جو انہوں نے خلیفۂ اول حضرت صدیق اکبرؓ کا بیت المال سے وظیفہ مقرر کرتے وقت صحابہ کرامؓ کی مشاورت کے دوران فرمایا تھا کہ جس سے وہ مدینہ منورہ کے ایک عام شہری کی طرح باعزت زندگی گزار سکیں اور اسی پر فیصلہ ہو گیا تھا۔ اس لیے مؤذن، امام، خطیب، مدرس، قاری اور دینی خدمت کے مختلف شعبوں کے رجال کار کا وظیفہ اور سہولتیں مقرر کرتے وقت یہ بات بہرحال ملحوظ رکھنا ہوگی کہ وہ جس علاقہ میں رہتے ہیں وہاں کے عمومی ماحول کے مطابق ان کے کنبہ کی ضروریاتِ زندگی اس وظیفہ سے باعزت طور پر پوری ہو جائیں، ورنہ یہ ناانصافی اور حق تلفی شمار ہوگی۔

"لا رضاء مع الاضطرار"

ایک اور بات بھی ہمارے ہاں کہہ دی جاتی ہے کہ جب ایک امام اور مدرس خود اس تنخواہ پر راضی ہے اور اسے قبول کر رہا ہے تو پھر کسی کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے اس بات کو تسلیم کرنے میں تامل ہے اس لیے کہ ہمارے ہاں کسی شخص کو قاری اور عالم کے طور پر تعلیم و تربیت دینے کے دوران اس بات کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ وہ دینی خدمت کے سوا کوئی اور کام نہ کر سکے بلکہ اس کے کوئی متبادل ہنر یا ذریعۂ روزگار سیکھنے کی عام طور پر حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ جس کے نتیجے میں ایک عالمِ دین کوئی متبادل ذریعۂ اختیار کرنے کی اول تو استعداد اور صلاحیت ہی نہیں رکھتا، اور اگر کوئی شخص اپنی ذاتی محنت اور توجہ سے ایسا کر لیتا ہے تو اسے خود اپنے اساتذہ، ساتھیوں اور ماحول کی طرف سے تحقیر و استخفاف کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اور وہ معاشرتی طور پر مجبور ہو جاتا ہے کہ دینی خدمت ہی کے دائرے میں رہے اور اسی کو معاش کا ذریعہ بنائے۔ چنانچہ اس مجبوری کے باعث وہ کم وظیفے پر راضی ہو جاتا ہے کہ چلو کچھ نہ ہونے سے تو یہ بہتر ہے۔ تو کیا اس کی یہ رضا شرعاً رضا شمار ہوگی؟ صاحبِ ہدایہ نے حضرت امام ابوحنیفہؒ سے یہ اصول نقل کیا ہے کہ "لا رضاء مع الاضطرار" یعنی اضطرار اور مجبوری کی حالت کی رضا کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ میری طالب علمانہ رائے میں آج کی مساجد و مدارس میں اس کیفیت کے ساتھ دینی خدمات سرانجام دینے والے زیادہ تر

حضرات اس کا اولین مصداق ہیں جو مسلسل زیادتی اور حق تلفی کا شکار ہو رہے ہیں۔

''کوئی اور کام'' کرنے کا مشورہ

اس کے ساتھ ساتھ ایک اور پہلو پر بھی غور فرمالیں کہ بعض حضرات سادگی سے یہ کہہ دیتے ہیں کہ وہ فارغ اوقات میں کوئی اور کام بھی تو کر سکتے ہیں۔ اور ستم ظریفی کی بات یہ ہے کہ یہ بات زیادہ تر ان لوگوں کی طرف سے کی جاتی ہے جو کہتے ہیں کہ علماء کرام کو دینی خدمات تو بلا معاوضہ سرانجام دینی چاہئیں اور فارغ اوقات میں متبادل ذریعہ اختیار کر کے روزگار کا بندوبست کرنا چاہیے۔ یہ حضرات آج کے اس مسلّمہ بین الاقوامی ضابطے کو بھول جاتے ہیں کہ کسی بھی شخص کی ڈیوٹی کے اوقات کار کا تعیّن ضروری ہے جو عام طور پر یومیہ چھ یا آٹھ گھنٹے ہوتا ہے، اور اس کے علاوہ اس کے اوقات کا اس کی گھریلو ضروریات، آرام، بیوی بچوں اور تفریح وغیرہ کے لیے فارغ ہونا اس کا بنیادی انسانی حق ہے جو اس کی ضروریاتِ زندگی میں شامل ہے۔ اوقاتِ کار کے حوالہ سے آج کے مسلّمہ قانون کو اگر سامنے رکھا جائے، جس سے اسلام بھی انکار نہیں کرتا، تو ہمارے اساتذہ، ائمہ اور دینی خدمت کے دیگر رجال کار پہلے ہی اس دائرہ سے زیادہ وقت دے رہے ہیں۔ اس لیے اس سے ہٹ کر ان پر کسی مزید ڈیوٹی اور کام کی ذمہ داری ڈالنا ان کی حق تلفی اور ان کے ساتھ ناانصافی کی بات ہوگی۔

دہلی کے مولانا مفتی محمد مسلم قاسمی کے مذکورہ فتویٰ کو دیکھ کر یہ چند معروضات پیش کرنے کا موقع مل گیا ہے، ورنہ یہ مسئلہ بہت زیادہ توجہ اور فکرمندی کا تقاضہ کرتا ہے جو اہلِ فتویٰ کی دینی ذمہ داری میں شامل ہے، بلکہ اس طرف توجہ نہ دینے والے حضرات بھی میری طالب علمانہ رائے میں اس ناانصافی میں شریک ہی سمجھے جائیں گے۔ رمضان المبارک کے رخصت ہونے کے بعد شوال المکرم کے دوران ہمارے ہاں نئے تعلیمی سال کا آغاز ہوتا ہے جس میں مدارس و مساجد کے سال بھر کے معاملات طے پاتے ہیں اس لیے دینی مدارس کے وفاقوں، دینی جماعتوں، افتاء و ارشاد کے بڑے مراکز اور مسلّمہ علمی شخصیات سے گزارش ہے کہ وہ اس مسئلہ پر توجہ فرمائیں اور مساجد و مدارس کے شعبوں میں ان کے منتظمین کے لیے کچھ باقاعدہ اصول و ضوابط وضع کر کے ان کی راہنمائی کریں تاکہ وہ ان کی روشنی میں ائمہ، مدرسین، مؤذنین اور دینی خدمات کے دیگر رجال کار کے ساتھ مسلسل ہونے والی اس ناانصافی کی تلافی کے لیے کوئی معقول راستہ اختیار کر سکیں۔

(روزنامہ اسلام، لاہور - ۱۵ جون ۲۰۱۸ء)

دینی مدارس میں انقلابی تبدیلیوں کیلئے سرکاری فنڈ

روزنامہ پاکستان لاہور ۱۹ فروری ۲۰۰۳ء کی خبر کے مطابق وفاقی وزیر تعلیم زبیدہ جلال نے کہا ہے کہ حکومت جن مدارس کو قومی دھارے میں شامل کرنے کے لیے رقوم فراہم کرے گی ان پر وفاقی وزارت تعلیم کا مکمل کنٹرول ہوگا۔ یہ بات انہوں نے منگل کے روز برطانوی ادارہ ''ڈیپارٹمنٹ فار انٹرنیشنل ڈیویلپمنٹ'' کے نمائندہ سوما چکربائی کو کہی جنہوں نے ایک وفد کے ہمراہ ان سے ملاقات کی۔ وفد میں اسلام آباد میں متعیّن برطانوی سفیر بھی شامل تھے، انہوں نے بتایا کہ مدارس میں انقلابی تبدیلیوں کے لیے بہت بڑی رقم مختص کی گئی ہے، ان تبدیلیوں سے مذہبی راہنماؤں نے بھی اتفاق کیا ہے، وفاقی وزیر نے بتایا کہ ان کے ساتھ انفرادی ملاقاتوں کے دوران سرحد اور بلوچستان کے وزرائے تعلیم نے اصولی طور پر اس بات سے اتفاق کر لیا ہے کہ یہ مدارس وفاقی وزارت تعلیم کے حوالے کر دیے جائیں گے تاکہ ان میں جدید تعلیم متعارف کرائی جائے اور انہیں زیادہ سے زیادہ مالی معاونت فراہم کی جائے گی۔

خبر کے مندرجات پر کسی تفصیلی تبصرہ کی ضرورت نہیں ہے اور اس خبر سے دینی مدارس کے حوالہ سے مغربی ممالک کی دلچسپی اور حکومت پاکستان کے عزائم ایک بار پھر واضح ہو گئے ہیں اور یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ دینی مدارس کو قومی دھارے میں شامل کرنے، ان میں انقلابی تبدیلیاں لانے اور انہیں زیادہ سے زیادہ مالی معاونت فراہم کرنے کے اعلانات کا اصل مقصد دینی مدارس کو سرکاری تحویل میں لینا اور ان پر وزارت تعلیم کا کنٹرول قائم کرنا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ دینی مدارس کے وفاق اس بات کا نوٹس لیں گے اور اس سلسلہ میں حسب سابق دینی مدارس کو مشترکہ طور پر واضح راہنمائی اور پالیسی سے نوازیں گے۔

(ماہنامہ نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ۔ مارچ ۲۰۰۳ء)